بانی
سہام مرزا

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

مدیر اعلیٰ ______ منزہ سہام
مدیر ______ زین شمسی
انکم ٹیکس ایڈوائزر ______ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

مارچ 2017
جلد:45 ☆ شمارہ:03
قیمت:60 روپے

خط وکتابت کا پتا
88-C II فرسٹ فلور۔ خیابان
جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز 7 کراچی
فون نمبر: 35893122 - 021-35893121
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

☆ منیجر سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ عکاس: موسیٰ رضا / مرزا محمد یاسر

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

منی ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

بازگشت

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)......890 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی
Phone : 021-35893121 - 35893122
Email : pearlpublications@hotmail.com

ہائے ری قسمت

درختوں کو کاٹ کر عمارتیں بنانا تو اس قوم نے اپنا وطیرہ بنایا ہوا تھا مگر اب سڑکوں کے دونوں اطراف موجود برسوں پرانی نرسریوں کو ہٹا کر سڑک چوڑی کرنے کے نادر خیالات جان کر تو بہت دکھ ہوا۔ سرسبز درخت اور پودے نہ صرف شہروں کی خوبصورتی کا باعث ہوتے ہیں بلکہ ہوا میں موجود آلودگی سے بھی محفوظ رکھتے ہیں، بارش کا باعث بنتے ہیں، سورج کی تپش جب انسانوں اور جانوروں کو نڈھال کر رہی ہوتی ہے تب ٹھنڈے سائے کا سبب بنتے ہیں، آنکھوں کو تراوٹ عطا کرتے ہیں۔ کاش ہمیں یہ احساس ہو کہ ایک پودا کتنے برسوں میں تناور درخت بنتا ہے۔

میرے رب کی یہ بیش قیمت نعمت ہم اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہیں یہ جانے بغیر کہ اس میں ہماری بھی تباہی ہے۔ یہ بات اُن کی سمجھ سے باہر ہے کہ ٹریفک کی روانی کو بحال رکھنے کے لیے سڑکوں کا چوڑا ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا سلامت ہونا ضروری ہے۔ آج ذمہ داران درختوں کو کاٹ کر سڑک چوڑی کر رہے ہیں کہ آبادی بڑھ گئی ہے بے حساب گاڑیاں سڑکوں پر رش کا باعث بن رہی ہیں۔ انہیں یہ نظر نہیں آ رہا...... کہ غلط پارکنگ اور چائنا کٹنگ شہروں کا حسن برباد کر رہی ہے یہ نظر نہیں آ رہا...... کہ خوانچہ فروشوں کا ہجوم نہ صرف ٹریفک کی روانی کو متاثر کرتا ہے بلکہ موجب حادثات بھی ہے۔

مجھے تو ڈر ہے کہ ایسے نابیناؤں کو کل یہ خیال نہ آ جائے کہ سڑکیں چوڑی ہونے کے باوجود رش کم نہیں ہو رہا تو چلو آبادی ہی کم کیے دیتے ہیں کیونکہ ایک جاندار کو کاٹ کر سڑکیں چوڑی کرنے والے دوسرے جاندار کا گلہ با آسانی کاٹ سکتے ہیں۔

منزہ سہام

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ، خوب صورت

رابطوں کی دلفریب محفل

مدیر اعلیٰ

تمام پڑھنے والوں کو منزہ سہام کا خلوص بھرا سلام' وقت کی رفتار نے تو خوف زدہ کر دیا ہے لگتا ہے ابھی جنوری کے شمارے کے لیے محفل کے خطوط ترتیب دے رہی تھی۔ مبارک سلامت سمیٹ رہی تھی اور اب مارچ آ گیا...... مگر شاید ان لوگوں کے لیے تو وقت تھم سا گیا ہے جن کے پیارے اُن سے بچھڑ گئے، چھین لیے گئے' مائیں خالی ہاتھ رہ گئیں' بیوائیں بنا چھت اور بچوں کی مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے کھوگئی...... دل افسردہ ہے مگر زندہ ہیں تو زندگی کے کاموں کی طرف تو پلٹنا ہی ہوگا۔ اس دعا کے ساتھ پہلے خط کی جانب بڑھتی ہوں کہ 'میرے رب رحم فرما دے'۔

✉: اور یہ ہیں ہماری اور آپ کی بہت پیاری اقبال بانو بوریوالا سے لکھتی ہیں، میری بہت ہی پیاری منزہ! بہت پیار اور دعائیں۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ آج ایک عرصہ بعد آپ سے مخاطب ہوں تو دل بہت اُداس ہے منزہ پیاری...... ملک میں یکے بعد دیگرے دھماکوں نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی ہے۔ ذہن بہت منتشر ہے کہ کیا ہوگا؟ خیر جو ہوا اچھا ہو (آمین) پہلے تو شکریہ کے مجھے آپ کے دونوں پرچے ہر ماہ باقاعدگی سے مل رہے ہیں اور ہمیشہ سوچتی ہوں کہ پڑھتے ہی خط لکھوں مگر ہوتا یہ ہے کہ میں لیٹ ہو جاتی ہوں خط لکھنے کی تاریخ نکل جاتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دل چاہتا ہے۔ دوشیزہ کے لیے افسانہ بھی بھیجوں تو افسانہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی خط نہیں لکھ پاتی کہ آج کل T.V کے لیے بھی لکھ رہی ہوں۔ گھریلو مصروفیات بھی ہیں۔ آج ہی افسانہ مکمل کیا ہے 'بے ثمر محبتیں' بھجوا رہی ہوں امید ہے کہ پسند آئے گا اور قریبی اشاعت میں جگہ پائے گا۔ اس ماہ کا پرچہ بھی پڑھا۔ منزہ پیاری آپ کا اداریہ ہر ماہ زبردست ہوتا ہے مجھے تو آپ کے لکھے اداریے میں سہام مرزا صاحب کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... دوشیزہ میں رائٹرز کے ساتھ تقریبات کا احوال پڑھتی ہوں۔ کاش میں بھی وہاں ہوتی؟ دوشیزہ دن بہ دن نکھرتی جا رہی ہے۔ ناول' ناولٹ افسانے شاندار ہوتے ہیں۔ رفعت سراج اور زمر نعیم کے ناول بہت اچھے ہیں۔ افسانوں میں کاشی چوہان کا افسانہ زبردست ہے۔ وطن سے محبت کا درس اچھا دیا گیا ہے۔ کاش لوگ سمجھیں ویل ڈن کاشی...... عقیلہ حق' نسیم سکینہ' فصیحہ خان

اور احمد سجاد بابر کے افسانے بھی پسندیدہ رہے۔ بازگشت بہت اچھا سلسلہ ہے۔ حسب نسب پہلے بھی پڑھا ہوا ہے اب پڑھ کر بھی مزا آیا۔ نگہت غفار کو بیٹے کی شادی مبارک ہو۔ سکینہ فرخ کو نانو بننا مبارک ہو۔ رخسانہ جی کو بہت سلام دانیال اور زین کے لیے ڈھیروں دعائیں اللہ آپ کو بہت سی خوشیاں عطا فرمائے آمین۔

بانو جی! آپ نے ٹھیک کہا کہ ان بم دھماکوں نے تو میرے وطن پر صرف ایک ہی موسم مسلط کر دیا ہے اور وہ ہے دکھ اور آزمائش کا موسم ...... ہر سو جیسے خوف کی چادر سی تنی ہے ہر چہرہ پرایا لگنے لگا ہے۔ لیکن ہم امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑیں گے، انشاء اللہ جلد سب اچھا ہو جائے گا۔ آپ کی طویل عرصے کے بعد دوشیزہ کی محفل میں آمد بہت اچھی لگی پھر فون پر بات کر کے تو میں برسوں پرانے دور میں چلی گئی جب ایک بہت کیوٹ سی لڑکی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا وہ وقت اس لیے بھی بہت پیارا تھا کہ دائیں بائیں امی ابو تھے اور ہم بچے بے فکر تھے...... اب تو اپنے بچوں سے لے کر سامنے والوں کے بچوں کی بھی فکر رہتی ہے۔ اداریہ پسند کرنے کا شکریہ آپ کا افسانہ انشاء اللہ اگلے ماہ ضرور شائع ہوگا۔ خوش رہیے اور محفل میں شرکت کرتی رہیے۔

یہ خط ہے زمر نعیم کا لکھتی ہیں' اللہ آپ پر ہمیشہ مہربان رہے آمین۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی ادارے کے اراکین و وابستگین کی خیر و عافیت کے لیے ہمیشہ دعاگو ہوں۔ اللہ اپنا فضل و کرم ہم سب پر قائم و دائم رکھے (آمین ثم آمین) گزشتہ روز ہی فروری کا دوشیزہ موصول ہوا۔ سرورق کی دوشیزہ 'خاص نمبر' کے لحاظ سے 'کچھ خاص' نہیں لگی۔ البتہ اداریہ احتجاج ہمارے بھی دل کی آواز میرا مطلب ہے احتجاج بن گیا۔ کبھی یہ کرکٹر ہمارے آئیڈیل ہیرو ہوا کرتے تھے مگر اب ہر نام خود غرضی اور مفاد پرستی کا سلوگن محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے ہیروز کی صلاحیتیں اب سیاست کی طرح اتار چڑھاؤ کا شکار رہنے لگی ہیں۔ مجھ جیسے بھی محب وطن سوائے کڑھنے کے کر بھی کیا سکتے ہیں۔ محفل کا رنگ ذرا پھیکا سا تھا۔ کتنے ساتھی محفل سے غائب جو ہیں۔ ایک خولہ عرفان کے دم سے محفل کی رونق دو چند ہو جاتی ہے۔ خولہ کی خفیہ صلاحیتیں رفتہ رفتہ بیدار ہو رہی ہیں۔ (خولہ آپ مکمل مبصرا اور مکمل قلم کار ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں ہم بھی آپ کی تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں) باقی تبصرہ نگار ساتھی اور محفل کی رونق لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں اُن کی صلاحیتوں سے منکر ہوں۔ دوشیزہ محفل کا ہر رکن ہر ممبر انگوٹھی کے نگینوں کی طرح ہے۔ صفیہ مغل کافی عرصے سے غائب ہیں اُن کا تبصرہ بھی لاجواب ہوا کرتا تھا۔ عقیلہ حق بھی اپنے جوہر دکھا کر کہاں چھپ جاتی ہیں۔ نسیم نیازی سے بھی محفل دوشیزہ میں ملاقات نہیں ہو پاتی اور طلعت اخلاق کی تحریر کو سلسلہ باز گشت میں پڑھ کر جہاں دل و ذہن کی حساسیت انتہا تک پہنچ گئی وہیں اُن کی گمشدگی شدت سے محسوس ہوئی۔ ایسی نایاب تحریروں کے خالق کہاں ہیں۔ پلیز طلعت واپس لوٹ آئیں۔ ہمیں آپ کے لفظوں کے اثر میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ شمارے میں سلیم فاروقی صاحب کے انتقال کی خبر پڑھی۔ دلی رنج و افسوس کے ساتھ اُن کے لواحقین کے لیے دلاسہ صبر کے سوا کیا کہا جائے۔ مرحوم کو اللہ جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ ایک افسوس ناک خبر یا اطلاع نسیم نیازی کے ذریعے اور رضوانہ آپی کے توسط سے موصول ہوئی کہ کاشی چوہان (بھائی) کے سسر کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ کاشی بھائی اُن کی

اہلیہ اسماء اور لواحقین مرحوم کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔ اور مرحوم کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام عطا کرے آمین۔ رضوانہ پرنس صاحبہ کو ایوارڈ مبارک ہو۔ نگہت غفار صاحبہ کو بیٹے کی شادی مبارک ہو اللہ تعالیٰ نئے جوڑے کو شاد آباد رکھے۔ اور نگہت صاحبہ کے آنگن کی خوشیاں قائم و دائم رہیں آمین۔ منزہ سہام ایک بڑی مبارکباد کی مستحق آپ کی ٹیم اور ادارہ بھی ہے۔ آپ کی اور کاشی بھائی کی کاوشوں سے 'سچی کہانیاں ایوارڈ' بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا۔ بس آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ کاش آپ بھی موجود ہوتیں تو تقریب کا مزا دوبالا ہو جاتا۔ اب تو آپ سے ملاقات کا سبب دوشیزہ رائٹر ایوارڈ کی تقریب ہی بنے گی انشاء اللہ۔ اللہ سے دعا ہے کہ اُس تقریب کا انعقاد جب بھی ہو' ہمارے وطن کے اندرونی و بیرونی موسم خوشگوار و سازگار رہوں آمین۔ اس بار خاص نمبر کی فہرست میں واقعی بہت خاص نام اپنی تحریروں کے ساتھ جگمگا رہے ہیں۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ فوری سارا شمارہ پڑھ کر تبصرہ ارسال کروں مگر افسوس پھر 'ابھی امکان باقی ہے' کی دسویں قسط ارسال کرنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ ابھی کاشی بھائی' روحیلہ خان' فرزانہ آغا اور فصیحہ آصف کی تحریریں ہی پڑھ پائی ہوں۔ فرزانہ آغا کی تحریر تو اپنے عنوان سمیت احساس و جذبات کو مدوجزر کر گئی۔ اتنی گہرائی اور سچائی سے لکھنا فرزانہ کا ہی کمال ہے۔ اللہ انہیں مزید روانی اور قلم کی تابانی عطا کرے آمین۔ کاشی کی تحریر بھی سبق آموز اور اثر انگیز ثابت ہوئی۔ بس آمنہ اور رابعہ ایک کردار کے دو نام ذرا ابہام پیدا کرتے رہے۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھی...... (ایسی غلطیاں اب مجھ سے بھی ہونے لگی ہیں۔ کمپوزر بے چارا بھی انسان ہی ہے) روحیلہ کی سیلن فصیحہ کی شکست فاش زبردست اندازِ بیاں لیے پُر معنی تحریریں رہیں۔ باقی بھی یقیناً اچھی تحریریں ہوں گی جنہیں میں اب پڑھوں گی۔ اور کوشش کروں گی کہ بذریعہ فون اُن کے بارے میں اپنی رائے لکھوا دوں۔ اپنے ناول 'ابھی امکان باقی ہے' کے حوالے سے ایک معذرت میں بھی اپنے کرداروں کے ناموں کے حوالے سے کرنا چاہتی ہوں۔ فائق کے والدین کے لیے شاید شروع کی اقساط میں امی ابو لکھا تھا اور بعد میں ماما پاپا...... آپ کو بتانا ضروری سمجھا یہ غلطی مجھ سے سرزد ہو گئی ہے۔ فائق کے والدین کے لیے ماما' پاپا ٹھیک رہے گا جو کہ فروری کے شمارے میں بھی اسی طرح استعمال ہوئے ہیں۔ ایک بات مزید جاننا چاہتی ہوں کہ قسط نمبر 7 کے دو تین صفحات نظر نہیں آئے۔ کیا آپ نے ایڈٹ کیے ہیں؟ یا پھر کہیں Misplace ہو گئے۔ خیر ہوئی تسلسل نہیں ٹوٹا...... میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے۔ جنوری کا اعزازیہ موصول ہو گیا تھا۔ آپ کا بے حد شکریہ ابھی سچی کہانیاں کی تقریب کے حوالے سے بھی اظہارِ خیال لکھنا ہے اور ایک دوست (فرزانہ آغا) کی محبت پر بھی شکریہ کہنا ہے۔ اس لیے اب آپ سے رخصت لیتی ہوں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ دوشیزہ گلستان کے لیے اپنے تین اشعار بھی ارسال کر رہی ہوں امید ہے گلستان دوشیزہ کا حصہ ضرور بنیں گے۔ سبھی کو میرا سلام۔

ﷲ: عزیز از جان زمر! ہماری ایسی مجال کہاں کہ آپ کی تحریر میں سے صفحات کہ صفحات ایڈیٹ کر دیں۔ وہ انشاء اللہ اگلے ماہ لگ جائیں گے۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ دوشیزہ ایوارڈ بھی اب لاہور ہی میں ہو گا کیونکہ پرچے پر تو پنجاب ہی چھایا ہوا ہے۔ کراچی والے شاید بہت معروف رہنے لگے ہیں خیر اس بہانے سب سے ملاقات

ڈیڈی

صف اول کی مصنفہ اور ہماری ہر دل عزیز لکھاری ساتھی رفعت سراج گزشتہ دنوں بہت گہرے صدمے سے دوچار ہوئیں۔ آپ کے والد جناب سراج الدین قندی علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ پہلی اولاد ہونے کے باعث رفعت سراج نے انھیں ڈیڈی کہنا شروع کیا اور پھر وہ جگت۔ ڈیڈی بن گئے۔ طویل العمری کے باوجود بھی ڈیڈی کی ہمت' حوصلہ اور جوانمردی دیدنی تھی۔ آپ کے محبت کرنے والوں کی تعداد کا شمار نہیں۔ کار سرکار کے علاوہ درس وتدریس کی کتب سے بھی تاعمر واسطہ رہا۔ اسی باعث آپ ہر کس وناکس میں مقبول ترین شخصیت میں شمار ہوتے تھے' اور پھر جب اعجاز بھائی نے مجھے خبر دی کہ ڈیڈی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئے ہیں تو چند لمحے تو میری سکتے کی سی حالت رہی۔ کیا ان دو برسوں میں سارے ہی علم پرور ہمیں اکیلا چھوڑ جائیں گے؟ یہی سوال میرے ذہن میں گونجا جو ہنوز جواب طلب ہے اور اپنی تشفی چاہتا ہے۔ ڈیڈی کے لیے فوری طور پر 5 قرآن پڑھوائے اور اپنی جانب سے محبت کے چند پھول ڈیڈی کی طرف روانہ کر دیے کہ یہی جانے والوں کے لیے زادِ راہ ہوتا ہے۔

ادارہ پرل پبلی کیشنز اس دکھ کی گھڑی میں رفعت سراج اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ ہے اور مرحوم کی مغفرت اور اعلیٰ درجات کے لیے دعا گو ہے۔

بھی ہوجائے گی۔ شمارہ پر آپ کا بھرپور تبصرہ بہت اچھا لگا ہر ماہ منتظر رہوں گی۔

✉: اور یہ مختصر ترین خط ہے تحسین انجم انصاری کا لکھتی ہیں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اللہ آپ کو صحت وتندرستی دے...... وعدے کے مطابق 'میرے چارہ گر کو نوید ہو' کی کاپی بھیج رہی ہوں۔ پلیز اس کا نام نہ بدلیے گا۔ اگر کوئی ایسا ارادہ ہو تو مجھ سے مشورہ ضرور کرلیجیے گا۔

ﷺ: اچھی تحسین! آپ کے حکم کے مطابق نام تبدیل نہیں کیا دیکھ لیجیے اور اگلے ماہ میں بھرپور تبصرہ کے ساتھ آپ کی آمد کی منتظر ہوں۔

✉: اور یہ خط ہے حبیبہ عمیر کا لاہور سے، لکھتی ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر سے آپ سب کی خیریت مطلوب ہے سب سے پہلے آپ کو اور کاشی سر کو مبارکباد' ایوارڈ فنکشن کی امید ہے بہت اچھا گیا ہوگا۔ جیتنے والوں کو مبارکباد اور جو نہیں جیت پائے۔ انہیں بیسٹ آف لک اگلی دفعہ کے لیے...... اس بار تقریب لاہور میں تھی اور ہم لاہور میں نہیں تھے عجیب اتفاق ہے میں اس وقت مدینہ میں تھی اور سوئے اتفاق عین فنکشن والے وقت پر میسج دیکھا چلیں اگلی بار سہی میں بھی تقریب کا حصہ ہوں گی۔ پاکستان کے حالات آج کل عجیب کشمکش کا کار ہیں اللہ ہمارے ملک پر رحم فرمائے اور اسے دشمنوں سے محفوظ رکھے آمین کہانی ارسال کی ہے امید ہے جلد شائع ہوگی ایک طویل ناول جلد ارسال کروں گی۔ اجازت دیجیے۔

ﷺ: بہت ہی پیاری حبیبہ! تمہارا خط بھی ملا اور تم سے فون پر بھی بات ہوئی بہت اچھا لگا سب سے پہلے عمرے کی مبارکباد یقیناً تم نے پاکستان کی سلامتی اور امن کے لیے بھی دعا کی ہو۔ ہم سب کی ہر لمحہ ہر پل یہی دعا ہے کہ اللہ ہمارے وطن کو سلامت تاقیامت رکھے کہانی کے بارے میں کاشی بتائیں گے اور ناول کی میں منتظر ہوں۔ اپنے چھوٹو کو بہت پیار دینا خوش رہو۔

✉: لاہور سے تشریف لائی ہیں رضوانہ کوثر لکھتی ہیں۔ بہت بہت دعائیں اور پیار دوشیزہ سے منسلک

ہر فرد کے لیے اس ماہ کا دوشیزہ خاص نمبر سب کچھ سمیت خاص الخاص رہا۔ لطف دوبالا ہو گیا۔ گو طبیعت کافی خراب چل رہی ہے۔ اُس کے باوجود بشاشیت دل کی گہرائیوں تک محسوس کی۔ خوبصورت سرورق اور اشتہارات کی پگڈنڈی پر چہل قدمی کرتے کرتے فہرست دیکھی۔ لکھاریوں کے نام پڑھ کر ہی دل خوش ہو گیا۔ اشتہارات دینے والی میرے دیس کی کمپنیاں کچھ چیزوں کے معیار بلند و بہتر کرنے کے پر بھی خرچ کر دو۔ اداریہ پڑھا' آپ کے اور اقبال کے شاہین کے اور اپنے اس سانحے احتجاج نے افسردہ اور آزردہ کر دیا۔ محفل میں قدم رکھتے ہی پہلی ملاقات زمر نعیم سے ہوئی۔ فرح اسلم' خولہ عرفان' نگہت غفار' تسنیم منیر' ثمینہ طاہر' بلال فیاض' نیر شفقت سب کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بلال فیاض تو ہمارا بہت عزیز بچہ ہے۔ فرحی نعیم کو محفل میں خوش آمدید...... سکینہ فرخ کو نواسی کی بہت مبارک ہو۔ منزہ اور کاشی آپ دونوں کو لاہور میں سچی کہانیاں ایوارڈ کی کامیاب اور پُر جوش تقریب پر بہت بہت مبارک اور میری دعائیں سلیم فاروقی کو اللہ جنت میں اعلیٰ مقام اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے سوہائے علی سے ملاقات خوب اور نگہت غفار کے بیٹے کی شادی خوب تر رہی۔ نگہت کو بہت مبارک' رفعت سراج اور زمر کے ناول دلچسپی سے رواں دواں ہیں۔ نسرین اختر نینا کے 'سپنے سہانے' معاشرے کے حقیقی کرداروں کا روپ خوبصورتی سے دکھاتے ہوئے اختتام کو پہنچا۔ بہت اچھا رہا سب سے پہلے کاسئہ دل ہی خالی ملا۔ کاشی چوہان کی خوبصورت تحریر جس کا مرکزی خیال حقیقی حالات پر مبنی عام روش سے ہٹ کر ہے۔ معاشرے کے دو ناسور جن پر نشتر زنی کی گئی خوبصورت لفظوں کے چناؤ اور واقعات کی گہرائی ہے...... ایک تو یہ کہ حقدار ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو جاتا ہے مگر محروم اور دوسرے وہ والدین جن کی اولادیں دو دیس جا بستی ہیں اور ڈالر درہم ریال بھیج کر سمجھتی ہیں کہ ہم نے حق ادا کر دیا وہ والدین یا دونوں میں سے ایک تنہائی کا جو کشت کاٹتے ہیں کوئی دوسرا محسوس نہیں کر سکتا زبردست! روحیلہ خان کی سیلن بھی کافی اچھی رہی یہ واقعی رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہے۔ رشتوں کو پائیداری اور خوبصورتی سے ساتھ لے کر چلنے کے لیے ایک دوسرے کے لیے احساس خلوص اور آسانیاں اینٹ سیمنٹ اور رنگ روپ کا کام دیتے ہیں۔ فرزانہ آغا کی 'کی جاناں میں کون' واقعی سوغات رہی۔ حالات اور واقعات کو تمام تر جزیات کے ساتھ اُجاگر کرنا فرزانہ کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ عقیلہ حق نے بھی خوب لکھا۔ دوسروں کے کرداروں پر کیچڑ اچھالنے والے آخر خود ہی اس کیچڑ میں پھسل کر منہ کے بل گرتے ہیں۔ بس ان پر صبر کرنا شرط ہے۔ سکینہ صدف کی قسمت کے کھیل نرالے بھی اچھی رہی۔ واقعی ان حالات میں اولاد کے مستقبل کا فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ فرح انیس کی وہ جو اک ارمان تھا خوابوں خیالوں کے حصار میں گھومتی تحریر بھی اچھی رہی۔ ثمینہ طاہر کی سب مایا ہے زمینداروں کے روایتی غرور و تکبر کا قصہ جسے اللہ کی بھیجی ہوئی آفت نے عاجزی میں بدلا۔ عمران مظہر نے دو عورتوں کو سوکنے کے جلاپے سے نکال کر ان کی زندگی کی کیاری میں کھلنے والے گلابوں کی ایثار و محبت سے آبیاری کر کے مرجھانے سے بچایا۔ بہت خوب عبادت کاظمی کی عشق اک روگ' بھی ٹھیک ہی رہی۔ شکست فاش فصیحہ آصف کی تحریر بھی خاصے کی چیز تھی۔ اب تو بہت سے گھروں میں ایسے شکاری گھس جاتے ہیں جن گھروں میں والدین اپنی اولاد کو بے جا آزادی اور نامحروں سے دور نہیں رکھتے۔ اسی لیے اسلام

نے ہر رشتے اور تعلق کی حدود رکھی ہیں۔ جوان سے نکلتا ہے خوار ہوتا ہے۔ فصیحہ بہت اچھے نگہت غفار نے بہت خوبصورت کہانی لکھی۔ خزاں کی پگڈنڈیوں سے گزرتے دو پیار کرنے والوں کو مرد داور رہنمائی کے ساتھ ان راستوں کی رکاوٹیں اور کٹھنائیاں پھلانگتے عقیلہ اور عدنان کا دامن بہاروں سے بھر دیا۔ ماہ وش طالب کی دستک بہت زور سے طمانچے کی مانند لگی۔ بارود اور خون کی بنائی ہوئی۔ حقیقی زخم اور ادھیڑتی اور ایمان کو اجاگر کرتی غیر مسلموں کی بے حسی کی تصویر...... میری ہر وقت دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں موجود ہر مسلمان کا باطن روشن اور ضمیر زندہ کردے آمین۔ احمد سجاد بابر خوبصورت اور جامع تحریروں کے خالق ہیں۔ گنجے شیطان اس کا منہ بولا ثبوت ہے۔ ان علاقوں کے ذرے ذرے کی خوبصورتی اللہ کی صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہے جنہیں ان شیطانوں نے ویرانی میں وار خوف میں بدل دیا۔ رب انہیں غارت کرے بازگشت میں قرۃ العین کے حسب ونسب نے دل کے تار جھنجھوڑ کر اور روح کو بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔ مقدر انسان کے ساتھ کیا کیا کھیل کھیلتا ہے۔ سب سے آخری میں اُم ایمان کی اَن کہی کا در کھلا۔ یہ ناولٹ بھی اچھا رہا۔ ماں کی تکلیفوں کو محسوس کرنے والے بیٹے نے انتقام کا جو کھیل کھیلا اپنے بچے کی آمد نے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کے دل سے انتقام کی آگ بجھا دی۔ اور اس اَن کہی نے سب کچھ ہی کہہ ڈالا۔ گویا کہ اس ماہ (فروری 17) کی بقیہ سب تحریریں بھی اچھی رہیں۔ دوشیزہ گلستان کے پھول بھی مہک رہے تھے۔ اس مرتبہ شاعری بھی اچھی رہی۔ خولہ عرفان کی غزل پسند آئی۔ باقی سلسلے بھی اچھے ہیں۔ طبیعت کی خرابی اور نظر کی وجہ سے اب لکھتے ہوئے غلطیاں کر جاتی ہوں۔ سدھار بھی لیا کریں اور نظر انداز بھی کر دیا کریں شکریہ۔ شائستہ عزیز کیسی ہیں آپ کو اور فرح اسلم قریشی کو ماہ مارچ میں میری طرف سے زندگی کے گزرے سال کی عافیت پر مبارک اور آنے والے سال میں خوشیوں برکتوں کی دعائیں آپ سب کے لیے بہت سی پُر خلوص دعائیں اللہ حافظ بھگت کبیر کے اس گہرے احساس کے ساتھ

من کی من میں بات رہے تو من میں لاگے روگ
من کھولیں تو مشکل کردیں جیون اپنا لوگ

ج: رضوانہ جی! اللہ آپ کو جلد مکمل صحت عطا فرمائے آپ کی محبتوں کی تو نہ صرف میں بلکہ ادارہ بھی قرض دار ہے۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ یقین کریں اب لوگوں کے خطوط پڑھ کر بہت حوصلہ بھی بہت ملتا ہے اور غلطیاں سدھارنے کا موقعہ بھی آپ کا بھرپور تبصرہ لکھاریوں کے لیے بھی سودمند ثابت ہوگا۔

✉: ملتان سے تشریف لائی ہیں فصیحہ آصف، لکھتی ہیں۔ مزاج اچھے ہوں گے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم میں بھی عافیت میں ہوں۔ دو ماہ پہلے خط مع تبصرہ روانہ کیا، جانے کہاں کھو گیا؟ اللہ کرے یہ خط آپ کو بروقت مل جائے۔ اب ذرا فروری کے دوشیزہ پر کچھ کہوں گی۔ سرورق پسند نہیں آیا آگے چلیے آپ کی باتیں بطور احتجاج پڑھیں۔ اقبال شاہین سے صرف یہ گزارش ہے کہ کچھ بھی ہو آخر ہماری ٹیم ہماری ہے۔ اگر اس پر کچھ برا وقت آ ہی گیا ہے تو ہم اسے سنبھالا دیں گے نہ کہ اسے تنہا چھوڑ دیں آپ کی باتیں اپنی جگہ درست مگر ہم اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کو شاہین ہی پکاریں گے کہ وہ اس کی لاج ضرور رکھیں گے آپ زیادہ دل برداشتہ نہ ہوں۔ بقول ناصر کاظمی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

اب قدم رنجہ فرماتے ہیں دوشیزہ کی پُر بہار محفل میں' جی سچی کہانیاں ایوارڈ کی تقریب میں شامل ہوئی۔ احوال سچی کہانیاں میں ہی پڑھیے گا آپ کی محسوس ہوئی آپ اپنی مصروفیات سے وقت نہ نکال پائی ہوں گی۔ چلیں اگلی بار سہی' زمر نعیم کا تفصیلی خط اچھا لگا' فرح اسلم نے بھی خوب لکھا۔ مزیدار خط خولہ عرفان کا رہا۔ وہ بہت باریک بینی سے تحریریں پڑھ کر جاندار تبصرہ کرتی ہیں اللہ پاک ان کے قلم کو دوام بخشے آمین۔ ثمینہ طاہر بٹ بھی کسی سے پیچھے نہ رہیں اور خوب تبصرہ کیا' پُر خلوص اور بے لوث محبت کرنے والی باجی نگہت غفار کا خط بھی انہی کی طرح مدبرانہ لگا۔ فہد کی شادی کا احوال بھی انہوں نے خوب لکھا تصاویر کا مزا الگ آیا۔ بلال فیاض اور نیئر شفقت بھی اپنی باتیں کہنے میں کامیاب رہے۔ سوہائے علی ابڑو کا احوال پڑھ کر دل افسردہ ہوا۔ اللہ ان کے بچھڑوں کو ان سے ملا دے آمین دام دل کی قسط نمبر 25 مکمل طور پر دلی جذبات کی آئینہ دار رہی۔ چمن سے بہت ہمدردی ہے براہِ کرم اس کے دکھوں میں مزید اضافہ نہ کیجیے گا اور ندا کو ارسلان سے بچ کے رہنا ہوگا رہ گیا ثمر تو اسے واقعی اب کوئی فیصلہ شعور میں رہتے ہوئے کرنا ہوگا۔ کاشی بھائی کی تحریر موجودہ حالات کی پوری طرح عکاس تھی۔ اچھی لگی' روحیلہ خان کی سیکن نے ایک ہنستے بستے گھر کو پھر سے مسکرانے پر مجبور کردیا۔ خاص نمبر کی خاص تحریر فرزانہ آغا کی' کی جاناں میں کون' رہی۔ ماضی اور حال کے تانے بانے بنتی نازک رشتوں کا حال سناتی افسردہ کرتی یہ تحریر جی جان سے پسند آئی۔ ویل ڈن مصنفہ' ریشمی باتیں' فلسفیانہ تحریر تھی بج گئی حور عین کو پھول قبول کرکے زندگی کو مہکانا چاہیے۔ تین انگلیاں سبق آموز تحریر عقیلہ حق ہی لکھ سکتی ہیں۔ پر دین کی باتیں سمجھے کون اور عمل کون کرے۔ ہر بندہ یہ کہتا ہے کہ میں ٹھیک اور سچا ہوں۔ خود فراموشی کا یہ عمل غیر احتسابی ہے۔ توجہ کی ضرورت ہے۔ قسمت کے کھیل نرالے ڈیئر نسیم سکینہ صدف میرے خیال میں اس کے بیٹے اور زبیر کی بیٹی کی شادی مناسب نہیں کیونکہ وہ گھرانہ کسی طرح بھی پاکباز نہیں ہے اور یہ شادی زیادہ عرصہ نہیں چلے گی سو عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اس شادی کو نہ ہونے دیا جائے۔ فرح انیس کی تحریر نے بور کیا۔ ثمینہ طاہر بٹ کی کاوش بہترین لگی۔ عمران مظہر کی تحریر واقعی حقیقت سے دور لگی۔ کیونکہ ہم نے جو' جو دیکھا ہے وہاں تو بس جنگ و جدل ہی ہوتے دیکھا سوکنوں میں، باجی نگہت غفار کی مہکتی تحریر اطراف میں خوشبو بکھیر گئی۔' کچھ اَن کہی' اُمِ ایمان قاضی کا ناولٹ دل میں جگہ بنا گیا۔ فلسطین کے پس منظر میں لکھی گئی ماہ وش طالب کی دستک بہت عرصہ تک ذہن میں رہے گی۔ اللہ تعالیٰ سے خاص دعا ہے کہ وہ فلسطین' کشمیر' شام' رونگھیا اور جہاں جہاں مسلمان ظلم و ستم کا شکار ہیں ان پر رحم فرمائے آمین۔ شکنجے شیطان' سبق دینے میں کامیاب رہا۔ ابھی امکان باقی ہے سبرینہ کا شاطر ذہن اب نئی کہانی بن رہا ہے مگر اصم اور اروی کے ساتھ ہرگز برامت کرنا اور انعم کا دماغ بھی درست کریں کہ وہ کچھ بردباری کا ثبوت دے۔ کلاسک ادب سے ایک توشہ خاص آپ نے چنا حسب نسب اسی طرح ہر ماہ کسی بھی بڑے ادیب کی تحریر رسالے میں خوبصورتی پیدا کرے گی۔ جیسے انتظار حسین' بانو قدسیہ (اللہ اُن کی مغفرت فرمائے آمین) اشفاق احمد' غلام ثقلین نقوی' ممتاز مفتی

وغیرہ وغیرہ...... جی تو مختصر سا تبصرہ ہوا مکمل باقی رسالے پر آپ کی محنت واضح ہے اللہ اسے بام عروج نصیب فرمائے آمین۔ اس ماہ فریدہ جاوید فری، آپی رضوانہ کوثر، تسنیم نیازی، سنبل، رضوانہ پرنس کے خطوط کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔

ﷺ: ڈیئر فصیحہ! آپ کی رائے سر آنکھوں پر۔ شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ انشاء اللہ اگلے سچی کہانیاں ایوارڈز پر ضرور ملاقات ہوگی۔ آپ کی رائے رائٹرز تک پہنچ گئی ہوگی۔ بروقت محفل میں آمد کا شکریہ۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں مسز نگہت غفار لکھتی ہیں۔ بھئی ہوا یہ کہ ہم نے آپ کے آفس فون کیا کہ یہ معلوم کرلیں کہ فہد کی شادی کا احوال کب آئے گا۔ کسی جینٹس نے ریسو کیا انہوں نے ہولڈ پر رکھا کہ آپ سے ابھی میں بات کراتا ہوں۔ اور بھئی جب ہم نے دوبارہ اپنا تعارف کروا کے پوچھا تو جواب سننے سے پہلے...... سیل بند ہوگیا۔ ہم نے صبر کا دامن تھام لیا کہ جب محترمہ بجلی صاحبہ تشریف لائیں گی تو چارج کرکے پھر بات کریں گے مگر ذہن سے نکل گیا اچانک رضوانہ کوثر صاحبہ کا میسج آیا کہ نگہت بیٹے کی شادی مبارک ہو۔ احوال آگیا ہے میں نے فوراً میسج کیا۔ کس میں؟ تب جواب ملا دوشیزہ میں...... اب بھلا ہمیں کہاں صبر آتا گھر میں کوئی نہیں تھا ہم نے فوراً فہد کو فون کیا کہ بیٹا جنوری کا پاکیزہ فروری کا دوشیزہ لاؤ ریشم تو اس ماہ کا آ ہی جائے گا پھر جناب انتظار کی گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی محسوس ہونے لگیں اور رات کو فہد اور صبا گھر پہنچے اور ہم نے جب شادی کا احوال پڑھا اور رسالے کی ورق گردانی کی تو خوشی اور مسرت سے آنکھیں چمکنے لگیں اور ہم نے محسوس کیا کہ آنکھیں چمکنے کے ساتھ نم بھی ہوگئی تھیں کیوں؟ ارے بھئی خوشی اور مسرت کے لمحات جب میسر ہوتے ہیں تو زیادہ تر آنکھیں نم ہوجاتی ہیں ہماری کہانی بھی شائع ہوئی۔ بہت بہت شکریہ اور ڈھیروں ڈھیر نوازش آپ کی نذر...... دوشیزہ محفل میں خود کو پاکر بہت خوشی ہوئی دوشیزہ گلستان نئے لہجے نئی آوازیں میں بھی خود کو دیکھ کر یقین کیجیے ایسا لگا کہ گویا آپ نے اس بار مکمل ارادہ کرلیا تھا کہ ہمیں یکے بعد دیگرے کئی خوشیاں دینا چاہ رہی تھیں تو یہ لو دعائیں۔ سب سے پہلے والدہ محترمہ کا سایہ سدا سلامت رہے آپ اور آپ کی فیملی کا ہر فرد اللہ کی رحمتوں کے حصار میں رہے۔ صحت، زندگی، کامیابی اور نیک نامی کے حصار میں آپ سب رہیں۔ دوشیزہ اور اُس کی فیملی ہمیشہ نیکی اور کامیابی کی منزل پر شہرت کی سیڑھی پر سلامتی اور بقاء کی کرنوں میں گھری رہے (آمین) کہانیاں شکست فاش، زندگی گلابوں کی کیاری، وہ جو اک ارمان تھا، عشق اک روگ، ابھی اتنی ہی کہانیاں پڑھیں اچھی لگیں۔ دوشیزہ گلستان میں رفعت، راحت وفا، غزالہ عافیہ، محمد عرفان، نیرہ شاکر کی تحریریں اچھی لگیں۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں عامر ثانی، فریدہ فری، رجا امیر، نینا خان، عائشہ نور، نگین افضل، اُن کی آوازیں اور لہجے پسند آئے اجازت چاہتی ہوں زندگی باقی رہی تو اگلے ماہ حاضری یقینی ہے۔ اس دعا کے ساتھ خدا حافظ۔ اللہ رب ذوالجلال اپنی رحمتوں کا سایہ آپ سب پر رکھے۔ دوشیزہ کی فیملی بھی اللہ کی رحمتوں کے سائے میں رہے۔ آمین۔

ﷺ: نگہت جی! آپ کی وجہ سے دوشیزہ کی محفل میں کچھ کراچی کا بھی رنگ آیا ورنہ پنجاب اس بار محفل لے اڑا تھا۔ آپ کو خوشی ملی یہ جان کر مجھے اچھا لگا دوشیزہ آپ لوگوں کا ہی رسالہ ہے اور آپ سب کا اس پر حق ہے بس کبھی کبھی دیر سویر ہوجاتی ہے تو برا مت منایا کریں۔ باقی تمام تحریریں آپ کو اچھی لگیں شکریہ

آپ کا سلام امی تک اور دعائیں دانیال زین تک پہنچادی ہیں۔

✉:لندن سے تشریف لائی ہیں سعدیہ عینیتھی، لکھتی ہیں۔ پیاری دوست حسب وعدہ محفل میں شرکت کررہی ہوں بس تم تو جانتی ہو پچھلے دنوں طبیعت ٹھیک نہیں تھی اب بہتر ہوں یہاں ٹھنڈ بھی تو بہت پڑتی ہے بس اسی لیے کچھ نڈھال سی ہوگئی تھی۔ فروری کا شمارہ زبردست تھا تمام افسانے بہت اچھے تھے۔ میں تو جب تک پورا رسالہ نہ پڑھ لوں چین نہیں آتا۔ اداریے کا انداز بہت اچھا لگا۔ نگہت غفار صاحبہ اور سکینہ فرخ صاحبہ کو میری طرف سے بھی مبارکباد دونوں کے گھر شہزادی آئی ہے ایک بہو کے روپ میں دوسری نواسی کے روپ میں ...... سپنے سہانے اختتام پذیر ہوا اینڈ بہت اچھا تھا مصنفہ کی آخر تک مکمل گرفت رہی۔ فرزانہ آغا کا ناولٹ شاندار تھا ان کی تحریر مجھے ہمیشہ سے ہی پسند ہے مگر کم کم لکھتی ہیں۔ اُم ایمان کا ناولٹ کچھ ان کہی بھی جاندار تھا۔ منزہ ڈیئر ایک افسانہ بھیجا تھا کب لگاؤ گی انتظار ہے۔ اپنا اور اپنے سے جڑے تمام لوگوں کا بہت خیال رکھنا ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہو۔

✍:اچھی سی سعدیہ! آپ کا افسانہ حاضر ہے طبیعت میں بہتری کا سن کر اطمینان ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اب کافی وقت ہوگیا پاکستان کا چکر لگالیں۔ اداریہ اچھا لگا آپ کا شکریہ امید کرتی ہوں فرزانہ پر آپ کی فرمائش کا گہرا اثر ہوگا۔

✉:لاہور سے تشریف لائی ہیں حنا بشریٰ لکھتی ہیں۔ امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو اور تمام ادارے کو سلامتی صحت اور خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ آج جس مقام پر ہے وہ اللہ کے کرم اور آپ سب کی محنت سے ہے۔ اللہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔ فروری کا دوشیزہ واقعی خاص تھا۔ سب سے پہلے اقبال کے شاہین کا احتجاج پڑھا جو وہ واقعی ٹھیک کررہا تھا۔ دوشیزہ کی محفل میں بے حد محبت بھرے خطوط شامل تھے۔ سوہائے علی ابڑو سے ملاقات اچھی رہی۔ مسز نگہت غفار صاحبہ کو بیٹے کی شادی کی بہت بہت مبارکباد اللہ تعالیٰ خوشیوں کو قائم دائم رکھے آمین۔ لائف بوائے میں اسماء اعوان نے بہت اچھا لکھا۔ سلسلے وار ناول اچھے جارہے ہیں۔ اس بار دوشیزہ میں افسانے ٹاپ پر رہے۔ سب سے پہلے اپنے پیارے بھیا کا افسانہ پڑھا۔ خالی ہے کاسۂ دل کاشی بھیا کے حساس قلم سے ایک بہت اثر انگیز تحریر تھی۔ بھیا آپ تو جب بھی لکھتے ہیں کمال کرتے ہیں۔ باقی افسانے جن مین سیلن روحیلہ خان کی تحریر بھی متاثر کن تھی۔ عقیلہ حق نے تین انگلیاں پر لکھ کر خوب انصاف کیا۔ بہت اچھا لکھا۔ ریشمی باتیں، وہ جو اک ارمان تھا، سب مایا ہے، زندگی گلابوں کی کیاری، دستک، بہاریں میرے دامن میں یہ سب کے سب افسانے بہت اچھے تھے۔ نسیم سکینہ صدف کی تحریر قسمت کے کھیل بہت منفرد تھی۔ عشق ایک روگ سید عبادت کاظمی، شکستِ فاش فصیحہ آصف خان دونوں تحریروں نے بہت متاثر کیا۔ شکستِ فاش ابتداء سے اختتام تک اثر انگیز رہی۔ ثمینہ طاہر بٹ کی تحریر سب مایا ہے ایک بہت اچھا سبق دیتی بہت اچھوتی تحریر تھی۔ دوشیزہ گلستان رنگ برنگے پھولوں سے مہک رہا تھا۔ کچن کارنر بھی خوب تھا۔ اتنے اچھے افسانے لکھنے پر تمام رائٹرز کو بہت بہت مبارکباد اللہ مزید ترقی و عروج عطا فرمائے (آمین) تمام دوشیزہ ہی زبردست تھا۔

ﮬ: پیاری حنا! ادارہ یہ پسند کرنے کا شکریہ افسانوں کی پسندیدگی ان کے لکھاریوں تک پہنچادی ہے۔ دوشیزہ گلستان میں اپنا بھی حصہ ڈالا کرو اور مجھے تمہاری کوئی بات بری نہیں لگی خط میں تعریف اور تنقید دونوں ہوں تو مزہ آتا ہے۔

⋈: عائشہ نور عاشا لکھتی ہیں۔ منزہ جی کیسی ہیں آپ؟ میں نے ہر ماہ آپ کو خط لکھا اور لکھ کر پاس ہی رکھ لیا کیونکہ پوسٹ نہیں کر سکی آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کئی بار کال بھی کی مگر آپ سے بات نہیں ہوسکی دسمبر کے شمارے میں میرا افسانہ شائع کرنے پر بہت بہت شکریہ میں بے حد خوش ہوں شاید خوشی کا اظہار لفظوں میں کرنا ناممکن ہے۔ فروری کا شمارہ ابھی مجھے نہیں ملا اور جنوری کا بھی تاخیر سے ملا تھا مگر پڑھنے میں بہت اچھا لگا سب سے خاص 'باہم بیٹھ کر' بہت ہی اچھا تھا اس میں رضوانہ پرنس' کاشی چوہان' غزالہ رشید اور آپ سب کا احوال مزادے گیا۔ چونکہ میرا خط آپ کو کافی عرصے بعد ملا ہے اس لیے میں تو زیادہ ٹائم لوں گی اور بور بھی نہیں کروں گی۔ خوشی جو میں سب سے شیئر کروں گی کہ میرا ایم اے انگلش پارٹ ون کا رزلٹ آیا اور میں پاس ہوگئی میرے لیے تو بہت خوشی کی بات ہے۔ دوسری خوشی یہ کہ میری چھوٹی بہن نگین افضل وڑائچ اور میری اماں جان عمرہ کی سعادت کے بعد وطن واپس آ گئی ہیں۔ منزہ جی کافی عرصہ ہوا میں نے دو کہانیاں ارسال کی تھیں۔ میری عیدیں تیرے لیے' اور 'کیا تم میرے تھے' ان کا کچھ بتادیں وہ آپ کو ملی بھی ہیں یا کہیں راستے میں کھو گئیں؟ اسی کے ساتھ ایک اور افسانہ ارسال کر رہی ہوں مختصر سا ہے مگر بہت سچا سا...... امید ہے وہ ابھی آپ کو پسند آئے گا نی الوقت جو باتیں ذہن میں تھیں وہ لکھ ڈالی ہیں اور جو رہ گئی ہیں ان کا وقت بھی تو گزر گیا...... اب اجازت چاہتی ہوں اگلے ماہ پھر آدھی ملاقات ہوگی۔

ﮬ: سویٹ عائشہ! امتحان کی کامیابی پر ڈھیروں دعائیں اور بہت ساری شاباش...... زبردست قسم کے انشاء اللہ لکھو میں ضرور شائع کروں گی۔ میری جانب سے امی اور بہن کو عمرہ ادا کرنے پر بہت مبارکباد اور پیاری سی لڑکی تمہارا خط مجھے بور نہیں کرتا لہٰذا دل کھول کر لکھا کرو۔ کہانیوں کے بارے میں کاشی بتا سکتے ہیں ہاں افسانہ جلد شائع ہوگا۔ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ تمہیں خود محسوس ہوگا کہ چند سطروں کے اضافے نے تمہارے افسانے کو کس قدر مضبوط کر دیا ہے۔

⋈: کراچی سے تشریف لائی ہیں فرحی نعیم لکھتی ہیں۔ امید ہے بخیر و عافیت ہوں گی۔ ایک کہانی 'سرپرائز' کے عنوان سے بھیج چکی ہوں اور اب دوسری کہانی بھیج رہی ہوں۔ خطوط کے جوابات آپ جس اپنائیت سے دیتی ہیں۔ سچ ساری اجنبیت ختم ہوجاتی ہے۔ اگرچہ آپ کے رسالہ کے لیے میں نئی ہوں اور بہت ڈرتے ڈرتے یہ دوسری کہانی بھیج رہی ہوں لیکن امید ہے کہ اگر میری کہانی آپ کے معیار پر پوری اتری تو جلد شامل اشاعت ہوجائے گی۔

ﮬ: بہت ہی پیاری فرحی! اپنوں کی محفل میں ڈر کیسا...... یہ تمہاری اپنی محفل ہے بلا خوف و خطر کود جایا کرو سب کے درمیان۔ تمہارا افسانہ انشاء اللہ اگلے ماہ ضرور شائع ہوجائے گا۔ مجھے تمہارے تبصرے کا بھی انتظار رہے گا۔

اس آخری خط کے ساتھ اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر اس رنگارنگ محفل میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ خوش رہیے اور خوش رکھیے۔ اللہ حافظ۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

موسٹ گڈ لکنگ

ماڈل اور اداکار

مونی خان
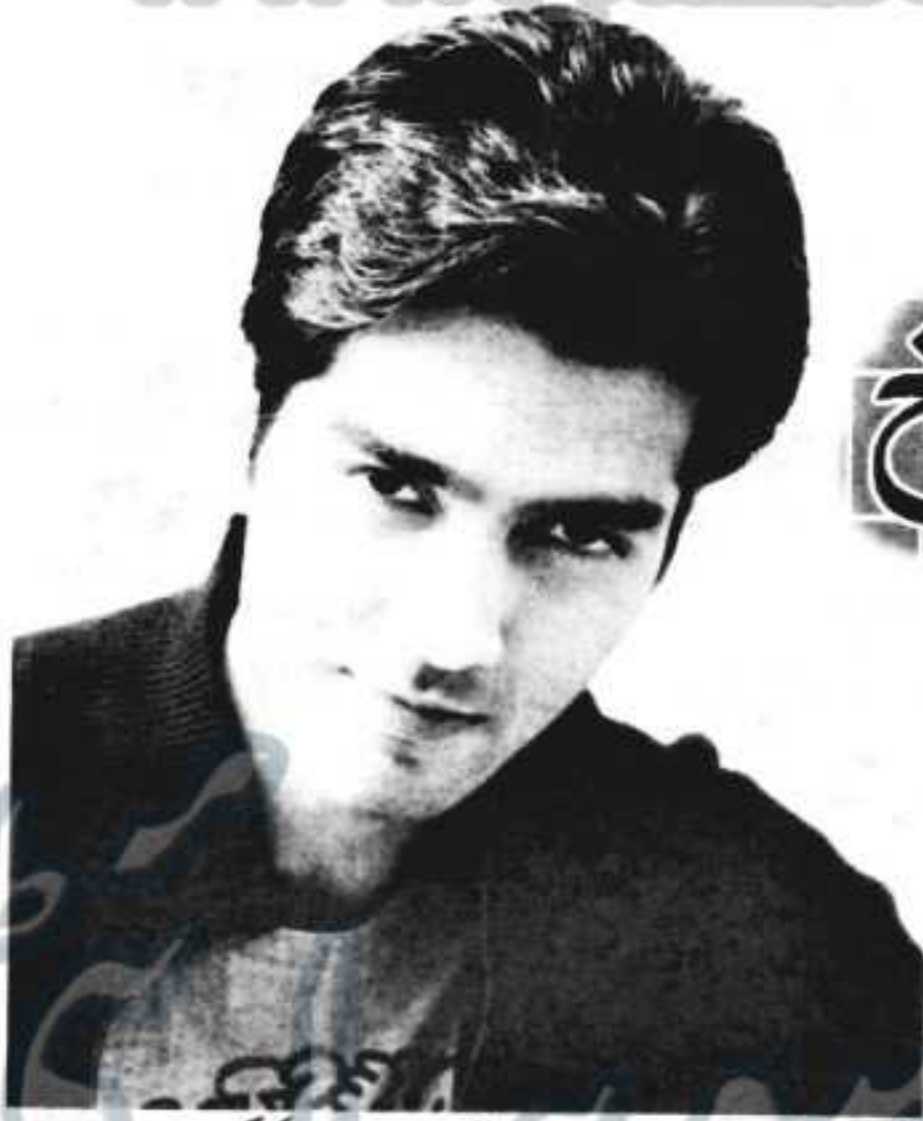
پاکستانی شوبز کا سب سے روشن ستارہ 'جاوید شیخ'، جن کے پرانے ڈرامے آج بھی لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کے گھر ایک ننھا منا سا شہزادہ پیدا ہوا جس کا نام والد اور والدہ زینت منگی نے شہزاد شیخ رکھا۔ شہزاد نے بہت کم وقت میں شوبز انڈسٹری میں اپنی دھاک بٹھا دی ہے۔ 26 ستمبر 1982ء کو کراچی میں پیدا ہونے والے اس بچے نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کئی بہترین ڈرامے اور فلمیں کیں، جن میں قابلِ ذکر فلمیں 'کراچی سے لاہور' اور 'میں ہوں شاہد آفریدی' ہیں۔
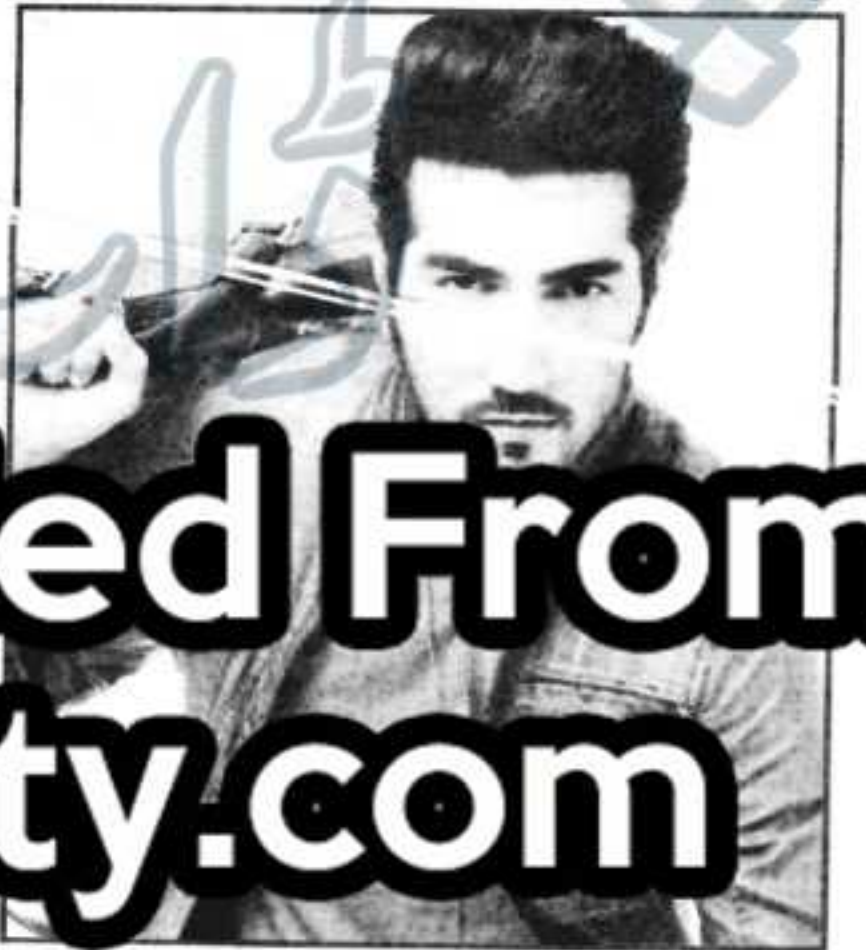
ڈراموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ شہزاد نے نیویارک سے ایکٹنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ اپنی تعلیم مکمل کر کے وہ پاکستان آ گئے اور 2011ء میں AAG ٹی وی سے اپنے کیریئر کی شروعات کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ شہزاد کی اداکاری بہت نکھر گئی ہے ظاہر ہے تعلق ایسے گھر سے ہے جہاں والد کے علاوہ بہن مومل شیخ، چچا سلیم شیخ پھوپا بہروز سبزواری، کزن شہروز سب کا تعلق شوبز کی دنیا سے ہی ہے۔ شہزاد نے جن ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے اُن میں 'عینی کی آئے گی بارات' تیسری منزل' میرے ہمراہی' ہلکی سی خلش' شریکِ حیات' سوتیلی بھابی' وصلِ یار' اذن رخصت اور چھوٹی سی زندگی سرفہرست ہیں۔ شہزاد نے 2012ء میں حنا میر سے شادی کی۔ کپل نہایت خوشگوار زندگی گزار رہا ہے اور دونوں ایک پیارے سے بیٹے کے والدین بھی بن گئے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ شہزاد اپنے والد کی طرح ایک دن پاکستانی شوبز انڈسٹری پر راج کریں گے۔ ☆☆☆

سارہ خان

نازک اندام اور نہایت خوبرو اداکارہ اور ماڈل

ذیشان فراز

س: سارہ شوبز میں آمد اتفاقیہ ہے یا شوق تھا؟

ج: دراصل مجھے ماڈلنگ کا شوق تھا اور میں نے ماڈلنگ کو صرف گلیمر کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ پاکستان، بھارت، امریکہ اور یورپ کی ماڈلز کا بھرپور مشاہدہ بھی کیا ہے اور انہی کے تجربات سے سیکھنے کی بھی کوشش کرتی ہوں۔

س: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ماڈل اداکاری کرسکتی ہے؟

ج: جی بالکل! ایک اچھی ماڈل ٹی وی اداکارہ کے ساتھ فلمی اداکارہ بھی بن سکتی ہے اس لیے کہ اسکرین پر کامیاب ہونے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے پاس پہلے سے ہی ہوتی ہیں۔ مثلاً قد، کاٹھ اور خوبصورتی پھر ماڈلنگ میں ٹائمنگ سکھائی جاتی ہے جہاں تک ڈائیلاگ ڈلیوری کا تعلق ہے تو وہ اچھا برا وقت اور حالات سکھا دیتے ہیں۔

س: آپ کی آج کل کیا مصروفیات ہیں؟ کیا کام ہو رہا ہے؟

ج: میں آج کل مختلف ڈراموں میں کام کررہی ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ منجھے ہوئے آرٹسٹوں کے ساتھ کام کرنے سے سیکھنے کا بہت

موقع ملتا ہے اس کے علاوہ کچھ میوزک ویڈیوز بھی کی ہیں، کئی اشتہارات آن ایئر ہو چکے ہیں۔ ریمپ پر تو واک کرنا مجھے بہت پسند ہے۔

س: آپ کو ڈراموں میں کام کرنا زیادہ پسند

ہے یا ماڈلنگ میں زیادہ دلچسپی ہے؟
ج: مجھے ایکٹنگ کرنے میں زیادہ مزا آتا ہے پھر میں لکی ہوں کہ مجھے لوگ بہت اچھے ملے۔
س: آپ کے گھر والوں نے آپ کے شوق میں آپ کا ساتھ دیا یا اعتراض کیا؟
ج: جی بالکل! مجھے گھر سے مکمل سپورٹ ہے یہی وجہ ہے میری چھوٹی بہن نور بھی ڈراموں اور اشتہارات میں کام کر رہی ہے۔
س: سارہ آپ نے ماڈلنگ اور گلیمر کی فیلڈ کو کیسا پایا؟
ج: (ہنستے ہوئے) دیکھیے یہ سچ ہے کہ یہاں جھوٹ اور منافقت بہت زیادہ ہے مگر یہ دونوں بیماریاں تو اب ہمارے معاشرے میں آپ کو ہر جگہ پھیلی ہوئی نظر آئیں گی۔ لوگوں کو جھوٹ کے بل بوتے پر کامیابی بھی مل جاتی ہے مگر وہ وقتی ہوتی ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں میرا ایمان ہے کہ میرے حصے کی دولت، شہرت اور عزت کوئی نہیں چھین سکتا لہٰذا میں پوری محنت اور دلجمعی سے اپنا کام کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔
س: سب سے زیادہ خوشی کب ملتی ہے؟
ج: جب لوگ میری پرفارمنس کو سراہتے ہیں اور سچی تعریف کرتے ہیں مجھے میرے کرداروں یا پرفارمنس کے حوالے سے یاد رکھتے ہیں تب

بہت خوشی ہوتی ہے۔
س: کون سے ایسے انسانی رویے ہیں جو تکلیف دیتے ہیں؟
ج: مجھے جھوٹ اور جھوٹی تعریف کرنے والوں سے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔ ملنے پر آنکھوں کی تعریف، ہنسی کی تعریف کرتے ہیں مگر میں جانتی ہوں کہ وہ سب کے ساتھ ایسا ہی رویہ رکھتے ہیں۔
س: یعنی آپ کو اپنی تعریف سُننا اچھا نہیں لگتا؟
ج: ارے نہیں بھئی کون ہوگا جسے اپنی تعریف پسند نہ ہو مگر جھوٹی تعریف یقیناً اچھی نہیں لگتی اور یقین کریں جھوٹی تعریف فوراً پتہ چل جاتی ہے۔
س: آپ خود پسندی کی کس حد تک قائل ہیں؟
ج: میرا ماننا ہے کہ انسان کو اپنے آپ سے پیار ضرور ہونا چاہیے مگر ایک حد تک کیونکہ اگر آپ اپنے آپ سے پیار نہیں کریں گے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر خوش نہیں ہوں گے تو آپ کسی سے بھی محبت نہیں کرسکتے۔ کسی کی بھی قدر نہیں کرسکتے۔ حد سے تو انسان جہاں سے بھی گزرا وہاں سراسر نقصان ہی حاصل ہوا ہے۔
س: آپ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہیں یا سچ کا سامنا کرنا پسند کرتی ہیں؟
ج: میں بہت پریکٹیکل انسان ہوں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس تیز رفتار دور میں Survive کر رہی ہوں۔
س: جب انجوائے کرنا چاہتی ہیں تو کیا کرتی ہیں؟
ج: ویسے تو میں اپنے کام کو ہی بہت انجوائے کرتی ہوں۔ مگر فارغ وقت میں گھومنا پھرنا پسند ہے۔ کتابیں پڑھنا پسند ہے، اور میوزک سننا بھی...... میں بس خوش رہنا چاہتی ہوں۔

س: زندگی سے کیا سیکھا؟
ج: زندگی بہت خوبصورت ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے ہر دن بھرپور انداز میں گزارنا چاہیے اور صرف اپنے اوپر بھروسہ کرنا چاہیے کسی سے کوئی امید نہ رکھیے بس میں نے یہی سیکھا ہے۔
س: بہت کم وقت میں بہت شہرت حاصل ہوئی کیسا لگتا ہے؟
ج: بہت اچھا لگتا ہے میں بہت خوش نصیب ہوں کہ لوگوں نے میری اداکاری کو پسند کیا۔
س: آپ اور نور دونوں بہنیں آج کل شوبز انڈسٹری پر چھائی ہوئی ہیں وجہ؟
ج: (ہنستے ہوئے) وجہ شاید یہ کہ ہم لوگ

صرف اپنے کام پر توجہ دیتے ہیں اور بس......

س: کتنے بہن بھائی ہیں اور کیا باقی بھی سب اسی انڈسٹری سے وابستہ ہیں؟

ج: ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہیں اور صرف میں اور نور شوبز سے جڑے ہوئے ہیں۔

س: آپ کی ڈیٹ آف برتھ کیا ہے؟

ج: 22 جنوری 1992ء کراچی۔

س: تعلیم کتنی اور کہاں سے حاصل کی؟

ج: میں نے گریجویشن کیا ہے کراچی یونیورسٹی سے۔

س: وہ کون سا ڈرامہ ہے جس کے بعد آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کو بہت شہرت ملی؟

ج: ہم چینل سے نشر ہونے والا ڈرامہ 'بڑی آپا' نے مجھے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا اور اس کے بعد جیو سے نشر ہونے والا ڈرامہ 'مراۃ العروس' کے بعد تو ڈراموں کی لائن ہی لگ گئی۔

س: کرکٹ شوق سے دیکھتی ہیں اور کس ٹیم کو سپورٹ کرتی ہیں؟

ج: آف کورس کراچی کنگز کو اور مجھے کرکٹ بہت پسند ہے کراچی میں پیدا ہوئی پلی بڑھی تعلیم یہاں سے حاصل کی I Love Karachi اسی لیے کراچی کنگز میری پسندیدہ ٹیم ہے۔

س: اس فیلڈ میں آنے والے نئے لوگوں کو کیا مشورہ دیں گی؟

ج: صرف چند اصولوں پر قائم رہیں زندگی آسان ہوجاتی ہے پہلی بات اپنے کام سے کام رکھیں کسی سے دشمنی نہ لیں اور کسی کو دوست بھی نہ سمجھیں بس پھر یہ فیلڈ بہت اچھی ہے۔

☆☆......☆☆

لائف بوائے...... بالوں کے ہر مسئلے کا اصل حل

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

''ہیلو گرلز!'' مس فرناز نے آتے ہی تمام لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ ''وائے آر یو سیڈ گرلز!'' اپنا بیگ ٹیبل پر رکھ کر ایک طائرانہ نظر سب لڑکیوں پر ڈالی ۔کسی نے بھی چہرے پر مسکراہٹ کے پھول نہ کھلائے تو فرناز نے معاملے کی سنجیدگی محسوس کی۔

''ارے بابا کیا بات ہوگئی جو آج سب کے چہرے اس طرح مرجھائے ہوئے ہیں۔ پلیز بتاؤ بھئی! میں اس طرح تم سب کو نہیں دیکھ سکتی۔'' فرناز کرسی سے اُٹھ کر لڑکیوں کے ساتھ ڈیسک پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''باجی وہ......'' سلمیٰ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''ارے بتاؤ نا......''

''وہ نائلہ کی امی نے اِسے......'' وہ پھر جھجکی۔

''نائلہ اسٹینڈ اپ......تم بتاؤ کیا بات ہے؟''

''باجی! امی نے میرے بال کٹوا دیے۔'' نائلہ نے ململ کا سفید دوپٹہ اُتارا تو نہ چاہتے ہوئے بھی فرناز کا قہقہہ بلند ہوا اور پھر تھوڑی سی دیر کے بعد سب لڑکیاں بھی ہنسنے لگی تھیں۔ کچھ دیر پہلے جہاں سوگ کا سا سماں تھا اب وہاں سب قہقہے لگا رہے تھے۔

''اچھا اب سب سیریس ہو جائیں۔'' فرناز کے کہنے پر سب سیریس ہو گئیں۔

''نائلہ! جانو یہ بتاؤ کہ تمہاری امی نے یہ سب کیوں کیا۔'' فرناز نے نائلہ سے وجہ پوچھنا چاہی۔

''باجی! امی کہتی ہیں کہ بال تو تیرے بڑھتے نہیں ہیں اور جو ہیں اُن میں روز روز کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ جڑ سے ہی نکال دیا انہوں نے باجی اور......'' پھر سے نائلہ کی آنکھوں میں نمی بڑھنے لگی تھی۔

''پلیز...... چیئر اَپ نائلہ! بچے میں ابھی تو کچھ نہ کر سکی مگر انشاء اللہ جلد تمہارے اِس مسئلے کا حل ڈھونڈوں گی۔ آج تو ہم سب کلاتھ بلاکنگ سیکھیں گے۔'' فرناز لڑکیوں کو بلاک پر مختلف نمونے بنا کر کٹنگ سکھانے لگی۔

☆......☆......☆

یہ گورنمنٹ کا ایک ووکیشنل سینٹر تھا۔ متوسط طبقے کی لڑکیاں یہاں ہنر سیکھنے آتی تھیں۔ نائلہ اپنے بالوں کی وجہ سے ہمیشہ ہی پریشان رہتی تھی۔ فرناز نے بھی اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا۔ مگر آج جب نائلہ کا

یہ حال دیکھا تو وہ اندر سے لرز کر رہ گئی ایک بچی کا حسن اُس کے بالوں میں ہی تو پوشیدہ ہوتا ہے۔ بھلا نائلہ کا اس سب میں کیا قصور تھا۔

فرناز شاہ گھر آ کر بھی مستقل نائلہ ہی کے بارے میں سوچ جا رہی تھی۔

''ممی میں شام کو دادو کے گھر یہ والی فراک پہن کر جاؤں۔'' فرناز کی بیٹی ارشماز نے اپنے گولڈن بال لہراتے ہوئے کہا تو نائلہ کا سر اُس کے سامنے آ گیا۔

اُس کے دماغ نے اس پر کڑا وار کیا۔

''پہلے کیوں نہیں سوچا تھا کہ مسئلے کا حل تو مٹھی میں لیے گھوم رہی ہو۔'' اُسے دماغ کے دلیل پر پیار آ گیا۔

''سوری!'' اُس نے اپنے دماغ کو بہلایا۔

''تو پھر جاؤ اور بچی کا مسئلہ حل کر دو۔'' دماغ نے اُکسایا اور وہ مسکرا دی۔ اُسے بہت پہلے کی ایک یاد نے ستایا۔ جب وہ خود بالوں کے ان مسائل میں گھری تھی۔ اچانک ہی ذہن کے منظر بدلے اور وہ روشن دن طلوع ہو گیا۔

☆......☆......☆

مسلسل ہچکولے کھاتی بس جب ذرا ہموار سڑک پر آئی تو خشوع وخضوع سے آنکھیں بند کیے قرآنی آیات کا ورد کرتی فرناز نے بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اگلا ہی پل اسے شرمندگی کے اتھاہ سمندر میں ڈبو گیا۔ برابر والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی جو پچھلے چالیس منٹ سے اس کی ہم سفر تھی، اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''اونہہ! اتنی دیر سے تو اینچو بنی بیٹھی تھی۔ مجال ہے جو ایک منٹ کے لیے بھی لفٹ کروائی ہو۔ اب ذرا سی میری کمزوری ہاتھ لگ گئی تو محترمہ دل کھول کر مسکرا رہی ہیں۔'' اُس نے جل کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ دل تو اس کا یوں بھی بہت کڑھا ہوا تھا۔ رمیز بھائی کی عدم دستیابی، چھ ماہ پہلے کزن سے رشتہ جوڑنے کے بعد وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے لیے گوہر نایاب ہوتا جا رہا تھا۔ آج چوتھا دن تھا اسے یہ یاد دہانی کرواتے ہوئے کہ اریبہ کے گھر جانا ہے لیکن وہ آج بھی پچھلے تین دنوں کی طرح دستیاب نہیں تھا۔ دوسری طرف اریبہ تھی جو کسی طرح صحت یاب ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہر دفعہ فون کرنے پر یہی پتا چلتا۔ ''ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔ بخار ہے، کھانسی بڑھ گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔'' اریبہ سے اس کی دو مہینے اور چند دن پر محیط دوستی کی مدت تو یقیناً مختصر تھی لیکن گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ اس کی ایک ہفتے کی مسلسل غیر حاضری نے فرناز کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

اریبہ اُس کے لیے اس لیے بھی اہم تھی کیونکہ اس کے تار جیسے بالوں پر اریبہ کی جانب سے دیا گیا ایک شیمپو کمال دکھا گیا تھا۔ اریبہ نے شیمپو کا نام صیغۂ راز رکھا تھا۔ جس دن اس راز سے پردہ اٹھنا تھا اُس دن سے اریبہ بیگم غائب تھیں۔

راستے میں کئی بار اس نے دل ہی دل میں جہاں اپنی کزن کو اپنا بھائی لے اُڑنے پر کوسا تھا، وہیں اریبہ کے حوصلے کی بھی داد دی تھی جو روزانہ پچاس منٹ کا راستہ، اس بے ہودہ سواری میں طے کر کے انسٹی ٹیوٹ پہنچتی تھی اور اس پر ہشاش بشاش بھی یوں رہتی تھی جیسے اس کے گھر کی دیوار انسٹی ٹیوٹ کی دیوار سے ملی ہو۔

''او باجی! نور منزل کا اسٹاپ آ گیا، اترنا نہیں ہے کیا تم کو......'' کنڈیکٹر کی تیز آواز اسے خیالات کی دنیا سے کھینچ لائی۔ گود میں دھرے اپنے بیگ کو کاندھے پر لٹکاتی وہ سیٹ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ہم سفر لڑکی بھی شاید اسی اسٹاپ پر اترتی تھی کیونکہ اس کی کالی چادر کا پلو ابھی ابھی اس کی نظروں کے سامنے سے لہراتا بس کے کھلے دروازے سے غائب ہوا تھا۔

''شاوا، جلدی کرو باجی جلدی اُترو۔'' کنڈیکٹر کے جھنجلانے پر اس نے بوکھلا کر بس سے تقریباً چھلانگ ہی لگا دی تھی لیکن وہاں کی زمین اور خود اس کے پیروں میں موجود ہائی ہیل کی نازک سی سینڈل دونوں ہی اس کرتب کے لیے سخت ناموزوں

تھیں۔ وہ تو بھلا ہوا کہ چند قدم پر موجود اس کی بدتمیز ہم سفر نے لپک کر اسے تھام لیا' ورنہ یقیناً وہ سڑک پر ہی چاروں شانے چت گری ہوتی۔

''کیا ہو گیا ہے انعم! جلدی کرو' لگتا ہے بارش شروع ہونے والی ہے۔'' گمبھیر خوبصورت آواز پر اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو خود سے چند قدم کے فاصلے پر لڑکی سے ملتے جلتے نقوش والا ایک لڑکا بھی نظر آیا۔ وہ دونوں یقیناً بہن بھائی تھے۔ جتنی لڑکی کے اندر نزاکت دکھائی دیتی تھی اتنی ہی لڑکے کے اندر وجاہت موجود تھی۔

''آ رہی ہوں بھائی!'' لڑکی اپنے بھائی کی پکار کا جواب دیتے ہوئے اس کی طرف بڑھی یکدم اُسے ہوش آیا۔ ''ایکسکیوز می' کیا آپ اس ایڈریس کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟'' اپنے بیگ کی زپ کھول کر جلدی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا باہر کھینچا۔

یہ علاقہ اس کے لیے بالکل نیا تھا' چنانچہ کسی نہ کسی سے تو ایڈریس پوچھنا ہی تھا پھر بہتر تھا کہ اس بداخلاق لڑکی سے ہی پوچھ لیا ہوتا جس کے بارے میں اس کی رائے ابھی ابھی ہی کچھ بہتر ہوئی تھی۔

''ارے یہ تو میرے بڑے ابا کے گھر کا ایڈریس ہے' بالکل ہمارے برابر میں ہی رہتے ہیں۔ ایسا کریں آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں۔'' پہلی بار لڑکی نے ڈھنگ سے اس سے کوئی بات کی تھی۔

کسی بہتر گائیڈ کے مل جانے پر جہاں اس نے دل میں خوشی کی لہر دوڑتی محسوس کی' وہیں بے بسی سے اپنے دائیں پیر کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی نازک سی سینڈل اسے بیچ راستے میں داغ مفارقت دے چکی تھی۔ پیر پر دو تین جگہ خراشیں بھی آئی تھیں جن سے معمولی سا خون رس رہا تھا۔

لڑکی جسے انعم کہہ کر پکارا گیا تھا' اب خود بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں اس کی بے وفا سینڈل اور مجروح پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بھائی! میرے خیال میں یہاں سے رکشہ کر کے اندر چلتے ہیں۔''

''بھائی! جو دیکھنے میں بہن صاحبہ سے بھی کئی گنا سنجیدہ نظر آتے تھے' خاموشی سے ایک طرف کھڑے رکشے کی طرف بڑھ گئے۔

رکشہ پانچ منٹ بعد ہی ایک سبز رنگ کے دروازے کے سامنے جا رُکا۔

''انعم صاحبہ'' کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی رکشہ سے نیچے اتر آئی۔

''یہ رہا اریبہ باجی کا گھر' آپ اندر چلی جائیں۔ دائیں طرف پہلا کمرہ اُن ہی کا ہے۔'' اُسے رہنمائی کا شرف بخشنے کے بعد وہ چھپاک سے برابر والے گھر میں داخل ہوگئی۔

جائزہ لینے کو تو ابھی یہاں بہت زیادہ ورائٹی تھی' لیکن اب کی بار اس کی نظروں نے جس شے کو فوکس کیا وہ ''بھائی محترم'' کی آنکھیں تھیں جو بہت واضح طور پر اسے اندر جانے کا حکم دے رہی تھیں۔ ان آنکھوں کے حکم سے خائف ہو کر وہ جلدی سے اپنی ٹوٹی سینڈل کو گھسیٹتی بنا دستک دیے کھلے سبز دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

گلی کے مقابلے میں گھر کا ماحول بڑا پُرسکون تھا۔ صاف ستھرے صحن میں ایک طرف بنی کیاری میں موتیا' سدابہار اور لیموں کے پودے جھوم رہے تھے۔ دائیں طرف کی دیوار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دروازے تھے جو یقیناً کسی کمرے میں ہی کھلتے تھے۔ دوسرے دروازے سے تھوڑا آگے ایک گول زینہ بنا ہوا تھا جس کی گولائی کے ساتھ ساتھ منی پلانٹ کی خوبصورت بیل گھوم رہی تھی۔ بائیں جانب لائن سے بنے چار دروازے یقیناً کچن' اسٹور' غسل خانے اور ٹوائلٹ کے تھے۔ اس کے اندازے کی تصدیق باہر سے بھی ہوسکتی تھی کیونکہ ایک دروازے پر موٹا سا تالا پڑا تھا۔ دوسرے سے دھواں اور خوشبوئیں ایک ساتھ برآمد ہو رہی تھیں۔ تیسرے اور چوتھے دروازے کی درمیانی دیوار کے ساتھ واش بیسن موجود تھا جس کے اوپر ایک چمکتا' صاف شفاف آئینہ لگا تھا۔

''ارے فرناز! تم کب آئیں۔'' کچن کے دروازے سے نکلتی اریبہ نے صحن کے بیچوں بیچ کھڑی فرناز کو دیکھ کر پہلے حیرت سے ایک چیخ ماری اور

دوسرے ہی لمحے مسرت سے چمکتے چہرے کے ساتھ وہ اس کے گلے لگ گئی تھی۔
وہ اس کی بے ساختہ خوشی کو انجوائے کرتی' اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی جو پہلی نظر میں ہی بہت زیادہ کمزور اور مضمحل نظر آ رہی تھی۔
''چلو' اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ اسے ساتھ لیے ایک کمرے کی طرف بڑھنے لگی پھر یکدم ہی ٹھٹک کر رُک گئی۔
''تم آئی کس کے ساتھ ہو باہر کسی کو کھڑا تو نہیں کر رکھا؟''
اس کے سوال پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ نیچے جھک کر سینڈل کے اسٹریپ کھولنے لگی۔ اب مزید اس تکلیف کو سہنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔
''کیا بس سے آئی ہو؟'' اس کی حالت زار نے اریبہ پر جیسے کوئی انکشاف کیا تھا اور اب وہ آنکھیں پھاڑے نئے سرے سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔
ہمیشہ بے شکن لباس پہننے والی کے کپڑوں پر بے شمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ دوپٹہ کی جگہ استعمال کیا جانے والا اسکارف بمشکل گلے میں گرہ باندھ کر گرنے سے روکا گیا تھا۔ اسٹیپ کٹنگ میں سیٹ کیے گئے بال جو ہمیشہ تاروں والا جُوڑا بنے رہتے تھے۔ اس وقت اس کی پریشان حالی کا احوال چیخ چیخ کر سنا رہے تھے۔
''تم..... ایشاع یہ تم ہو؟'' حیرانی کے بعد اس پر ہنسی کا دورہ پڑا تھا اور وہ منہ بناتی فرناز کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے لے گئی تھی۔
اپنا حال دیکھ کر تو وہ بھی چند لمحوں کے لیے بھونچکا رہ گئی۔ ابتر حلیے والی یہ لڑکی فرناز ہی تھی' اُسے خود بھی یقین نہیں آیا لیکن اب آئینے کو تو جھٹلانے سے رہی' سو اپنی خفت مٹانے کے لیے اسی پر پل پڑی۔
''سارا کیا دھرا تمہارا ہے نہ تم اتنے دن اپنی شکل لے کر غائب ہوتیں' نہ مجھے اس ایڈونچر سے گزرنا پڑتا۔ یہاں گھر میں آرام سے مٹرگشت کرتی پھر رہی ہو اور انسٹی ٹیوٹ آنے کے لیے بیماری کے بہانے بنائے جا رہے ہیں۔''
''ارے بابا اتنا غصہ' لگتا ہے بہت ہی پریشان ہو کر آئی ہو۔'' اریبہ ہنسی۔
''پریشان تو ہونا ہی تھا' عادت جو نہیں ہے مجھے بسوں میں بیٹھنے کی۔ اوپر سے بارش نے سڑکوں کی حالت تباہ کر ڈالی ہے۔ قائد آباد کے پل کے بعد تو مانو ایسا لگ رہا تھا' ناردن ایریاز کے راستوں پر سفر کر رہے ہوں۔ جھٹکے جو لگ رہے تھے سو لگ رہے تھے بعض جگہ تو یوں لگتا تھا جیسے بس الٹ ہی جائے گی۔ یقین کرو میں نے تو جتنی دعائیں اور سورتیں یاد تھیں' سب پڑھ ڈالیں۔'' تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھی وہ ہاتھوں کی مدد سے اپنے پیروں کی انگلیاں دبا رہی تھی۔
''گاڑی کیا ہوئی تمہاری جو بس میں آئی ہو۔''
اس کی حالت زار پر ہنسی ضبط کرتی وہ بظاہر بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔
''گاڑی کو کیا ہونا ہے' کھڑی ہے گھر میں لیکن ماما کا تمہیں بتایا تھا نا میں نے...... لمبے روٹ پر اکیلے گاڑی لے جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ رمیز بھیا سے کہہ کہہ کر تھک گئی لیکن انہیں بھی آج کل اپنی نئی نویلی منگیتر سے فرصت نہیں ہے۔ مجبوراً بس سے آنا پڑا۔'' اپنی خوبصورت سی ناک کو ایک ادا سے چڑھاتی وہ تفصیل سنا رہی تھی۔
''تو بس سے آنے کی اجازت مل گئی تمہیں؟'' اب کے اریبہ کے لہجے میں حیرانی در آئی تھی۔
وہ ہنسنے لگی۔ ''بدھو! اجازت لے کر آیا ہی کون ہے۔ میں تو اس وقت انسٹی ٹیوٹ میں بیٹھی کلاس لے رہی ہوں۔ شام میں سات بجے تک لوٹ جاؤں گی۔ موسم اچھا تھا اس لیے گاڑی گھر چھوڑنے کا بہانہ مل گیا۔ اگر گاڑی میں آتی تو بالکل بھی تمہارے گھر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ بالکل ان نون راستہ ہے میرے لیے۔ اب بھی پورا راستہ کنڈیکٹر سے کہتی آئی ہوں کہ نور منزل کے اسٹاپ پر اُتار دینا۔''
یوں جھوٹ گھڑ کے اس کا اپنے گھر آنا اریبہ کو اچھا تو بالکل نہ لگا لیکن اس کے خلوص کو دیکھ کر چپ

ہو رہی۔

''اور ہاں اریبہ' تمہاری ایک سڑیل سی کزن بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ سچ! سخت بور کیا اس نے مجھے' پورے راستے گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی رہی' اتنی دفعہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھا لیکن مجال ہے جو اس نے ذرا سی بات کی ہو۔ اتنا ہے کہ اس کی وجہ سے تمہارا گھر ڈھونڈنے کے لیے پریشان نہیں ہونا پڑا مجھے۔ یہیں تمہارے پڑوس میں ہی تو رہتی ہے۔ کیا نام تھا اس کا۔'' کنپٹی کو انگلی کی مدد سے دباتی وہ نام یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اریبہ بول اٹھی۔

''انعم...... انعم نام ہے اس کا' لیکن وہ تو بہت با اخلاق لڑکی ہے' تم نے اسے سڑیل کیسے سمجھ لیا۔''

''اونہہ! جو لڑکی پورے پچاس منٹ کے راستے میں ایک بات تک نہ کرے' اسے سڑیل نہیں کہوں تو اور کیا کہوں۔''

اس کے منہ بنانے پر اریبہ ہنس دی پھر وضاحت کرنے لگی۔

''اصل میں فہد بہت ناراض ہوتا ہے بس میں خواتین کے ساتھ بات چیت کرنے اور گلی میں کھڑے ہونے پر' اس لیے انعم اس کی موجودگی میں بہت زیادہ احتیاط کرتی ہے۔ ابھی دیکھنا تھوڑی دیر میں خود ہی آ جائے گی تم سے ملنے' پھر تمہاری ساری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔''

''چلو دیکھیں گے۔'' لاپروائی سے کندھے اچکاتی وہ بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہوگئی۔

''ارے تم میری مزاج پرسی کرنے آئی ہو۔ خود بیڈ پر قبضہ کرلیا ہے اور میں بے چاری مریض کرسی پر بیٹھی ہوں۔'' اریبہ نے اسے پھیلتے دیکھ کر ٹوکا۔

''فی الحال تو میری حالت تم سے زیادہ خراب ہو رہی ہے اور یہ سوچ کر تو بالکل ہی بے حال ہو رہی ہوں کہ ان ہی مراحل سے گزر کر واپس بھی جانا ہے۔'' اب کے اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

اس سے پہلے کہ اریبہ اسے تسلی دیتی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

''اندر آجاؤ انعم!'' اس نے آواز لگائی دوسرے ہی لمحے وہ لوازمات سے بھری ٹرے اٹھائے شرمندہ شرمندہ سی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

فرناز نے دلچسپی سے اس کی جانب دیکھا۔ بڑی سی کالی چادر کی جگہ کاٹن کے میچنگ دوپٹے نے لے لی تھی۔ گلابی رنگ کا عکس اس کے چہرے پر پڑنے سے خوبصورتی اور دلکشی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔

''السلام علیکم!'' ٹرے ایک چھوٹی سی میز پر رکھنے کے ساتھ بڑے ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! بھئی تم تو بہت ہی کیوٹ ہو۔'' فرناز نے بے اختیار ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ اپنی تعریف سن کر ایک پل کے لیے تو وہ محجوب سی ہوئی پھر سنبھل کر وضاحت کرنے لگی۔

''وہ اصل میں بھائی کو پسند نہیں ہے اس لیے میں نے راستے میں آپ سے بات نہیں کی ورنہ جب آپ نے ایڈریس پوچھا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ آپ اریبہ اپیا کی دوست فرناز ہیں۔ سچ اریبہ اپیا سے آپ کی باتیں سن سن کر اتنا اشتیاق ہوگیا تھا' آپ سے ملنے کا کہ اگر بھائی کا ڈر نہیں ہوتا تو رکشے میں تو ضرور آپ سے بات کرتی۔''

''اور اریبہ اپیا! آپ سے تو میں سخت ناراض ہوں' آج ہی تو آپ کا بخار اترا ہے اور آپ نے کچن میں انٹری دے دی۔ انتظار نہیں کر سکتی تھیں تھوڑی دیر میرا' کون سا ابھی رات کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا جو آپ نے اتنی جلدی دکھائی۔'' وہ یقیناً کچن میں اس کی کارگزاری دیکھ کر آ رہی تھی اس لیے خفا خفا سی اس سے اُلجھ رہی تھی۔

''بھئی! اب مہمان کے سامنے تو ناراض مت ہو' ویسے بھی میں نے کوئی زیادہ کام نہیں کیا ہے' صرف سالن پکایا ہے اور آٹا گوندھا ہے۔ روٹیاں تم ہی کو پکانا ہوں گی۔ چلو' تم اب جلدی سے یہ لوازمات سرو کرو ورنہ سب کچھ ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' اریبہ نے پیار سے اسے بہلایا۔

''ویسے تم لوگ آ کہاں سے رہے تھے۔'' گرم گرم سموسے کو ہاتھ سے توڑ کر منہ میں رکھتی فرناز نے انعم کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''انعم کی خالہ بہت بیمار ہیں' انجائنا کا اٹیک ہوا ہے انہیں دو دن پہلے...... وہیں نیپا پر ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ یہ لوگ ان ہی کو دیکھنے گئے تھے۔ میری امی وہیں ہاسپٹل میں ان کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں۔ اِدھر میں بیمار ہوں تو بے چاری انعم پر بوجھ پڑ گیا ہے۔ یہاں کا بھی کرتی ہے' اپنے گھر کا بھی بلکہ ہاسپٹل میں امی اور اپنے خالو کے لیے کھانا بھجوانا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ جواب انعم کے بجائے اریبہ نے تفصیل سے دیا تھا۔

فرناز اتنی ساری پریشانیوں کا سن کر افسوس سے سر ہلانے لگی۔

مگر اب اُسے اصل بات کی طرف آنا تھا۔ سو فوراً بول اٹھی۔

''اب جلدی سے بتا دو کیا کروں اِن بالوں کا۔'' فرناز نے اپنے بے جان بالوں کو چھو کر پوچھا۔

''کرنا کیا ہے۔ تم اتنی دور آ گئیں میری محبت میں تو کیا میں تم کو ایسے ہی جانے دوں گی۔ ویٹ ڈیئر! میں ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر اریبہ ذرا باہر گئی اور ایک سادے کاغذ سے ریپر کیا ہوا شیمپو اٹھا لائی۔

''لو اب اپنا میجک خود ہی دیکھ لو۔'' اریبہ نے اُسے بوتل تھماتے ہوئے کہا۔ فرناز نے بوتل جھپٹی اور بے تابی سے ریپر اتارنے لگی۔

''یہ...... یہ تو لائف بوائے شیمپو ہے۔'' وہ فرطِ حیرت سے پلکیں جھپکنا بھول گئی۔

''جی ہاں! میڈم یہی ہے وہ شیمپو جس نے تمہارے بالوں پر جادو کر دیا تھا۔''

''میں یقین نہیں کر سکتی اریبہ کہ اتنا کم قیمت میں اتنا اعلیٰ شیمپو ہمارے پاس ہے اور ہم کتنے ناقدرے ہیں جو اصل اور نقل کی تمیز بھول بیٹھے ہیں۔ سچ ہے ہم واقعی بہت ناقدرے ہیں۔ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھتے ہیں۔''

''بس کرو فری! اب اسے استعمال کرو اور دیکھو اس کا کرشمہ۔''

باتوں باتوں میں شام ہوئی اور پھر نہ کرتے بھی اریبہ نے اُسے حلق تک ٹھنسا دیا اور پھر وہ گھر آ گئی۔

☆......☆......☆

وقت سرکا اُس کے بال جو بالکل بے رونق اور بے جان تھے نیو لائف بوائے شیمپو کے استعمال سے لازوال ہو گئے۔ اُس کے ہاتھ تو پارس آ گیا تھا۔ وہ ہر کسی کو اِس پارس کا پتا دیتی اور پھر فرناز کی شادی ہو گئی۔ اُس کی گوناگوں خوبیوں کے باوجود بھی اُس کے بال ہی حسنِ بے مثال کہلائے۔ آج بڑے دنوں بعد اُسے یاد آیا کہ نائلہ کے بالوں کے مسائل کا حل بھی صرف لائف بوائے شیمپو ہی تو تھا۔ وہ مسکرائی اور اُس نے یادوں کے البم کو سنہری بوسہ دے کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

''ہیلو گرلز!'' فرناز کلاس میں آتے ہی چہکی۔ ''آج میں نائلہ کے لیے ایک جادو لے کر آئی ہوں۔ نائلہ پلیز کم آن!'' اُس نے نائلہ کو بلایا اور نیا لائف بوائے شیمپو اُسے تھما دیا۔

''یہ لو تمہارے تمام بالوں کے مسائل کا حل...... ملک پروٹین اور بادام کی طاقت لیے نیا لائف بوائے شیمپو۔ اتنی ساری خوبیوں والا اور دام میں یہ ذرا سا۔'' اُس نے چٹکی بنا کر نائلہ کو تھام لیا۔

اب تمہیں کوئی بھی بالوں کو کٹوانے کا نہ کہے گا اور نہ ہی ان بالوں کو کٹنے دے گا۔

☆......☆......☆

(چند ماہ بعد)

''اور پھر نائلہ نے کیا استعمال نیا لائف بوائے شیمپو اور بن گئے اُس کے بال چیمپئن' اب وہ ہے ہر لڑکی کی آئیڈیل سہیلی' خوبصورت لمبے گھنے بالوں والی۔'' فرناز کلاس میں نائلہ کے لہراتے بالوں پر حظ اٹھا رہی تھی۔ ساری کلاس تالیاں بجا کر نائلہ اور اُس کے نئے لائف بوائے شیمپو کو داد دے رہی تھیں۔

سچ ہے...... بالوں کی خوبصورتی اور ہر مسئلے کا حل ہے ہماری اپنی جیب میں...... اور جیب میں فٹ ہے ہمارا نیا لائف بوائے شیمپو...... بادام کی طاقت اور دودھ کی پروٹین سے بنا' نیا لائف بوائے شیمپو......

☆......☆......☆

دامِ دل

قسط 25

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی، رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

راستے بھر تو چمن خاموش رہی تھی۔ عطیہ بیگم نے بھی اُسے مخاطب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کیونکہ وہ مسلسل اب آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

بانو آپا چلی گئی تھیں مصلحت کا باب بند ہوگیا تھا۔ جب مصلحتیں ختم ہوجاتی ہیں تو پھر آمنا سامنا ہوتا

ہے...... اور دوٹوک بات ہوتی ہے نفع نقصان سے بالاتر بات ہوتی ہے آگے دُھند چھائی ہوئی ہوتی ہے موجودہ لمحے میں سانس لیتے ہوئے...... موجودہ لمحے سے موجودہ لمحے میں موجود اذیت و تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں ہوتی۔

عطیہ بیگم نے ڈاکٹر علی عثمان کے گھر میں ہی محسوس کرلیا تھا کہ چمن کو ڈاکٹر علی کو حقیقت بتانا اچھا نہیں لگا یقیناً اُس کے دل میں ابھی غصہ بھرا ہوا ہے۔ وہ ضرور اُن سے بات کرے گی اس لیے انہوں نے جان بوجھ کر اُسے مخاطب کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ تاکہ آدھی سوئی آدھی جاگی بچیوں کی موجودگی میں کوئی ایسی بات نا ہو جو بات سے آگے بڑھ کر بحث کی شکل اختیار کرلے اس لیے یہ طے ہو گیا تھا کہ راستہ خاموشی سے ہی طے کیا جانا ہے۔

وہ بالکل ایسے محسوس کر رہی تھیں کہ چمن کی خاموشی میں قیامت کی گفتگو ہے۔ اس لیے گھر پہنچ کر وہ بچیوں کو گدھے گھوڑوں کی طرح ہنکاتی ہوئی اُن کے کمرے کی طرف چل پڑیں اور رُک کر چمن سے بات کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

چمن بھی شاید یہ ہی سوچ رہی تھی کہ کسی طرح سے رات کٹ جائے اور وہ صبح ماں سے بات کرے آخر غیر آدمی کے سامنے حقیقتیں بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

☆......☆......☆

گہری نیند سوئی ہوئی ٹینا کو ڈاکٹر علی ٹہلتے ٹہلتے دو تین مرتبہ آ کر دیکھ چکے تھے۔ صبح پانچ بجے کے اٹھے ہوئے تھے اور اِس وقت رات کا ایک بجنے والا تھا۔ مگر آنکھوں میں نیند کا نشان نہیں تھا۔ انہیں خود اپنی بے قراری کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ چند گھنٹے پہلے جو انکشاف ہوا تھا اُس کے بعد سے اُن کا ذہن مسلسل چمن کے گرد ہی گھوم رہا تھا۔

چمن جس کو پہلی نظر میں انہوں نے اجنبی محسوس نہیں کیا تھا۔ پہلے دن سے ہی کوئی ایسی بات تھی کہ چمن دن بھر مصروفیت کے دوران کسی بھی وقت چپکے سے اُن کے ذہن میں آ کر وقتی طور سے انہیں اپنے کام سے بے خبر کر دیا کرتی تھی اور ہر مرتبہ وہ یہ سوچ کر خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے تھے کہ چمن ایک خوبصورت باوقار اور محتاط عورت ضرور ہے لیکن وہ کسی کی امانت بھی ہے۔

وہ ایک شادی شدہ عورت ہے اور کسی شادی شدہ عورت کے بارے میں غور و فکر کرنا یا اُس کو سوچنا کسی بھی طرح سے مناسب نہیں اگر کوئی کُھل کر بولنے کا عادی ہو تو وہ سیدھے سیدھے یہی کہے گا کہ یہ ایک انتہائی اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے اور اس طرح کے خیال کے بعد وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب بھی ہوتے رہے تھے اور اپنے معمول کے کام بھی انجام دیتے رہے تھے۔ لیکن آج ابھی ابھی عطیہ بیگم نے اُن کے گھر میں کھڑے ہو کر جو انکشاف کیا تھا اُس کے بعد سے اُن کا ذہن چمن کی طرف سے ہٹ کر نہیں دے رہا تھا۔

اُن کی زندگی میں بے شمار لڑکیاں اور خواتین آتی جاتی رہیں تھیں اُن کی ہم پیشہ بھی تھیں اور روزانہ کے ملنے جلنے والوں میں بھی تھیں لیکن آج تک کسی لڑکی نے اُن کو اِس درجہ متاثر نہیں کیا تھا جو وہ اُس کے بارے میں غور و فکر کرتے۔

کاموں کے دوران اُس کو سوچتے کوئی تو ایسی بات تھی چمن میں جو آج تک اُن کو کسی عورت میں دکھائی نہیں دی تھی حتیٰ کہ اُس عورت میں تو بالکل بھی نہیں جو اُن کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔ جگہ خالی کر گئی تھی کسی اور عورت کے لیے اور اِس خالہ جگہ میں بار ہا چمن آ کر بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور وہ ہر مرتبہ سر جھٹک کر اُس کے خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے تھے۔

یہ رات تو گویا چمن کے نام ہوگئی تھی ذہن مسلسل اِسی نقطے کے گرد گھوم رہا تھا کہ اتنی نیک شریف محتاط پارسا بیوی کے ہوتے ہوئے ثمر کو آخر کس چیز کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

جو اُس نے اِس عورت کی قدر نہیں کی یہ سوچتے ہوئے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ رہے تھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیٹا آج اُن سے بری طرح روٹھی ہوئی ہے جیسے دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے والے روٹھ جایا کرتے ہیں۔

☆......☆......☆

دنوں کی بات نہیں ہفتوں کی تھکن تھی اُسے یاد نہیں گزرے ہوئے پندرہ بیس دنوں میں وہ کسی رات اِس طرح سویا ہو کہ اُس کی تھکن اتر گئی ہو جب بھی سویا تھوڑی دیر بعد ہی ہڑ بڑا کر جاگ اٹھتا تھا۔ ماں کی طرف چلا جاتا تھا جو ہاسپٹل میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی تھی۔

ساڑھے آٹھ نو بجے تک تمام کام والے جا چکے تھے اور گھر کی ایک ملازمہ کچن میں سمیٹا سمٹائی میں مصروف تھی۔

برتنوں کی کھڑ کھڑاہٹ اور ملازمہ کی چلت پھرت سے گھر میں لگتا تھا کہ گھر آباد ہے لیکن اُس نے جیسے ہی ملازمہ کو رخصت کیا خالی گھر کھانے کو دوڑنے لگا۔ یہاں سے وہاں تک سناٹے بسے ہوئے تھے سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ایک عجیب سی وحشت دل میں اترنے لگی۔ تھکاوٹ کا یہ عالم تھا کہ نا وہ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنے کے قابل تھا نا گزری ہوئی کوئی بات اُسے یاد آ سکتی تھی۔ ذہن بالکل منجمد ہو رہا تھا۔

صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا انگ انگ تھکن سے ٹوٹ رہا ہے۔ بیٹھتے ہی صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ بالکل اُسی طرح سے جیسے کہ کوئی بے خبر بے ہوش انسان...... کیونکہ ذہن بالکل بند ہو چکا تھا۔ کسی قسم کا کوئی خیال نا آ رہا تھا نہ جا رہا تھا۔ چند ثانیے اُس نے خالی خالی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھا اور گہری نیند میں ڈوب گیا۔

☆......☆......☆

''ارے بھئی یہ رونا دھونا بند کرو۔'' ارسلان اُسے بری طرح روتے ہوئے دیکھ کر جھنجلا گیا۔

''اتنا تو کوئی سگی ساس کے مرنے پر بھی نہیں روتا...... ایک تم سوتیلی ساس کے مرنے پر اتنا رو رہی ہو۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں گویا ہوا تھا۔

ندا نے آنسو بھری آنکھیں پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔

''سوتیلی ساس...... For Your Information وہ ثمر کی سگی امی تھیں تو میری سوتیلی ساس کیسے ہوگئیں۔ آپ تو امریکہ چلے جائیں آپ کو پاکستان کا کچھ نہیں پتا......'' ندا بری طرح سے اُلجھ پڑی۔

''بھئی میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ایسی سائیں کے مرنے پر رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے، جس سے تم کبھی ملیں نہیں جس نے تمہیں کبھی بہو نہیں مانا۔۔۔۔۔۔'' ارسلان اپنی دانست میں فلسفہ جھاڑ رہا تھا۔

''ہاں تو۔۔۔۔۔۔ میں کوئی اِس وجہ سے نہیں رو رہی، میں تو اِس وجہ سے رو رہی ہوں کہ میرے ساتھ بہت برا ہوا ہے اور آپ کی کالی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا پتہ چلا۔۔۔۔۔۔ وہ بالکل صحیح تھا۔'' ندا نے یہ کہہ کر پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ارسلان اب آنکھیں پھاڑ کر ندا کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا صحیح نکلا۔۔۔۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔''

''ہاں تو کیسے سمجھ آئے گی جب سے میں آئی ہوں یہاں بے ہوش پڑے ہوئے تھے اور پتہ نہیں عجیب سی بد بو سب جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ آپ کوئی نیند کی گولی کھا کر سوتے ہیں کیا۔۔۔۔۔۔ کتنا اٹھایا میں نے۔۔۔۔۔۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ بس آپ کو ساری حقیقت بتاؤں گی واقعی۔۔۔۔۔۔ میں بہت بے وقوف ہوں اور آپ بہت عقل مند ہیں۔۔۔۔۔۔ آپ کو اتنی دور بیٹھ کر سب پتہ چل گیا۔ میں دن رات اُن کے ساتھ تھی مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔۔۔۔۔۔''

ندا نے ایک سانس میں سب کچھ کہا اور نئے سرے سے رونے بیٹھ گئی۔

ارسلان پتھر کے بت کی طرح اُس کی طرف تک رہا تھا بہت کچھ سمجھ میں آنے کے باوجود جیسے اُسے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔ شاید وہ تفصیل اور وضاحت چاہتا تھا۔

''کیا مطلب ہے؟ ٹھیک سے بات کرو مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی تمہاری بات کی۔ خدا کے واسطے یہ رونا دھونا بند کرو اور کسی کے رونے دھونے سے اُس کی تقدیر نہیں بدل جاتی۔۔۔۔۔۔ تمہاری قسمت خراب تھی اس لیے تمہاری اتنے برے آدمی سے شادی ہوئی۔۔۔۔۔۔''

ارسلان بہت کچھ سمجھ کر اب بے بھاؤ کی سنانے لگا۔ اُس کے اپنے اندر ایک جوار بھاٹا اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ اِس وجہ سے نہیں کہ ندا کے ساتھ بہت برا ہوا اس وجہ سے کہ اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔۔۔۔۔۔ ندا تو اُس کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

''میرا خیال ہے تم وہاں اُس کی بیوی سے مل کر آ رہی ہو ورنہ تمہیں میری بات پر تو یقین ہی نہیں آتا تھا۔۔۔۔۔۔'' ارسلان کی بات سن کر ندا ہکا بکا اُس کی شکل دیکھنے لگی۔

''آپ کے قبضے میں کوئی جن ہے کیا۔۔۔۔۔۔ ہر بات صحیح بتا دیتے ہیں گھر میں بیٹھے بیٹھے۔۔۔۔۔۔ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں اُس کی بیوی سے مل کر آ رہی ہوں وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ ثمر سے تو میں ملی ہی نہیں اور کسی سے میں نے تعزیت بھی نہیں کی۔۔۔۔۔۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا کہ یہ چمن ہے میں ایک منٹ وہاں نہیں رُکی حالانکہ دل تو میرا چاہ رہا تھا کہ سب کے سامنے ثمر کو میں وہ سناؤں وہ سناؤں کہ زندگی بھر یاد رکھے۔ بس میت کا گھر تھا اس لیے چپ چاپ واپس آ گئی۔

اب ندا رونا دھونا بھول کر مارے طیش کے کف اڑا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس وقت ثمر اُس کے سامنے آ گیا تو وہ اُس کی گردن دبوچ لے گی۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور منہ سے جھاگ۔۔۔۔۔۔

ارسلان بہت غور سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ندا اس وقت بالکل ہتھے سے اکھڑ چکی ہے۔ ثمر کے لیے کوئی Margain نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ اس وقت اُس کا ہمدرد بن کر جو کچھ کہا جائے وہ

یقین کر لے گی۔ جو کچھ کرنے کے لیے کہا جائے مان لے گی۔ اس بے وقوف لڑکی کو اُس لالچی آدمی سے ورغلانے کا اِس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔

''جو ہوا سو ہوا اب نہ تمہارے شور مچانے سے کچھ ہو سکتا ہے اور نا رونے دھونے سے اگر تمہیں اُس شخص سے پیچھا چھڑانا ہے تو پھر کان کھول کر سن لو جیسے میں کہتا ہوں ویسے تمہیں کرنا پڑے گا۔''

''بتائیں مجھے میں کیا کروں...... میرا اپنا ذہن تو بالکل کام نہیں کر رہا......'' ندا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

''تمہارا ذہن کبھی بھی کام نہیں کرتا اگر تمہارا ذہن کام کرنے والا ہوتا تو تم اِس شخص کے ہتھے کیوں چڑھتیں...... بہر حال دو شادیاں تو میں بھی بھگتا چکا ہوں اس لیے شادی کو جواء کہتے ہیں یا تو ہارے یا جیتے میں دو دفعہ ہار گیا ایک دفعہ تم بھی ہار گئیں۔ فی الحال تو ہم دونوں ہارے ہوئے ہیں۔''

''آپ اپنی بات اس وقت رہنے دیں مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ ثمر کا سر پھاڑوں یا خود کو شوٹ کر لوں......'' ندا اب ہذیانی انداز میں چلا پڑی تھی کیونکہ یہ دھوکہ دہی اُس کی قوتِ برداشت سے بہت زیادہ تھی۔

وہ جو ایک عشق کا نشہ اُس کو ہر وقت سرشار رکھتا تھا وہ ایسے اڑنچھو ہو چکا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... اب تو صرف ایک بات یاد تھی کہ کسی نے اُس کو بہت اچھے طریقے سے بیوقوف بنایا ہے۔

''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں غور سے سنو...... اُس شخص کا اب امتحان شروع ہو گیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ سچا ہے یا واقعی اُس نے کسی لالچ میں تم سے شادی کی تھی۔

اب تقریر بند کریں بتائیں میں کیا کروں...... ندا کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اِسے اِس وقت میں مسئلے کا حل چاہیے تھا۔

اب جیسے ہی تمہاری اُس سے ملاقات ہو سب سے پہلے تو اُسے بتاؤ کہ تم اُس کی بیوی سے مل کر آئی ہو اور وہ تمہارے گھر میں موجود تھی اِس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اور اُس کا تعلق قائم ہے اگر اُسے تمہارے ساتھ رہنا ہے تو پہلی فرصت میں Divorse Papers لا کر تمہیں دے......

شوکرے کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے...... اگر وہ یہ بات نہیں مانتا تو تم اُس سے طلاق کا مطالبہ کر دو...... بس قصہ ختم......

اگر جو اُسے تم سے واقعی محبت ہے اور اُس نے تمہیں دھوکہ نہیں دیا وہ تمہاری بات ماننے میں بالکل دیر نہیں کرے گا اور اُس عورت کو طلاق دے دے گا اگر جو وہ ویسا ہی ہے جو میں اُسے سمجھ رہا ہوں تو وہ کبھی بھی اپنی بیوی پہلی کو طلاق نہیں دے گا۔''

''اگر انہوں نے مجھے بھی طلاق نہ دی تو پھر میں کیا کروں گی......'' ندا پھٹ پڑنے کے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''تو تم طلاق کے لیے اُس کی محتاج تو نہیں ہو...... ارے تم کورٹ میں چلی جاؤ اس کے تو باجے بج جائیں گے اگر اُس نے تم سے بغیر اجازت دوسری شادی کی ہے تو وہ تو ویسے ہی پھنس گیا ہے۔ تمہیں تو بہت آسانی سے خلع مل جائے گی۔ میرا خیال ہے With In A Week ایک ہفتے کے اندر اندر

تمہاری اُس سے جان چھوٹ جائے گی۔''
ندا بہت غور سے ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھی آخری الفاظ سن کر تو جیسے اس کے سر سے منوں ٹنوں بوجھ ہی اُتر گیا۔
''اتنا آسان ہے یہ سب کچھ تو پھر دیر کیوں بس میں کل ہی ثمر سے مل کر یہ سب باتیں کروں گی آپ بے فکر رہیں کل ہی آپ کو رپورٹ مل جائے گی کہ ثمر میرے ساتھ Sincere ہے یا دھوکہ دیا ہے میں کل کا دن ضائع نہیں کروں گی جو کچھ بھی ہونا ہے اب کل ہی ہوگا۔ پہلے تو میں آپ سے چڑ رہی تھی لیکن اب ایسے لگ رہا ہے جیسے اللہ میاں نے آپ کو فرشتہ بنا کر اِس گھر میں بھیجا ہے اور آپ نہ آتے تو مجھے ابھی تک عقل نہ آتی میں اُسی طرح بیوقوف بن رہی ہوتی۔'' ندا نے پُرسکون ہوتے ہی ارسلان کی طبیعت بھی خوش کر دی۔
ارسلان نے اپنے چہرے سے تو کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا مگر دل ہی دل میں کچھ اچھا سا محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

دبے ہوئے بازو میں درد کی شدید لہریں اٹھنے کے باعث اُس کی نیند خود بخود ٹوٹ گئی تھی۔ لاؤنج میں بھاری پردے پڑے ہوئے تھے مگر سورج کی روشنی پردوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اچھا خاصہ دن چڑھ چکا ہے اور سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے اُس نے بمشکل کروٹ بدلی اور اپنا بازو دبانے لگا وہ بائیں کروٹ سے لیٹا تھا اور بائیں کروٹ سے ہی اٹھا۔
گھنٹوں بازو اس کے پورے وزن تلے دبا رہا اور اسی وجہ سے درد کی لہریں اٹھنا شروع ہوگئی تھیں۔ شاید اگر بازو میں اتنا شدید درد نہ ہوتا تو ابھی بھی اُس کی آنکھ نہ کھلتی کیونکہ آنکھ کھلنے کے بعد بھی اور درد محسوس ہونے کے بعد بھی اُس کی آنکھیں ٹھیک سے کھل نہیں رہی تھیں۔
اُسی طرح سے لیٹے لیٹے اپنا دکھتا ہوا بازو زور زور سے دبانے لگا۔ آہستہ آہستہ نیند کی تنی ہوئی چادر سرکنا شروع ہوئی تو توجہ کھڑکیوں پر پڑنے والی سورج کی روشنی کی طرف گئی تو سوچا اس وقت کیا ٹائم ہوگیا ہوگا۔
ساتھ ہی افشاں کا خیال آیا تو اُسے یاد آیا کہ افشاں بار بار بیہوش ہو رہی تھی تو اُس کا شوہر اُسے ہاسپٹل لے گیا تھا اور جاتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ اگر افشاں کی حالت سنبھل گئی تو وہ اُسے ہاسپٹل سے گھر لے کر چلا جائے گا تاکہ وہ ریسٹ کر لے اُس نے بھی افشاں کی حالت کے پیش نظر بخوشی اُس کے شوہر کو اجازت دی۔ یہاں اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ گویا سارے کام تو ختم ہو چکے ہیں وہ افشاں کو سنبھالے اس لیے کہ اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اسکول جاتے ہیں...... افشاں کی ماں تو چلی گئی مگر اِس کے بچوں کو تو ماں کی ضرورت ہے۔
افشاں تو مہمانوں کی موجودگی ہی جا چکی تھی مہمان تو اُس کے جانے کے بعد آہستہ آہستہ جانا شروع ہوئے تھے۔ کچھ قریبی رشتے دار تھے جو اپنی دانست میں ثمر کی دلجوئی کرنے کے لیے اُس کے پاس خاصی دیر بیٹھے رہے تھے۔ افشاں سے ذہن ہٹا تو ندا کی طرف چلا گیا۔

ندا کا خیال آیا تو فوراً ہی ذہن اپنے سیل فون کی طرف گیا یقیناً اُس نے کال تو کی ہوگی ایک نہیں نہ جانے کتنی...... بس اِس سوچ نے اُس کے پورے وجود میں توانائی سی بھر دی اُسے اندازہ تھا کہ ندا کو ہینڈل کرنا کتنا مشکل ہوگا لیکن بہر حال بے وقوف سی لڑکی ہے تھوڑی سی محنت کرنا پڑے گی لائن پر آ جائے گی۔'' اس نے گویا خود کو تسلی دی تھی۔

اور اِدھر اُدھر اپنا سیل فون ڈھونڈا جو اُسے کہیں نظر نہیں آیا تو پھر ذہن پر زور ڈالا کہ سیل فون کہاں ہوسکتا ہے تو یہی خیال آیا کہ اُس کے بیڈروم میں ہوگا کیونکہ آخری بار اُس نے اپنے بیڈروم میں ہی کوئی..... تعزیتی فون وصول کیا تھا۔ نیند ذہن سے ہٹ چکی تھی۔ یادداشت پوری طرح کام کرنے لگی تھی وہ تیز تیز چلتا ہوا اپنے بیڈروم میں آیا۔ سیل فون اُس کے بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔

اُس نے بڑی سرعت سے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا اور جیسے پورے یقین کے ساتھ سیل فون کے آپشن میں گیا تاکہ مسڈ کال دیکھ کر پتہ چلے کہ ندا نے اُسے کتنی کالز کی تھیں۔ مگر یہ دیکھ کر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ندا کی تو ایک بھی مس کال نہیں تھی اُس نے جلدی سے میسج چیک کیے کہ اگر اُس نے کال نہیں کی تھی تو میسج کیے ہوں گے لیکن Inbox میں بھی ندا کا کوئی میسج نہیں تھا اب تو گویا حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ فون آف بھی نہیں تھا اور ندا کی کوئی کال بھی نہیں......

اُس نے جلدی سے ندا کا نمبر ڈائل کیا سیل فون کو کان سے لگایا اب تمام تر حیرت پریشانی میں بدل چکی تھی کیونکہ ندا کا نمبر پاورڈ آف مل رہا تھا۔ نہ اُس نے کوئی خود کال کی نہ میسج دیا اور فون بھی Off کیا ہوا ہے آخر مسئلہ کیا ہے؟

حیرت سے پریشانی اور پریشانی سے تشویش کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ وہ گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا چند لمحے بالکل خالی الذہن رہا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیا ہوا؟ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ اتنے گھنٹے گزرنے کے بعد ندا کو اُس کا خیال ہی نہ آیا ہو۔ یہ تو ایسا ہی ناممکن امر تھا جیسا کہ سورج کا مشرق کی بجائے مغرب سے نکلنا......

تشویش اپنی انتہا کو چھونے لگی تو سوچا کہ اُسے فوراً ندا کے پاس پہنچنا چاہیے کیونکہ ارسلان کا فون نمبر تو اُس نے لینے کی کبھی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ اُس شخص کی تو شکل دیکھتے ہی جذبات میں عجیب طوفان برپا ہو جاتا تھا جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا......

بس اتنی بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ شخص اُس کے لیے ہرگز بھی قابل قبول نہیں ہے۔ جس شخص کو اُس کا ذہن اور دل قبول کرنے کے لیے آج تک تیار نہیں ہوا تھا اُسے اُس کے فون نمبر سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

گھر بکھرا پڑا تھا اس کے گھر میں بانو آپا نے کوئی مرد نوکر رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی دو تین نوکرانیاں جو جز وقتی نوکرانیاں تھیں صبح آتی تھیں اور شام سے پہلے پہلے چلی جاتی تھیں۔ باقی کام جب چمن تھی تو وہ دیکھا کرتی تھی اُس کے بعد بانو آپا آنے والی نوکرانیوں کے ساتھ مل کر ہی ایک Set Up بنا لیا تھا اُس کو وہ اپنے حساب سے لے کر چل رہی تھیں ثمر کو گھر میں کھانا و چائے مل جاتی تھی کپڑے تیار ملتے تھے اُسے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ اُسے کوئی کل وقتی ملازمہ بھی رکھنا چاہیے۔

شاید اُسے ایک مرتبہ بانو آپا سے بات تو کی تھی لیکن بانو آپا کا کہنا تھا محلے میں دو تین گھروں میں

نوکروں کی وجہ سے چوری ہوگئی ہے میرا دل نہیں مانتا۔
اب اتنا پھیلا ہوا دیکھ کر اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ سمٹے گا کیسے.....نوکرانیاں کس ٹائم آتی ہیں اُسے کچھ پتہ نہیں تھا اگر وہ ندا سے ملنے جاتا ہے تو یہ پھیلاوا اسی طرح پھیلا رہے گا۔ نوکرانیاں آئیں گی بھی تو انہیں گھر بند ملے گا۔ وہ ایک شش و پنج میں پڑ چکا تھا پھر دل میں ایک امید سی جاگی کہ شاید اُسے سونے کی وجہ سے پاور آف کیا ہوا ہو......
ہوسکتا ہے اب جاگ گئی ہو اور فون آن کر لیا ہو۔ اُس نے اچھے امکان کے ساتھ دوبارہ ندا کو ٹرائی کیا لیکن فوراً ہی چہرے پر گہری مایوسی کے تاثرات نقش ہوگئے۔ فون ابھی پاور آف تھا اب تو جانا ہی پڑے گا اس نے دل ہی دل میں سوچا۔
دل میں ایک نامعلوم اور نامانوس سی کھٹک ہو رہی تھی۔ اس کا حسب نسب تو قوم جنات سے ملتا محسوس ہوتا ہے کہ جس بات کے پیچھے پڑ جائیں تو ہاتھ دھو کر پڑ جائیں۔ اسے تو انتہائی بے قراری سے رابطہ بحال ہونے کا منتظر ہونا چاہیے تھا۔ فون آف کر کے تسلی سے بیٹھ گئی۔ فکر حیرت میں ڈھل رہی تھی۔ جبکہ تسلی نام کی کوئی شے اسے چھو کر نہیں گزرتی۔ ایک ادھیڑ بن لاحق ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

''بس اب اُس گھر کو بھی بھول جاؤ اور گھر والوں کی باتوں کو بھی......اپنا ذہن ہٹا لو اُدھر سے......ڈاکٹر علی عثمان کی بات کو چھوڑو اب تو دنیا کو پتہ چل جائے گا اور چلنا چاہیے کہ تمہارا اُس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بانو آپا کی وجہ سے جو ایک رکھ رکھاؤ چل رہا تھا اور مصلحتاً تمہیں اُن سے ملنے اور وہاں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ اب سارے معاملات اُن کی مرضی سے چلیں گے۔
مطلب پڑا تو بہن کو لینے بھیج دیا۔ میری قسم کھا کر بتاؤ تم اتنے دن اسپتال گئیں اور اُس کی ماں کے ساتھ وقت گزارا......اُس پر کوئی اثر ہوا اُس نے تم سے کوئی بات کی تھی کیونکہ اگر وہ تم سے کوئی بات کرتا تو تم مجھے ضرور بتاتیں یا میں خود تمہارے چہرے سے اندازہ لگا لیتی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا......میں تمہارا چہرہ پڑھ رہی تھی جس پر سوائے دکھ کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں صرف اُس مرنے والی کے لیے یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی اللہ بخشے اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اپنے اعمال کے ساتھ اس دنیا سے چلی گئیں۔ جانے والوں کے ساتھ کوئی گلہ شکوہ نہیں لیکن جو زندہ ہیں اُن کے لیے اب میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں......
ہم اتنے پاگل اور بے وقوف نہیں ہیں کہ وہ ہمیں اپنی اُنگلی کے اشاروں پر چلائے جب تک کوئی امید اور امکان تھا تو ہم نے بھی بہت کچھ برداشت کر لیا۔''
چمن نے جیسے ہی عطیہ بیگم سے گلہ کیا کہ انہوں نے......''ڈاکٹر علی عثمان کے سامنے گھر کے اندر کی بات کیوں کی؟ اُن کا ہمارے معاملات سے کیا لینا دینا......اُن کو یہ حقیقتیں بتانے سے ہمیں فرق کیا پڑتا ہے۔''بس چمن کے منہ سے اتنا نکلا تھا اور عطیہ بیگم شروع ہوگئی تھیں۔ ایک سانس میں انہوں نے پورا پیراگراف بلکہ پورا مضمون پڑھ کر رکھ دیا۔
چمن ماں کی شدید جذباتیت دیکھ کر وقتی طور پر تو خاموش ہوگئی لیکن اُس کے دل میں یہ بات تھی کہ ماں

نے ڈاکٹر علی عثمان کے سامنے اُس کا بھرم توڑ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ بنا کچھ کہے ماں کے پاس سے اُٹھ کر جانے لگی تو عطیہ بیگم نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو تھام لیا۔

چمن نے نظریں اُٹھا کر ماں کی طرف دیکھا اور نظریں دوبارہ جھکالیں۔

''تمہیں اِس وقت میری بات بری لگی ہے بیٹا لیکن کوئی حد ہوتی ہے میں ماں ہوں مجھے تمہارا سکھ دیکھنے کی بہت جلدی ہے میں تمہاری زیادہ دن کی اُداسی برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میری بے گناہ بچی کے ساتھ جو کچھ ہوا مجھے نہ صبر آسکتا ہے نہ چین......

میں تمہاری خوشیوں کے لیے جو کچھ کر سکتی ہوں وہ کروں گی...... اس لیے کہ میں ماں ہوں تم میرے سامنے آنسو نہیں بہاؤ گی مجھے پتہ ہے تم بہت باہمت ہو لیکن اِس بات کی گارنٹی ہے کہ تم اکیلے میں بھی نہیں روؤ گی......

کیوں کیا تم انسان نہیں ہو...... جنہوں نے تمہیں تکلیف دی ہے اُس تکلیف نے تم پر کوئی اثر نہیں چھوڑا...... ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' یہ کہہ کر عطیہ بیگم نے چمن کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

''بیٹا ماں کی کسی بات کا برا نہیں مانتے اس لیے کہ ماں تو ہر وقت اپنے بچوں کے سکھ کے لیے دوڑتی پھرتی ہے۔''

''میری ایک بیٹی دنیا سے روتی سسکتی چلی گئی اور جو بیٹی نگاہوں کے سامنے ہے کم از کم اُس کی آنکھوں میں تو آنسو نہ دیکھوں...... آج میں تمہیں دل کی بات کہتی ہوں تم اِس پر ضرور غور کرنا...... میں تمہیں ایمن کی بچیوں کی ماں بنا کر اس گھر میں نہیں بٹھاؤں گی۔ اس لیے کہ قربانی دینے کے لیے میں جو موجود ہوں...... بس اب تمہیں ثمر سے خلع لینا ہوگی۔ وہ تو تمہیں کب کی طلاق دے دیتا لیکن صرف تنگ کرنے کے لیے تمہیں باندھا ہوا ہے اُسے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے...... مجھے تمہاری دوسری شادی کرنا ہے تم سمجھ رہی ہو کہ اب تمہاری زندگی میں صرف یہی رہ گیا ہے کہ تم ہماری خدمتیں کرو مرحومہ بہن کے بچے سنبھالو......''

''تو امی یہ تو بہت اچھی بات ہے...... اس میں برائی کیا ہے......'' چمن نے جلدی سے اپنی بات کی، گویا عطیہ بیگم کو آگے بولنے سے روک دیا۔

''تمہیں نیکیاں کمانے کی جتنی فکر ہے...... اس سے زیادہ ہمیں اپنے فرائض ادا کرنے کی فکر ہے......'' عطیہ بیگم یہ کہہ کر رُکی نہیں ایک طرف چل پڑیں۔ چمن بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ثمر لشتم پشتم تیار ہو کر بیڈ روم سے تیار ہو کر باہر آیا تھا اس وقت اُس پر سخت عجلت سوار تھی۔ وہ پہلی فرصت میں ندا کے گھر پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ ندا کی طرف سے کسی قسم کا رابطہ نہ ہونا تھوڑی بہت نہیں انتہائی درجے کی تشویشناک بات تھی۔

تیز تیز چلتا ہوا جیسے ہی کار پورچ میں پہنچا کسی نے Call Bell رنگ کی تھی Call Bell کی آواز جیسے ہی گھر میں گونجی وہ یہی سمجھا کہ کوئی کام کرنے والی ماسی آگئی ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا...... تو گویا 440 والٹ کا کرنٹ اُسے لگا تھا۔

سامنے ندا بڑے کڑے تیور کے ساتھ اُسے گھور رہی تھی وہ لاشعوری طور پر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ندا درآنا اندر داخل ہوئی تھی اور ایک سرسری نظر چاروں طرف دوڑاتے ہوئے دھاڑ کی آواز سے کھلا ہوا گیٹ بند کیا تھا۔
ثمر دم بخود سا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ندا پہلی بار بڑی جرأت بے باکی اور بے خوفی سے اُس کی آنکھوں میں گھور رہی تھی۔ انداز ایسا تھا کہ جیسے فوراً ہی پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک پسٹل نکالے گی اور ثمر کی کنپٹی پر رکھ دے گی۔
''تم یہاں......!'' ثمر کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔
''بڑی حیرت ہو رہی ہے آپ کو مجھے یہاں دیکھ کر...... میں نہیں آ سکتی...... یہ میرے شوہر کا گھر نہیں ہے۔'' ندا بولتی ہوئی اُس کے قریب آ گئی اتنی قریب کے درمیان میں جیسے چند انگلیوں کا فاصلہ تھا۔ وہ براہِ راست ثمر کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اُس کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ دل میں کسی قسم کی محبت اور مروت کے جذبات کی گنجائش نہیں ہے۔ Do And Die والی کیفیت تھی یوں جیسے کہ وہ ساری کشتیاں جلا کر اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔
''مسئلہ کیا ہے...... ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ تمہیں بتایا نہیں تھا کہ امی کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ کل سارا دن اور رات بس......''
''میں اسی لیے آ گئی تاکہ آپ میرے پاس نہ آئیں مزید بے وقوف بنانے کے لیے...... کیا کر رہی ہیں آپ کی بیگم صاحبہ!'' ندا نے اِدھر اُدھر دیکھا اور تیز تیز چلتی ہوئی لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ ثمر اُس کی بات سن کر اتنا حیران ہوا...... کل تو بس ایک منٹ کی آپ سے ملاقات ہوئی کوئی بات ہی نہیں ہو سکی سامنے آئیں تو کچھ بات چیت ہو۔''
''کس سے بات کر رہی ہو کس کو بلا رہی ہو۔'' ثمر ہکا بکا ندا کی شکل دیکھنے لگا۔
''زیادہ ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں آپ کی بیگم کو بلا رہی ہوں۔ بلایئے اُن کو کہیں ایسا تو نہیں مجھے دیکھ کر کہیں چھپ کر بیٹھ گئی ہوں۔ لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ مجھے پہچان لیں گی کیونکہ میری اُن سے کل ہی ملاقات ہوئی ہے۔''
''اوہ......'' ثمر کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا اُس نے بڑی تشویش سے ندا کی طرف دیکھا تھا۔
''تم کل آئیں تھیں۔'' وہ ندا کو سر سے پاؤں تک تول رہا تھا۔ ندا کندھے پر شولڈر بیگ لٹکائے کھڑی تھی۔ ثمر کی بات سن کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر پکڑ لی اور تن کر کھڑی ہو گئی۔
''جناب...... کیوں میرے اِس گھر میں آنے پر پابندی ہے کیا؟ جن کی وجہ سے ڈر رہے تھے وہ تو ہمیشہ کے لیے سو چکی تھیں پھر مجھے کس کی پرواہ تھی آپ کو خود مجھے بلانا چاہیے تھا۔ آنے والوں سے میرا تعارف کرانا چاہیے تھا میں آپ کی بیوی ہوں......'' ندا بول رہی تھی اور ثمر پتھر کا بت بنا اُسے دیکھ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ندا کو بہت اچھی طرح سبق سکھایا ہے اور اُس نے یاد کیا ہوا سبق فرفر سنانا شروع کر دیا ہے کیونکہ یہ الفاظ اور انداز ندا کے تو ہرگز نہ تھے۔ ایک رات میں اتنی تبدیلی کسی انسان میں نہیں آ سکتی۔

ثمر کے ذہن پر تحیر کا اتنا غلبہ تھا کہ اُس کا ذہن فوراً ارسلان کی طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بس آنکھیں پھاڑے ندا کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لیے یہ قیامت کیا کم تھی کہ وہ باقاعدہ کل چمن سے مل کر گئی ہے۔ اُس کو اب سب کچھ سمجھ آ گیا کہ اُس نے اُسے کیوں فون نہیں کیا کوئی میسیج کیوں نہیں کیا...... اُسے فون کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اس لیے کہ گھر اُس نے دیکھ لیا تھا چمن سے مل کر جا چکی تھی اور اپنے حساب سے وہ بہت کچھ سوچ کر فیصلہ کرنے کے بعد گھر میں داخل ہوئی تھی۔

''شیم شیم اتنی Decent Personality اتنا سمجھدار عقلمند بندہ اور حرکتیں دیکھو...... میں بھی سوچا کرتی تھی اتنا Hifi Status رکھنے والا بندہ...... اُسے مجھ میں کیا نظر آیا ہے۔ نانا جان بھی مجھے بے وقوف کہتے تھے...... نرگس آنٹی بھی کہتی ہیں تم میں عقل نہیں ہے۔''

''اتنا ہائی کوالیفائیڈ Well Dressed بندہ مجھ میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ اب پتہ چلا نانا جان اور نرگس آنٹی کی طرح اُسے بھی یقین تھا کہ شاید دنیا میں مجھ سے زیادہ بے وقوف لڑکی ہے ہی نہیں۔'' ندا پھر ایک تواتر سے شروع ہو گئی۔

''Stop......'' ثمر کی زوردار آواز ماحول میں گونجی تھی۔ یہ آواز نہیں تقریباً ایک دھاڑ تھی ندا ایک لمحے کے لیے تو سہم کر ٹھٹک سی گئی تھی۔ کیونکہ اِس سے پہلے اُس نے ثمر کی دھاڑ نہیں سنی تھی۔

''بس بول چکیں؟ جو کچھ زہر بھر کر لائی تھیں اپنے اندر سب نکال دیا یا کچھ باقی ہے؟'' ثمر اب اُس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

''ہاں! آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے آپ تو مرد ہیں آپ صبح سے رات تک دس لڑکیوں کو بے وقوف بنائیں آپ کا کیا بگڑ سکتا ہے۔''

''میں کہہ رہا ہوں خاموش ہو جاؤ۔'' اب ایک لفظ منہ سے مت نکالنا......

''پہلے تو ایک کام کرو وہ یہ کہ نیچے سے لے کر اوپر تک ایک ایک کمرے میں چیک کر کے آؤ کہ کہیں چمن تو چھپی نہیں بیٹھی ہے اگر وہ تمہیں کہیں نظر آ جائے تو اُس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس لاؤ میں تم دونوں کے سامنے کچھ...... اب جو کچھ کہنا ہو گا وہ تم دونوں کو سامنے بٹھا کر کہوں گا...... چلو شاباش...... پورا گھر چیک کر و جا کر...... اب تم نے ایک لفظ مزید منہ سے نکالا تو اچھا نہیں ہو گا۔

ثمر کا انداز انتہائی حقیر اور خوفناک تھا۔ یوں کہ واقعی اگر ندا کچھ بولی تو وہ کچھ ایسی حرکت کر بیٹھے گا جو اُسے نہیں کرنا چاہیے۔ صاف لگ رہا تھا کہ ثمر اس وقت Full Form میں آ گیا ہے اور ندا پر ہاتھ بھی اٹھا سکتا ہے۔

''مجھے کیا پڑی ہے کہ میں پورے گھر میں اُن کو ڈھونڈتی پھروں اگر وہ گھر میں ہے تو آپ آواز دے کر انہیں بلائیں۔''

''بے وقوف لڑکی وہ گھر میں نہیں ہے۔ وہ گھر میں چھپی ہوتی تو میں گھر میں اُسے تلاش کرنے کے لیے کیوں کہتا۔ وہ گھر میں نہیں ہے...... تو پھر کہاں ہے؟ میں خود کل اُن سے مل کر گئی ہوں انہوں نے بتایا کہ میں چمن ہوں...... مسز ثمر کہہ رہی تھیں خود کو......''

''ہاں اُسے کیا پتہ تم کون ہو...... وہ کسی اجنبی لڑکی سے یا کسی سے بھی ملے گی تو اپنا تعارف یہی کہہ کر

کرائے گی۔ اور کیا کہے گی...... میں نے تم سے چھپایا تو نہیں تھا۔ تمہیں پتہ ہے میں نے اُسے طلاق نہیں دی۔''

''کیوں نہیں دی؟'' ندا اب شولڈر بیگ کندھے سے اُتار کر صوفے پر پھینکتے ہوئے دوبارہ سے غرائی۔ ثمر نے ایک بے بسی کے عالم میں اُس کی طرف دیکھا تھا۔

''بتائیں ناں...... آج تو آپ کو میرے اس سوال کا جواب دینا ہی پڑے گا۔'' ندا اب اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔

یوں بھی یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے جو اپنے دماغ کو زیادہ استعمال نہیں کرتے۔ احمقانہ حد تک نڈر پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اب وہ بہت کڑے تیور اور بے خوفی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''ثمر کے لیے اس کا یہ انداز بالکل نیا اور خلافِ معمول تھا...... کہ بدلحاظی اپنے نکتۂ کمال پر تھی۔

ثمر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

شیر کی طرح دھاڑ کر بھی دیکھ لیا...... رسانیت سے سمجھانے کی کوشش بھی کر لی۔ مگر ندا کی کیفیت میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔

ندا ہنوز اس کی طرف گھور رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر پکڑی ہوئی تھی۔ یوں جیسے کسی بھی وقت گردن دبوچ لے گی۔

اس طرح خاموش بیٹھنے سے بات نہیں بنے گی۔ اتنی معصوم شکل بنانے کی ضرورت نہیں......'' وہ ثمر کی خاموشی سے تلملا اٹھی۔

ثمر نے پھر پلکیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ مگر اُدھر نگاہ میں وہ آنچ تھی کہ اعصاب پگھلنے لگے...... بڑی آہستگی سے گویا ہوا۔

''اسے طلاق دوں یا نہ دوں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''مجھے پڑتا ہے......'' ندا نے غصے سے پھنکارتے ہوئے ثمر کی آنکھوں میں گھورا۔

''اس لیے کہ مجھے آپ پر اعتبار نہیں رہا...... میں آپ کی کسی بات کا یقین نہیں کر سکتی جبکہ اپنی آنکھوں سے انہیں اس گھر میں دیکھ چکی ہوں۔''

وہ بڑے نڈر و بے خوف انداز میں بول رہی تھی۔

''ہاں تو کہہ رہا ہوں ناں...... گھر میں اسے تلاش کرو اور پکڑ کر میرے سامنے لے آؤ۔'' ثمر ہذیانی انداز میں چلایا۔ ایک بار پھر اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''اونچا بول کر مت ڈرائیں...... مجھے نہیں پتہ کیا ڈرامہ چل رہا ہے۔ وہ کب یہاں ہوتی ہیں کب یہاں سے چلی جاتی ہیں...... جس مرد کو دوسری شادی کرنے کا بھوت سوار ہو جاتا ہے وہ اپنی پہلی بیوی کی برائیاں کر کے ہی کسی لڑکی کو بے وقوف بناتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ بس ایک بار شادی ہونے دو...... پھر پہلی بیوی کو بھی راضی کر لیں گے۔''

شاید ارسلان کے دیے ہوئے Doses تھے۔ فراٹے سے بول رہی تھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔

غصے کی شدت سے ثمر کے حواس معطل ہونے لگے۔
''مجھے اس عورت کی شکل سے بھی نفرت ہے......اور تم......''
''بس کریں......کل آپ نے صبح سے رات تک اسی کی شکل دیکھی ہے۔'' ندا اب اپنا بیگ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔
''منہ بند کرو......اب تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو......'' ثمر بولتے بولتے رُک گیا اور گہری گہری سانس لینے لگا۔
''تو کیا مجھے طلاق دے دیں گے......ٹھیک ہے تو پھر دے دیں......مجھے بھی کسی دھوکے باز کے ساتھ زندگی گزارنے کا شوق نہیں۔''
شدت غضب سے ثمر نے ندا کو طمانچہ جڑنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ مگر ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ یونہی کوئی خیال آ گیا۔ غصے کا زور ٹوٹ گیا۔
''ندا......خدا کے لیے اپنی اور میری زندگی برباد نہ کرو۔ شک ایک آگ ہے جس میں عمر بھر کی ریاضتیں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔''
''شک سنی سنائی بات پر ہوسکتا ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ خود بات کی ہے......''
ثمر کا جارحانہ انداز پھر ایک دم کمزور آواز......ندا نے قدرے فکرمندی اور متردد انداز میں اُس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔
''تم نے جو کچھ دیکھا ٹھیک دیکھا۔ مگر وہ کل رات اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے۔''
''مجھے آپ کی کسی بات کا اعتبار نہیں۔''
''جب طلاق کے پیپرز دیکھوں گی اس کے بعد ہی آپ سے بات ہوگی۔ اگر آپ میرے ساتھ سچے ہیں تو کل ہی طلاق کے پیپرز تیار کرائیں۔ اگر آپ اسے طلاق نہیں دیں گے تو پھر میں خلع لوں گی۔'' یہ کہہ کر ندا رُکی نہیں تقریباً پاؤں پٹختی باہر چلی گئی۔ ثمر آنکھیں پھاڑے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

روح کی تمام تر آمادگیوں کے ساتھ کسی کو اپنانے والی عورت کے لیے......ہمسفر کی تبدیلی کا خیال کوئی ہلکی معمولی بات نہیں ہوتی۔
مدتوں ایک چہرہ نظروں میں سمائے رہنے کے بعد دوسرے چہرے کو تصور میں سجانا ایک وفا پیشہ ایثار صفت، سراپا خلوص، محبت سے معمور دل رکھنے والی عورت کے لیے یہ کندھوں پر کوہ گراں اُٹھا کر دوڑنے کی کوشش کے مصداق ہے
ماں کتنے آرام سے ڈاکٹر علی عثمان کا نام لے کر اسے آئندہ کے خواب دکھانے لگی۔
اتنا متقی انسان......کہ حضرت شیخ اپنے زُہد کا جائزہ لینے لگیں۔
جو کسی کی منکوحہ سے بات کرتے ہوئے اتنا محتاط ہو گویا صرف کلام کرنے سے حد جاری ہونے کا اندیشہ ہو۔
بلا کی خوبصورت، پُرکشش، جامہ زیب، کہ کوئی ایک بار تو ہر صورت جی بھر کر دیکھنا چاہے۔

مگر ڈاکٹر علی عثمان کی نگاہ میں اتنا اعتماد اور اتنی احتیاط ہوتی تھی کہ چمن کو خود بہت زیادہ محتاط ہو کر بات کرنا پڑتی تھی۔

شریف اور پارسا مرد کسی بھی شادی شدہ عورت کو تماشے کی طرح نہیں دیکھتا۔

دامنِ یوسف چاک ہو جاتا ہے
مگر پارسائی خود کو منوا کر رہتی ہے

چمن کو تو سوچ کر حیا آنے لگی کہ جو مرد' مرد ہو کر اتنی احتیاط کرے...... دل و نگاہ دونوں پر قابو ہو ایسے مرد کو تو تنہائی میں سوچنا بھی نہیں چاہیے......

''امی...... آزادی سے پہلے گرفتاری کی باتیں کرنے لگیں۔ کیا اولاد کا دکھ دیکھنے والی ہر ماں اسی طرح سوچتی ہے؟''

یہ بجا کہ دونوں کے درمیان ناقابل پیمائش فاصلے آچکے ہیں اگر طلاق کا ضابطہ مکمل نہ بھی ہو تو بھی اب وہ دریا کے دو کناروں کی طرح ہیں جن کی حدود کسی سمندر کے کنارے تو ختم ہو سکتی ہے مگر دونوں باہم بھی نہیں ملتے۔

اس کے باوجود تنہائی اس شخص کے تصور سے آباد کرنا جو دور دور تک اپنائیت کی انتہاء پر بھی اپنایا نہ جا سکے انتہائی معیوب اور غیر اخلاقی عمل ہے۔

اس نے دل ہی دل میں استغفار پڑھی اور بڑی دل سوزی و اخلاص سے اللہ سے مدد اور رہنمائی چاہی یہ ایک وراثتی عمل تھا جو باپ کی طرف سے اس کے خون میں شامل تھا

اس نے خود کو مصروف کرنے کے لیے کئی کام نکال لیے...... مگر تمام تر مصروفیت کے باوجود ایک اجنبی لڑکی ذہن کے روزنوں سے جھانکتی رہی جو اپنا تعارف کرائے بغیر چونکا دینے والے انداز میں بغیر تعزیتی کلمات ادا کیے واپس چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

''ویل ڈن...... یہ ہوئی نا بات......'' ارسلان نے زور سے تالی بجا کر ندا کو شاباش دی۔

''مگر وہ گھر میں نظر نہیں آئی تھی۔ یہ تو ایک مسٹری ہوگئی۔'' ندا اُلجھے اُلجھے انداز میں گویا ہوئی۔

''اسٹوپڈ...... دونوں مصروف ہوں گے...... ان کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں ہوگا کہ تم صبح صبح ان کے سر پر پہنچ جاؤ گی۔''

''تمہاری آواز سنتے ہی وہ واش روم میں چھپ گئی ہوگی۔ یا ڈریسنگ کی کسی وارڈ روب میں گھس گئی ہوگی۔''

''میں تو اسی وقت کھٹک گیا تھا جب تم نے بتایا تھا کہ اس نے پہلی بیوی کو طلاق دیے بغیر دوسری شادی کر لی ہے۔''

''وہ جو کہتے ہیں ناں شادی ایک جواء ہوتی ہے۔ اصل میں تو یہ جواء یہ نو سر باز...... گریٹ گیمبلر قسم کے لوگ کھیلتے ہیں اور تمہاری تو شکل سے ہی اتنی حماقت ٹپکتی ہے کہ ان جیسوں کے لیے بہت ہی 'سوفٹ ٹارگٹ' ہو۔''

''اچھا بس کریں...... بولتے ہیں تو سانس ہی نہیں لیتے...... قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔'' ندا بری طرح بھڑک اٹھی۔

''اب تو یہ سب کچھ تو ہو گیا...... بتائیں کیا کروں...... آپ تو بڑے عقل مند ہیں کوئی عقل کی بات بھی کرلیں۔''

ندا درحقیقت شدید ڈپریشن میں مبتلا ہونے جارہی تھی۔ اس کا خیال تھا ثمر چوری پکڑے جانے پر شرمندہ ہوگا۔ اس سے معافی مانگے گا...... اس کو خوش کرنے کے لیے چمن کو طلاق کا وعدہ کرے گا...... مگر شرمندہ ہونا تو درکنار وہ تو بات بات پر ہسٹریائی انداز میں چلا رہا تھا۔

اور اسی بات پر وہ ہتھے سے اکھڑی تھی اور یقین کرلیا تھا کہ اسے دھوکہ دیا گیا ہے۔

''چپ چاپ خلع لے لو...... ورنہ اس پراپرٹی میں جو تمہارا شیئر بن رہا ہے وہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ کے قریب قریب ہے...... یہ شخص یہ پیسے بھی تم سے ہتھیا لے گا...... اور اس کے لیے سب کچھ کرے گا...... اس نے تم سے شادی اس نیت سے کی تھی ورنہ تم جیسی بے وقوف لڑکی کو اپروچ ہی نہ کرتا ندا خلع کی بات سن کر پٹر پٹر ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی بات مکمل ہوتے ہی پھر بھڑک گئی۔

''آپ پھر سے مجھے بے وقوف کہہ رہے ہیں......''

وہ تقریباً چلا کر بولی۔

''ہزار بار کہوں گا...... عقل مند ہوتیں تو اس شخص کے چکر میں ہی کیوں آتیں؟'' ارسلان نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

ندا یہ سن کر لاجواب سی ہوگئی اور اضطرای انداز میں پہلو بدلنے لگی۔

''خلع تو ضرور لوں گی...... کیونکہ میں یہ دھوکے بازی برداشت نہیں کرسکتی لیکن پھر کیا کروں گی۔''

''ارے...... یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے......''

ارسلان برجستہ گویا ہوا۔

''ہم مرگئے ہیں کیا...... میں تم سے شادی کروں گا...... اور تمہیں لے کر امریکہ چلا جاؤں گا۔''

''ہوش میں تو ہیں آپ......'' ندا اپنی جگہ سے تقریباً اچھل پڑی تھی اور شدید غصے کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بالکل ہوش میں ہوں امریکہ میں تو میں دن میں شیمپئن لیتا ہوں مگر یہاں احتیاط کررہا ہوں...... حالانکہ شیمپئن بہت لائٹ ہوتی ہے۔ نشے میں آؤٹ نہیں ہونے دیتی...... بس رات کو تھوڑی سی وہسکی ضرور لیتا ہوں ورنہ نیند نہیں آتی۔''

ندا کے چودہ طبق روشن ہوچکے تھے۔ آنکھیں پھاڑے ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بلکہ منہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

''آ...... آ...... آپ ڈرنک کرتے ہیں......؟''

اس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔

''وہسکی ضرور پیتا ہوں کسی کا خون نہیں پیتا۔''

''Oh No......'' ندا گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور متوحش نظروں سے ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ارے...... کیوں ڈر رہی ہو...... ابھی بالکل ہوش میں ہوں...... امریکہ میں ہم Tax Payer ہیں...... Rich لوگوں میں شمار ہوتے ہیں...... یہ شوق تو ہمارا Status Symbol ہے...... ڈونٹ وری......'' ارسلان شانِ استغناء سے گویا ہوا۔

''لعنت ہے ایسے سوشل اسٹیٹس پر...... نانا جان زندہ ہوتے ناں تو بتاتے آپ کو صحیح کا......''

ان کے سامنے تو کوئی اذان کے وقت بات کرتا تھا تو کہتے تھے قبر میں سانپ بچھو منہ پر ڈسیں گے۔ اذان کے وقت بالکل خاموش رہو اور جب اذان ختم ہو جائے تو اذان کی دعا پڑھو پھر دنیا کی کوئی بات کرو۔ خبردار میرے سامنے گندے گندے کاموں پر اترانے کی ضرورت نہیں۔'' ندا پر یہ انکشاف کہ ارسلان ڈرنک کرنے کا عادی ہے۔ بہت ہی ہولناک اور روح فرسا تھا۔

''نانا مرحوم کے تمام اخلاقی لیکچرز یادداشت کے کونوں کھدروں سے ابل پڑے۔'' یہ سن کر ارسلان نے زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

''داداجان کے لیکچر اپنے فراڈی ہزبینڈ کو سناؤ۔ شاید انسانیت جاگ جائے۔''

''مذہب کا مطلب ہے Honestly...... اور''

''Honestly Is The Best Policy''۔

''بندہ پہلے اپنی Base تو ٹھیک کرے۔''

''Any How...... ابھی میں چلوں گا...... اسٹیٹ ایجنٹ میرا انتظار کر رہا ہوگا...... چھ کروڑ تک تو بات پہنچ گئی۔ تھوڑی Barganing کے بعد ہوسکتا ہے آج بات بن جائے اور Done ہو جائے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنا آئی فون اُٹھا کر Uber کو کونٹیکٹ کرنے لگا۔

''ہیں......؟'' ندا بدحواس نظر آئی۔

''اگر گھر سیل ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی؟''

''جہنم میں......'' ارسلان نے باقاعدہ گنگناتے ہوئے جواب دیا اس کی انگلیاں آئی فون کی اسکرین پر رقصاں تھیں۔

ندا تو حیرت کی انتہا پر ساکت ہی ہوگئی۔ ذہن پھر ثمر کی طرف پلٹ گیا۔

☆......☆......☆

''آپ ذرا رسان سے میری بات سنیں......'' وہ چمن کو ستانے اور عاجز کرنے کے لیے اسے لٹکا رہا ہے۔

''وہ طلاق نہیں بھیج رہا تو کیا ہوا ہم اپنی بیٹی کو خلع تو دلا سکتے ہیں۔ خلع کا حق تو ہے ناں اُس کے پاس...... ہم بے بس اور محتاج نہیں ہیں۔ یہ حق اللہ نے عورت کو دیا ہے۔ اس لیے تو وہ رب ذوالجلال رحمٰن ورحیم بھی تو ہے۔ اس نے ظلم کو ناپسند کیا ہے ظلم سے نجات کے راستے بتائے ہیں۔''

عطیہ بیگم...... آج کمر کس کر میدان میں اُتری تھیں موثر ترین ہتھیار استعمال کر رہی تھیں اور موقع

پاتے ہی مشکور احمد کو جالیا تھا۔

خلع لڑکی کا حق ضرور ہے...... مگر لڑکی خود چاہے تو...... ماں باپ کی خواہ فرمائش پر لڑکی کو یہ کارڈ استعمال کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔'' مشکور احمد نے اپنے مخصوص حلیم اور دھیمے انداز میں جواب دیا تھا۔

''ہم نے جس طرح اپنی بچیوں کی تربیت کی ہے وہ صبر کے ساتھ دکھوں کو گلے سے لگا کر رکھنے کو زندگی کا مقصد سمجھتی ہیں۔ حیادار ہیں...... ایک روتی سسکتی دنیا سے چلی گئی۔ دوسری ماں باپ کی عزت کی خاطر ہونٹ سیئے بیٹھی ہے۔ اب میں نے اور آپ نے اس کا ساتھ دینا ہے۔ اسے احساس دلانا ہے کہ ظلم سے سمجھوتہ کرنا بھی بہت بڑا ظلم ہے۔ جس کی شریعت بھی اجازت نہیں دیتی۔''

عطیہ بیگم نے شاید پہلی بار مشکور احمد کو لاجواب کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ واقعی چند ثانیے تو عطیہ بیگم کی طرف دیکھ کر رہ گئے اور حسب عادت کوئی برجستہ جواب ہی نہ دے سکے۔

''ہوں...... تو پھر چمن کے دل کا حال جاننے کی کوشش کرو...... وہ ثمر کی طرف سے کسی اچھی امید کی توقع تو نہیں کر رہی...... کیونکہ شوہر کے بارے میں بیوی ہی کوئی بات یقین سے کہہ سکتی ہے۔ ایک بیوی ہی شوہر کے مزاج کے تمام موسموں سے باخبر ہوتی ہے۔''

چند لمحے کے گہرے سکوت کے بعد مشکور احمد بالآخر گویا ہوئے۔

''کوئی امید اور توقع نہیں اسے...... وہ تو یہ سمجھ رہی ہے کہ یہاں بیٹھ کر اب وہ ماں باپ کی خدمت کر رہی ہے۔ بے ماں کی بچیوں کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ عمر بھر اُداس رہے...... اور خوشی کے انتظار میں اسی دہلیز پر بوڑھی ہو جائے۔''

عطیہ بیگم پھٹ پڑنے کے انداز میں گویا ہوئی تھیں

''یہ تو آپ کی خواہش ہے عطیہ بیگم...... وہ اب حالات کو کس طرح دیکھ رہی ہے۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔''

''ابھی وہ اس گھر سے ہو کر آئی ہے...... ثمر کی ماں کی خدمت کر کے آئی ہے۔ آخر وہ شخص بھی تو ایک انسان ہے۔ اس نے بھی تو اب کچھ سوچا ہوگا۔''

مشکور احمد جواباً گویا ہوئے۔ انداز میں گہرا تفکر پوشیدہ تھا۔

''ایسے انسانیت والے ہوتے تو اُس کی پانچ سال کی خدمت کا احساس کرتے...... ہماری طرف سے اب وہ سونے کا بن جائے۔ ہمیں اب مزید آزمانا ہی نہیں ہے۔'' عطیہ بیگم کے انداز میں قطعیت تھی۔

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' مشکور احمد اب زچ ہو کر پوچھنے لگے۔

''آپ وکیل سے بات کریں۔ خلع کی درخواست دائر کریں۔ چمن سے میں خود بات کرلوں گی۔'' عطیہ بیگم نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

''بہت بھاری ذمہ داری لے رہی ہیں آپ......'' مشکور احمد نے اب محتاط انداز میں بات کی تھی۔

''ایک بیٹی کے نقصان کے بعد......''

یہ کہہ کر عطیہ بیگم اُٹھ کر چل دیں۔ یہ اپنی بات پر قائم رہنے کا اعلان تھا۔

☆......☆......☆

ثمر جب سوچ سوچ کر شل ہو گیا تو یہی خیال آیا کہ جا کر ندا کو لے آئے۔ یہ اُس کا گھر تھا اسے اپنی بیوی کے ساتھ ہی آباد کرنا تھا۔ بانو آپا کی وجہ سے جن مصلحتوں کا سامنا تھا اب وہ راستے سے ہٹ چکی تھیں۔

افشاں کی پرواہ کرنے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی وہ اپنے گھر میں بہت اچھی طرح سیٹ تھی۔

اس نے پختہ ارادہ کرنے کے بعد اپنے چہرے پر اضطراری انداز میں ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ شیو اچھی خاصی بڑھی ہوئی ہے۔

طوہاً کرہاً اپنی جگہ سے اُٹھ کر پہلے شیو بنائی پھر غسل کر کے جو لباس سمجھ آیا زیب تن کیا اور کار کی چابی اُٹھا کر کمرے سے باہر چلا آیا۔

لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ وہ ایک لاحاصل مشقت کرنے جا رہا ہے۔ جس انداز میں ندا رخصت ہوئی ہے اتنا آسان نہیں کہ وہ اس کے کہنے سے اس کے ساتھ چلی آئے۔

وہ کار کا ڈور بند کرنے کے بعد خاصی دیر تک سوچتا رہا۔

ندا اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے...... کیونکہ وہ مل کر گئی ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گئی ہے۔

جب تک وہ اپنی سچائی ثابت نہیں کرے گا ندا اُس کی طرف پلٹ کر نہیں آئے گی۔ آخر وہ چمن کو کیوں باندھے ہوئے ہے؟

وہ عورت جو گاہے گاہے اُس کی مردانگی کو گالی دینے سے نہیں چوکتی تھی۔ وہ عورت جو اُس کی ناشکری کرتے ہوئے نہیں جھجکتی تھی۔ اپنی ساری محرومیوں کا ذمہ دار اُسے ٹھہراتی تھی۔

جب جی چاہتا تھا اس کے کلیجے پر خنجر کی نوک رکھ دیتی تھی۔

وہ اس سے ہمیشہ کا تعلق ختم کرنے میں اتنے تکلف سے کام کیوں لے رہا ہے؟ یا یہ کہ وہ انتظار کر رہا ہے کہ وہ خود اس سے خلع لینے میں پہل کرے۔ سوچتے سوچتے اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اپنی کمپنی کے لیگل ایڈوائزر کا نمبر ملانے لگا۔

کال فوراً ہی ریسیو ہو گئی۔

''Yes...... حارث ایڈووکیٹ......''

''ثمر بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ...... مسٹر ثمر...... السلام علیکم...... کیسے ہیں؟''

''I Am Sorry...... میرا سیل گن پوائنٹ پر چھن گیا تھا۔ یہ نیا سیل ہے...... اس میں آپ کا نمبر Saved نہیں ہے۔'' حارث ایڈووکی بہت معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوئے۔

''کوئی بات نہیں سر...... ایکچوئیلی مجھے آج آپ سے ملاقات کرنا ہے۔ آپ کہاں مل سکتے ہیں...... اور بتائیں Divorse Paper تیار کرانے کے لیے کیا کیا ڈاکومنٹس Require ہوتے ہیں؟''

ثمر کو اپنی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفاکی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

فرح اسلم قریشی

چابک

"تھک گئی ہوگی بے چاری۔" مینوں نے چائے میں پاپا ڈبو کر منہ میں رکھا۔ "ایسے لوگ نہیں تھکتے جھلیئے، تھکا دیتے ہیں۔ شہر تو بہت بڑا ہے مینوں، پر شہر والے بہت چھوٹے ہیں۔ آنکھوں میں آئی نمی کو جیدے نے آستین سے رگڑا۔" زخم خوردہ لہجے پر......

جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ اُس کے پڑوس میں میراثی گھرانہ آ کے بسا ہے اُس کی تو راتوں کی نیند حرام ہوگئی تھی۔

"بھلا بتاؤ...... اب یہ اوقات ہوگئی ہے ہماری کہ میراثیوں کے پڑوسی کہلائیں گے۔"

"توبہ توبہ...... پہلے سے اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ مرزا صاحب نے ایسی نیچ قوم کے لوگوں کو اپنا مکان کرائے پر دیا ہے تو انہیں ایسی بے نقط سناتی کہ ساری زندگی یاد رکھتے۔"

"مگر...... ہائے...... اِس بار مجھ سے یہ کیسی چوک ہوگئی جو اگلے کے پیٹ سے بات نہ نکلوا سکی...... ورنہ میں تو وہ ہوں جو بند لفافے میں خط کا مضمون بھانپ لیتی ہوں۔"
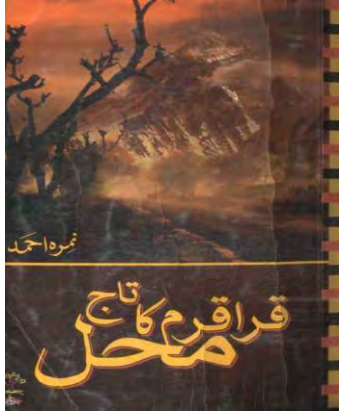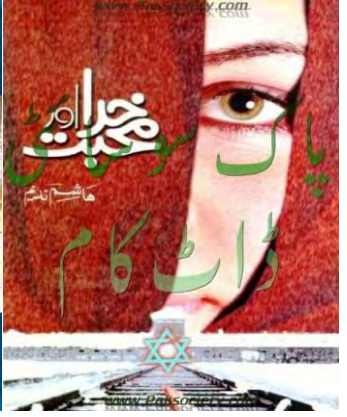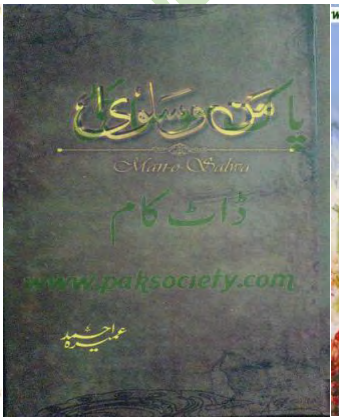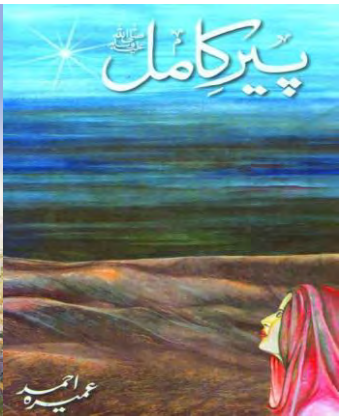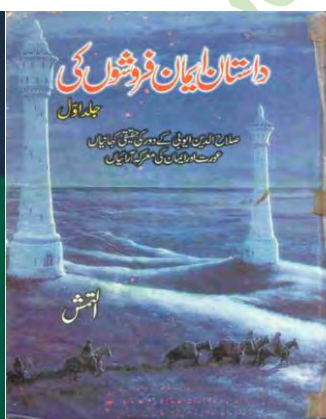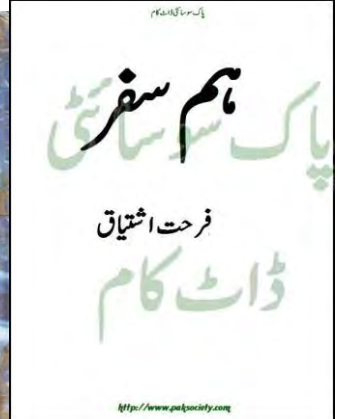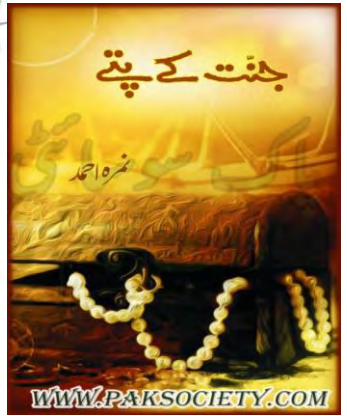
"خیر...... ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا...... میں بھی دیکھتی ہوں کہ کس کے باپ میں ہمت ہے جو میرے پڑوس میں بس کر گانا بجانا کرے...... ہم عزت والے لوگ اِن جیسے کمینوں سے دب کر تھوڑی رہیں گے۔"

"آئے ان کے گھر سے ڈھول ڈھماکوں کی آواز' سارے سُر تال نہ ہلا دیے تو میرا نام نبیلہ نہیں۔"

باورچی خانے میں اٹھا پٹخ کرتے ہوئے اُس کی بڑبڑاہٹ مسلسل جاری تھی۔ غصے میں کئی بار سلیب پر رکھا برتن ہاتھ پر آ کے گرا۔ چولہا رگڑتے ہوئے انگوٹھا اس زور سے ٹکرایا کہ نیلو نیل ہوگیا۔ مگر اُسے کب پرواہ تھی۔ اُس کے زخموں کا علاج تو اُس کی مسلسل چلتی ہوئی زبان میں پوشیدہ تھا اُسے اس بات پر فخر تھا کہ جب وہ بولتی ہے تو سامنے والے کو سانپ سونگھ جاتا ہے' ہمت نہیں ہوتی کہ پلٹ کر کچھ کر سکے۔ رہیں یہ غصے میں لگتی ہوئی چھوٹی موٹی چوٹیں تو اِن کے درد کا مداوہ بھی اُس کے تیر کی طرح نکلتے ہوئے وہ الفاظ تھے جو سننے والے کے سینے میں برچھی بن کر اترتے تھے اور اس وقت بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ پڑوس میں نئے نئے آ کر بسنے والے وہ تینوں وجود حیرت اور خاموشی سے دیوار سے پار آنے والی نبیلہ کی غلیظ' کریہہ اور گھٹیا ترین الفاظ سے مزین آواز کے شعلوں میں اپنے وجود کو جھلسا

رہے تھے۔ بے شک وہ میراثی تھے جنہیں عرفِ عام میں 'گویئے' کہا جاتا ہے۔ مگر آج اپنی نئی پڑوسن کی زبانی انہیں پتہ چلا کہ وہ 'بھانڈ' بھی تھے۔ یعنی مسخرے...... ایسی تضحیک...... وہ تو اپنے آپ کو فنکار کہتے اور سمجھتے تھے۔ یہ اُن کے آباؤ اجداد کا پیشہ تھا جو سالوں سے وہ اپنی آواز کی لے کے ذریعے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتے تھے۔ وہ مسخرے نہیں تھے...... اور ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کام کے لیے پیٹ میں چند لقمے روٹی کا ہونا ضروری ہوتا ہے کسی کو ہنسانا آسان نہیں ہوتا۔ پیٹھ سے لگے پیٹ میں بھوک کی آگ لیے وہ اپنے غم تال میں ڈھال کر گایا کرتے تھے۔ اس میں بھی جو کبھی سُروں کو کھینچنا پڑ جاتا تو اینٹھتی ہوئی آنتوں کا درد سہنا محال ہو جاتا تھا۔ معاشرے کے جس طبقے سے اُن کا تعلق تھا وہاں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اُن کے فن کا خراج اتنا ہی ملتا تھا کہ وہ تین کی بجائے دو وقت کی روکھی سوکھی کھا سکیں۔

چار افراد پر مشتمل اس گھرانے کا سربراہ جیدا ایک ٹانگ سے معذور تھا اپنے ایک سالہ بیٹے' بیوی اور مینوں اور چھوٹے بھائی راجو کا پیٹ پالنے کے لیے وہ دوستوں کے مشورے پر شہر آیا تھا۔ اُس نے سنا تھا کہ شہر میں ایسے فنکاروں کی بڑی قدر ہے۔ مگر پہلے ہی تجربے نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ پڑوس سے آنے والی اُس عورت کی آواز، انہیں اپنی اوقات جتا چکی تھی اور وہ اس بات پر حیران تھا کہ ابھی تو انہوں نے اپنے گانے بجانے کا سامان کھولا بھی نہیں تھا پھر اُن کی یہ پڑوسن آخر کیوں اتنی چراغ پا تھی۔

مگر پھر اُس عورت کے حقارت بھرے الفاظ و انداز سے سمجھ آ ہی گیا کہ وہ اس عورت کے پڑوس میں بسنے کے قابل نہیں تھے اور یہی بات اس عورت کو غضب میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ شہر میں پڑوس میں بسنے کے لیے بھی معیار کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ وہ یہ بات جان بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ تو لفظ 'معیار' سے بھی بہت نیچے تھا اور ایسے 'غیر معیاری' لوگ 'اعلیٰ معیار' کے احساسات سے عاری ہوتے ہیں۔

اس لیے اس وقت جیدا' مینوں اور راجو تینوں چائے پاپے کا ناشتہ سامنے رکھے اس کڑکتی سردی میں نبیلہ کی زبان سے نکلے انگاروں سے اپنا وجود تاپ رہے تھے جس کی آنچ اب اُن کے دلوں تک جا پہنچی تھی۔ تب ہی تو ہاتھ کا لقمہ منہ تک نہیں جا پا رہا تھا۔

''خبیث...... نہ جانے کہاں سے آ کر بس گئے...... یہی محلّہ ملا تھا اِن نیچ لوگوں کو...... کم ذاتیے...... پیشہ ور فقیر۔''

آواز کا نشیب و فراز بتا رہا تھا کہ وہ چلتے پھرتے' اندر آتے' باہر جاتے گالیوں کا یہ کارِ خیر انجام دے رہی ہے۔ رفتہ رفتہ آواز کم ہو کر آخر کار بند ہو گئی تو تینوں وجودوں نے سکھ کا سانس لیا۔

''تھک گئی ہوگی بے چاری۔'' مینوں نے چائے میں پاپا ڈبو کر منہ میں رکھا۔

''ایسے لوگ نہیں تھکتے جھلیئے...... تھکا دیتے ہیں۔ شہر تو بہت بڑا ہے مینوں...... پر شہر والے بہت چھوٹے ہیں۔ آنکھوں میں آئی نمی کو جیدے نے آستین سے رگڑا......'' زخم خوردہ لہجے پر مینوں نے چونک کر جیدے کو دیکھا تھا۔

''دو منٹ بھی نہ لگیں گے مجھے اس عورت کا منہ بند کرنے میں۔'' راجو سے بڑے بھائی کی آنکھوں کی نمی برداشت نہ ہو سکی تھی۔

''نہ راجو...... ہم یہاں کسی سے جھگڑا مول لینے نہیں آئے۔ ہم تو گجر بسر کے لیے...... روجی' روٹی کے لیے آئے ہیں۔ یہ مکان ہمیں برجا صاب (مرزا صاحب) نے کھدا ترسی میں دیا ہے۔ ہم اُن کا نام نہ بدنام ہونے دیں گے۔ آج نہیں تو کل ہمیں یہاں سے جانا ہی ہے پھر کیا جرورت ہے لڑنے جھگڑے کی۔ مینوں نے اُس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''پر' پر جائی...... ہم اِس عورت سے مانگ کر تو نہ کھاتے...... پھر کیوں اتنی چھکے پھرے ہے......''

راجو ابھی تک غصے میں تھا۔

''مینوں ٹھیک کہتی ہے راجو...... کھاموس بھلی...... بولنے دے اس عورت کو جتنا بول سکے...... ہمارا کیا لے وے گی...... کھد ہی بول بول کے تھک جاوے گی اُس کے پیٹ میں بھوک کی آگ ہوتی ناں...... تو یہ کبھی ایسی اوچی آواج (اونچی آواز) میں بات نہ کرتی۔ یہ اِس کا بھرا پیٹ بول رہا ہے۔ عجب اصول ہے اس جمانے کا...... کتے کا پیٹ بھرا ہووے تو وہ کھاموس پڑ جاتا ہے کونے میں کو...... اور انسان کا پیٹ بھرا ہووے تو وہ بھونکنے لگتا ہے۔ اس

عورت کی طرح۔"

جیدے بھائی کی بات راجو کی سمجھ میں آ چکی تھی۔اُس نے اپنے اندر سلگتے الاؤ میں کمی محسوس کی تو دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

گزشتہ ایک ہفتے سے جاری مغلظات جو وہ پڑوسیوں کی سماعتوں تک پہنچانے کے لیے بطور خاص آواز کو بلند کر کے بکا کرتی تھی اسے انجام دینے کے بعد وہ اسکول آ گئی تھی۔اتفاق سے اسکول میں بھی دوسروں کی عزتِ نفس کچلنے کے مواقع اسے آج کثرت سے میسر آئے تھے لہٰذا نفس پوری طرح مطمئن اور آسودہ تھا۔ابھی چند منٹ پہلے ہی اُس نے اپنی ساتھی استانی کے خاندان اور نسلوں کو رگیدا تھا۔اور سینہ ٹھونک کر کہا تھا کہ وہ کبھی غلط نہیں ہوتی نتیجتاً اُس کے عتاب کا شکار بنی وہ نئی استانی اب اپنے نصیبوں کو رو رہی تھی کہ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب اُس نے نبیلہ کے ایک غلط کام کی اصلاح کرنا چاہی تھی اور نتیجے میں نبیلہ کی بدزبانی اور بدگوئی کا سامنا کرنا پڑ گیا مگر اب کیا ہو سکتا تھا نبیلہ اپنے سارے تیر ونشتر برسا کر جا چکی تھی اور نئی استانی کے رونے کو نرا ڈھکوسلہ بھی قرار دے چکی تھی۔نبیلہ کے جانے کے بعد دیگر استانیاں روتی ہوئی ساتھی کو دلاسے اور تسلیاں دینے لگیں۔

نبیلہ کو یاد آیا کہ وہ اپنی Lesson Dairy ٹیبل پر بھول آئی ہے واپس پلٹی تو اسٹاف روم کے اندر سے آتی آوازوں نے قدم باندھ دیے۔

"یہ عورت ہے یا مصیبت...... کسی کو نہیں چھوڑتی...... بدذات کہیں کی...... پتہ نہیں کس نیچ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔" ایک جانی پہچانی استانی کی آواز ہے۔نبیلہ تلملا کر آگے بڑھی تاکہ اس کو بھی مزہ چکھا سکے مگر اگلا جملہ سن کر ٹھٹک گئی۔

بڑی ہی بھانڈ عورت ہے۔سارا وقت اسکول میں شور مچا کر رکھتی ہے کبھی کسی کے پیچھے لگتی ہے تو کبھی کسی کے...... پتہ نہیں کس گناہ کی پاداش میں اس عورت کو ہماری کولیگ بنا دیا۔مجھے تو شرم آتی ہے یہ سوچ کر کہ میں اس گھٹیا' میراثنوں جیسی حرکتیں کرنے والی عورت کی ساتھی ہوں۔یہ اوقات ہو گئی ہے اب ہماری کہ اس جیسی بدذات عورت کے برابر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔"

نبیلہ کا ذہن بالکل سناٹے میں تھا...... یہ انداز...... یہ الفاظ...... یہ زبان...... سب ہی کچھ جانا پہچانا تھا...... جیسے قریبی تعلق رہا ہو...... مگر پھر بھی اپنے لیے ایسی باتیں برچھی کی طرح سینے کے پار ہوئی تھیں۔

"ارے رہنے دو ثوبیہ...... میراثی اور بھانڈ اتنے گھٹیا اور نیچ نہیں ہوتے جیسی یہ ہے۔" کسی تیسری آواز نے جیسے قیامت ڈھائی تھی جس پر پورا اسٹاف قہقہے سے گونج اٹھا اور نبیلہ کو لگا جیسے بہت سے پتھر اُس کے سر پر آ کر گرے ہوں۔

"کمینی عورت...... پیشہ ور فقیرنیوں کی طرح ہاتھ جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہے۔" آوازوں کے تازیانے دھڑا دھڑ برس رہے تھے۔ایک کے بعد ایک استانی اُس کے بارے میں اپنے نادر خیالات کا اظہار کر رہی تھی مگر نبیلہ کا ذہن آوازوں کی پہچان سے آگے دوڑ رہا تھا۔وہ تو الفاظوں کی چکی میں پس رہی تھی سارے خیالات...... سارے الفاظ سب جانے پہچانے تھے۔اُس نے کہیں سن رکھے تھے...... مگر کہاں؟ یاد کرنا دشوار تھا اور برداشت کرنا اس سے کہیں زیادہ دشوار......

سنا ہے اُس کی اسی بدزبانی اور بدمزاجی کی وجہ سے اس کا شوہر اسے چھوڑ کر ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ان ہی میں سے کسی نے دوسروں کی معلومات میں اضافہ کیا تھا اور یکدم نبیلہ کو وہ کالی رات یاد آ گئی جب اُس کا شوہر اُسے بتا رہا تھا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا ہے۔

''کیوں..... کس لیے جا رہے ہو؟'' وہ تڑخ کر پوچھ بیٹھی تھی۔

''دنیا میں جنت کا مزہ بھی لینا چاہتا ہوں۔'' اُس کے مجازی خدا نے تلخی سے مسکرا کر کہا تھا۔

''یعنی تم ابھی تک دوزخ میں تھے.....'' وہ غرائی تھی۔

''تمہارے ساتھ تھا.....'' وہ دوبدو بولا تھا۔

''اور اب مجھے کس کے ساتھ چھوڑ کے جا رہے ہو؟'' وہ تلملائی تھی۔

''تمہارے لیے تمہاری زبان کا سہارا ہی کافی ہے۔'' نرمی سے کہہ کر اُس نے کروٹ بدلی تھی۔

''چہ چہ چہ..... کتنی بری بات ہے..... تم لوگ کیوں اپنے آپ کو اُس کے جیسا ثابت کر رہی ہو..... میں تو کہتی ہوں بس اس کے لیے ہدایت کی دعا کرو' تاکہ ہم جیسوں کی زندگیاں آسان ہو سکیں۔'' اسلامیات کی استانی جو عمر میں نسبتاً بڑی تھیں وہ سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ نبیلہ کو ماضی سے حال میں لانے کے لیے یہ الفاظ بڑے مددگار ثابت ہوئے تھے۔

بعض اوقات دعاؤں کی طرح بددعائیں بھی مختلف انداز میں قبول ہو جاتی ہیں۔ کسی بے شعور اور جاہل کے لیے ہدایت مل جانے کی دعا اُس وقت بددعا بن جاتی ہے جب قدرت اسے ہدایت پر لانے کے لیے خود احتسابی کا شعور عطا کر دیتی ہے۔

خود احتسابی کا شعور وہ کرارا چابک ہوتا ہے اگر کسی کے پڑ جائے تو وہ گناہ بھی یاد کرا دیتا ہے جس کی معاشرے میں عام معافی ہوتی ہے۔

نبیلہ کے ساتھ یہی ہوا تھا خود آگاہی کی پہلی سیڑھی پر آج ہی قدم پڑا تھا۔ اور پہلے ہی قدم پر وہ جیسے منہ کے بل گری تھی۔ اسکول سے گھر تک آتے ہوئے بے اختیار اُس نے کئی بار اپنا اور جیدے کے گھرانے کا موازنہ کیا تھا اور ہر بار اُس کی سماعتوں میں صرف اُس کی اپنی آوازیں گونج رہی تھیں۔ پڑوس تو بھانڈ' نیچ' کم ذات' میراثی اور گھٹیا ہونے کے باوجود خاموش تھا۔

اُس کا گھر آ گیا تھا۔ اُس نے خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھا محلے کے لوگ کھڑے تمسخرانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی تھی' تب ہی محلے کا ایک بچہ اُس کے سامنے آ گیا۔

''آپ کا پڑوسی جیدا گھر خالی کر کے چلا گیا ہے۔ اور آپ کے لیے ایک پیغام دے کر گیا ہے بارہ سالہ بچے نے یہ بتا کر غور سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

''وہ کہہ رہا تھا تم جیسے لوگوں کے پڑوس میں بسنے سے اچھا ہے کہ ہم اپنے جیسے کسی میراثی اور کم ذات کے پڑوس میں جا کر بس جائیں' ابھی تو ہمارا بچہ ایک سال کا ہے اگر تمہاری گندی زبان سیکھ گیا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ وہ اگر بڑا ہو کر یہی کام کرے گا جو ہم کرتے ہیں تو ہمیں پھر بھی سکون رہے گا کہ کم از کم اپنی زبان سے کسی کو تکلیف تو نہیں پہنچا رہا' نہ کہ تمہاری غلیظ اور گندی زبان سیکھ کر لوگوں کی زندگی عذاب کرے۔'' وہ بچہ بہت کچھ کہہ رہا تھا مگر نبیلہ کی نظریں اردگرد کھڑے لوگوں کی تمسخرانہ اور حقارت بھری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ایسی جھکیں کہ دروازے کا تالا بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور وہ تالا کھولنے کے لیے اردگرد ہاتھ مارنے لگی۔ پیچھے سے دبی دبی ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں اور اُس کے کانوں میں اسلامیات کی استانی سرگوشی کر رہی تھیں۔

''وہ مومن نہیں جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرا مسلمان محفوظ نہ ہو۔'' یقیناً نبیلہ اُن خوش نصیب لوگوں میں سے تھی جسے اللہ نے ہدایت کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ ورنہ بہت سوں کو تو اللہ ہدایت کی توفیق بھی نہیں دیتا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

دردانہ نوشین خان

بُرا حال

کاکی کی ماں تو گھر پر تھی نہیں ساری دردمندی دادی کے ذمے آتی تھی۔ وہ خالی پیٹ سوکھے منہ گھگھیاتی رہی۔ آنے والیاں جب تک آنسو نہ نکال لیں بولتی رہتیں۔ آنسو نکلنے پر پانی کے گلاس پیش کرنے لگتیں۔ دو دن یوں گزرے اب اطلاع آئی کہ......

''اماں...... تم اِدھر بیٹھ کر روٹی کھالو چائے پی لو...... جانے کتنے وقتوں سے خالی پیٹ کام کر رہی ہو۔ اللہ تمہاری پوتی کو صحت دے گا۔'' حمیرا باجی نے برتن صاف کرتی ملازمہ کو شفقت سے پکارا۔ اماں

ظہوری برتن رکھ کر ہاتھ سے ' ناں...... ناں ' کا اشارہ کرتے ہوئے رقت سے بولی۔

'' میں کیا روٹی کھاؤں ' حمیرا باجی...... میرے حلق سے نوالہ نہیں اترتا ہے۔ میرے پتر کا اتنا قد نہیں جتنا وہ قرض اُدھار اٹھائے کھڑا ہے۔ اللہ جانے کیسے اتارے گا غریب لاچار مزدور پیشہ...... کاکی بھی ٹھیک نہ ہوئی۔ میری دھی نے رات مجھے بتایا ہے ڈاکٹر کہتے ہیں بچنا مشکل ہے۔ میری اسکول پڑھنے والی نونہار کاکی...... دکھوں میں پڑگئی۔ ''

اماں ظہوری کے جھریوں زدہ گال پر ایک آنسو ڈھلکا ہوا تھا اور وہ رونے والی باتیں کیئے جاتی تھی۔ حمیرا باجی نے چائے کا پیالہ اُس کے پاس رکھا۔ دلاسے دیتی رہی۔ مگر اماں نے روٹی نہ کھائی بس چائے سُڑک لی۔

اماں ظہوری کی پوتی ایک ہفتہ سے بڑے شہر کے اسپتال میں داخل تھی۔ بیٹا اور بہو اُس کے ساتھ تھے۔ اماں کوٹھیوں میں کام کرتی تھی شام کو گھر پہنچتی تو اسپتال والے بیٹے سے فون پر حال لیتی۔ حال کچھ حوصلہ افزا نہ تھا۔ اماں ظہوری جیسے تیسے روزانہ کام پر آجاتی تھی۔ اُس کا جہاں دیدہ ذہن دور کی سوچ رہا تھا۔ تین کوٹھیوں پر کام کرتی تھی۔ ہر کوٹھی پر پہلے آدھا گھنٹہ کاکی اور بیٹے کی غربت کی باتیں کرتی اور دکھی ہوتی رہتی۔ ہر کوٹھی والی اسے ناشتہ کھانا دے کر سمجھاتی کہ وہ اپنی ہمت بحال رکھنے کے لیے دو چار لقمے لے لے مگر اماں ظہوری کسی کے سامنے کھا کر خود کو گرسنہ نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے پوتی کی فکر سے بے نیاز سخت دل سمجھا جائے۔ گھر کے اندر ہو یا باہر اُسے لحاظ آتا تھا۔ کام کاج کی تھکی گھر جاتی تو اِدھر اُدھر کی گلیوں سے پوچھنے والیوں کا تانتا بندھا ہوتا جو اپنے گھروں سے کھا پی پیٹ بھر کر منہ پوچھتی آتیں مگر اُس کے گھر داخل ہوتے ہی 'وائے وائے' کرنے لگتیں۔

'' میرا تو سن کے برا حال ہوگیا۔ ہماری تو بھوک پیاس اڑگئی۔ ''

'' میری آنکھوں کے سامنے آتی جاتی نظر آتی ہے، اِدھر بیٹھی ہوتی تھی بستہ لے کر...... وغیرہ وغیرہ...... ''

کاکی کی ماں تو گھر پر تھی نہیں ساری دردمندی دادی کے ذمے آتی تھی۔ وہ خالی پیٹ سوکھے منہ گھگھیاتی رہی۔ آنے والیاں جب تک آنسو نہ نکال لیں بولتی رہتیں۔ آنسو نکلنے پر پانی کے گلاس پیش کرنے لگتیں۔ دو دن یوں گزرے اب اطلاع آئی کہ اب آئی۔ اور تیسرے دن پہلے اطلاع اور پھر میت آگئی۔

اب تو کہرام بجا تھا۔ کاکی کی خالائیں' مامیاں' نانی' اِدھر سے چاچیاں' پھوپو سب کی سب بے حال تھیں۔ کوئی سینے پر دوہتڑ مار رہی ہے کوئی سر پر پٹی باندھے بین کر رہی ہے۔ کوئی بے ہوش ہوگئی ہے تو کوئی فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہی ہے۔ اماں ظہوری کا بیٹا (کاکی کا باپ) غریب مزدور مقروض تھکن اور غم سے نڈھال ہے۔ بہو (کاکی کی ماں) چلتی ہے تو چکراتی ٹھوکریں کھاتی ہے۔ رو رو کر آنکھیں متورم ہیں۔

ہر ایک کی دیکھ بھال اماں ظہوری پر ہے۔ رونا بھی ہے سب کو سنبھالنا بھی ہے۔ کبھی بے ہوش کے منہ میں پانی ٹپکاتی ہے کبھی گرنے والی کو آسرا دیتی ہے۔ کبھی چلانے والی کو کندھے سے لگاتی ہے' چمکارتی ہے جوابی بین بھی کرتی ہے۔ دیوار پار والے گھر میں جنازہ اٹھنے کے بعد دیا جانے والا '' کڑوا کھانا '' پک رہا ہے۔ چنے پلاؤ

دم پر لگے ہیں۔ خوشبو نتھنوں میں آئے جاتی ہے۔
اماں ظہوری کے کئی وقتوں بلکہ دنوں سے خالی پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔ بھوک اب دبائے نہیں دبتی، بھلائے نہیں بھولتی، بھوک کا دیو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ انتڑیاں 'قل ھو اللہ' پڑھ رہی ہیں۔ پیٹ سے اٹھتی 'غرغر' کی آواز ساتھ بیٹھوں تک جاتی ہے۔ پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہی آ لٹتا ہے۔ عورتیں اِسے غم کی انتہا قرار دے کر 'چچ چچ' کرنے لگتی ہیں، کوئی کہتی ہے۔
''ظہوری کی تو کاکی میں جان تھی۔ ابھی پچھلی عید پر آدھی رات کو بازار جا کے اِس کے لیے چوڑیاں لائی، کاکی کتنی خوش پھرتی تھی سبز پیلی چوڑیاں پہن کے...... ہاں فوٹو بھی ہے میرے موبائل میں۔''
وقفے وقفے سے یہی ہو رہا تھا کاکی کا کوئی نہ کوئی فوٹو کسی نہ کسی کے موبائل سے نکل آتا اور نہیں تو اسپتال میں بیماری کے دوران پوچھنے جانے والوں رشتہ داروں نے فوٹو بنائے تھے۔ یوں ایک موبائل باری باری تمام عورتوں کے ہاتھ سے گزرتا اور سسکیاں تیز کر دیتا۔ اماں ظہوری کا اب کسی فوٹو کو دیکھنے میں جی نہ لگ رہا تھا۔ آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ بولا بھی نہ جاتا تھا۔ وہ بے تابی سے بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔
آخر کار جنازہ اٹھا کہرام مچا، کون کہاں گرا، کس نے دیوار سے سر پھوڑا کسی کو کسی کی خبر ہو تو ہو اماں ظہوری کو کسی کی خبر نہ تھی۔ وہ تو خود گر پڑنے کو تھی اپنا دم نکلنے کو تھا کسی کو کیا سنبھالتی۔ سر میں ایسا چکر آیا کہ اوندھے منہ دری پر گر پڑی۔ رفتہ رفتہ عورتیں پھر سے بیٹھنے لگیں۔ کسی نے اماں کو بھی کھینچ بٹھایا۔
''جنازہ رخصت ہوئے گھنٹہ ہونے کو آ رہا تھا۔ مرد ابھی تک نہیں پلٹے تھے۔
''منہ چھوڑ'' کی دیگیں باورچی خانہ کے چھپر تلے آ چکی تھیں کچھ عورتیں جا چکی تھیں باقی خاموشی سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
اماں ظہوری 'ہائے کاکی ہائے کاکی' کا ورد کرتی اٹھی اور گھسٹتی ہوئی چھپر تلے جا پہنچی۔ کرایہ پر اٹھوائی اسٹیل کی پلیٹیں اِدھر اُدھر رکھنے کے بہانے دیگ کا ڈھکن کھول کر جھانکا۔ چنے پلاؤ کا مہکتا دھواں سانس میں کیا اُترا بھوک دیوانی ہوگئی۔ اسٹیل کی بڑی تھالی دیگ میں ڈال کر بھری اور گندم کی بوریوں کی اوٹ میں بڑے بڑے نوالے بھر کر پیٹ میں ڈالنے لگی، چھپر تلے نیم اندھیرا تھا۔ چھپر کے سامنے بیرونی دروازہ تھا۔ بیرونی دروازے پر گاڑی رُکی۔
کوٹھی والی باجیاں افسوس کے لیے آ رہی تھیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔
''اماں بیچاری کا تو کوئی دن سے برا حال تھا۔ ایک کھیل اُڑ کے منہ میں نہ جاتی تھی۔ اب جانے کیا حال ہوگا۔''
''بیچاری بہت صدمے میں ہوگی۔''
ایک دم حمیرا باجی کی نظر اماں ظہوری پر پڑی۔ وہی کل والے کپڑے وہی دوپٹہ لپیٹے ہاتھ میں تھالی لیے جلدی جلدی منہ چلا رہی تھی۔ ایک پل کے لیے دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ اماں نے ندامت سے خود کو دوسری طرف پھیرا ہی تھا کہ حمیرا باجی لپک کر ساتھ والیوں کے سامنے آ گئی اور انہیں لیے ہوئے صحن میں بیٹھی عورتوں سے پوچھنے لگی۔
''اماں ظہوری کہاں ہے؟ بیچاری کا بُرا حال ہوگا۔''

☆☆......☆☆

ناولٹ

حنا بشریٰ

دعویٰ محبت

''صندل آپی! یہ آپ کے خلوص کے قابل نہیں ہیں۔ اُن کو تو امی کے جوتے پڑنے چاہییں۔'' وہ عمر کی صندل کے ساتھ بدسلوکی پر کہتی۔ ''تو مت کیا کرے میری خدمتیں، میں کون سا مرا جا رہا ہوں۔'' وہ جل بھن کر جواب دیتا، نفیسہ بیگم جب یہ بحث......

عمر انتہائی بے چینی کے عالم میں آپریشن تھیٹر کے باہر ٹہل رہا تھا۔ اُس کی پریشانی سوا نیزے پر پہنچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کو باہر نکلتا دیکھ کر وہ تیزی سے اُس کی جانب لپکا۔

''ڈاکٹر صاحب! صندل کیسی ہے؟'' وہ انتہائی گھبراہٹ سے بولا۔

''دیکھو عمر...... خون بہت بہہ گیا ہے۔ ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اگلے دو گھنٹے مریض کی زندگی کے لیے بہت اہم ہیں۔ تم دعا کرو۔ جب بات انسان کے ہاتھ سے نکلنے لگے تو دعائیں ہی انسان کا آخری سہارا ہوتی ہیں۔''

ڈاکٹر اُسے تسلی دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ڈاکٹر کی باتوں نے اُسے پچھتاوے کے سمندر میں گرا دیا۔ شرمندگی اور ندامت بھری سوچیں لیے وہ تنہا کھڑا تھا کہ تایا جان اور مہرین کی آواز پر چونک گیا۔

''عمر کیا ہوا ہے میری بیٹی کو؟'' تایا جان گلوگیر لہجے میں بولے۔ شرمندگی کے مارے عمر کی زبان کو جیسے تالا لگ گیا تھا۔

''عمر بھائی! صندل آپی کو آخر کیا ہوا ہے۔ آپ کچھ بولتے کیوں نہیں۔'' اب کے مہرین نے اُسے روتے ہوئے مخاطب کیا۔

تایا جان کے سامنے جھوٹ بولنے کا تو اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

''وہ اصل میں...... میں نے...... غصے میں صندل کو دھکا دیا تو اس کا سر بیڈ سے ٹکرانے کی وجہ سے پھٹ گیا۔ خون بہت زیادہ...... بہہ گیا ہے۔'' وہ ندامت سے نظریں جھکائے بول رہا تھا۔

تایا جان اُسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

''گھٹیا انسان، احسان فراموش...... یہ تو نے میرے احسانوں کا بدلہ دیا ہے کہ آج میری پھول جیسی بچی زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر رہی ہے۔'' تایا جان نے کہتے ہوئے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔

''ابو جان! چھوڑ دیں یہ ہاسپٹل ہے سب ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔'' مہرین بولی۔

''مہرین اِس کو کہہ دو میری نظروں کے سامنے سے دفع ہوجائے۔ اگر میری بیٹی کو کچھ ہوا تو میں اِس کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' تایا جان غصے سے دھاڑے عمر نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

''میرا خون اتنا گندا ہوسکتا ہے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' تایا جان کی آواز میں کرب تھا۔

☆......☆......☆

''یا اللہ! یہ مجھ سے کیا ہوگیا' انتقام نے مجھے اتنا اندھا کردیا کہ میں نے انتقام کی آگ میں ایک مظلوم کو ہی جلا ڈالا......شاید صندل ٹھیک ہی کہتی تھی کہ میں انتہائی خودغرض اور بے حس انسان ہوں۔''

تنہائی میں بیٹھا وہ اپنا احتساب کررہا تھا۔

آسمان کو بے بسی سے تکتے ہوئے اُس نے آنکھیں بند کرلیں ماضی کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ سیڑھیاں نمودار ہوئیں عمر ہلکے ہلکے قدم رکھتا ہوا ماضی میں اُتر گیا۔

ایکسیڈنٹ میں عمر کے والدین کی اچانک موت نے اُسے دس سال کی عمر میں یتیمی کا غم دے دیا تھا۔ یہ غم کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے ایک یتیم سے زیادہ کوئی جان نہیں سکتا......شروع شروع میں تو سب رشتے داروں کا خون جوش مارتا ہے مگر آہستہ آہستہ اِسی یتیم کا وجود بوجھ لگنے لگتا ہے۔

کچھ دنوں کے لیے پھوپوا اپنے گھر لے گئیں مگر جب سسرال سے طعنے ملنے لگے تو انہوں نے عمر کی ذمہ داری اپنے بڑے بھائی ابراہیم صاحب پر ڈال دی۔

خدا کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ انہوں نے عمر کی ذمہ داری بہت خوشدلی سے قبول کرلی اور اُسے اپنے گھر لے آئے۔

''صندل' مہرین......دیکھو کون آیا ہے؟'' وہ انتہائی خوشی سے اپنی دونوں بیٹیوں کو بلا رہے تھے۔ صندل اُس کی ہم عمر اور مہرین چھوٹی تھی۔

''اِس کو یہاں کیوں لائے ہیں؟'' نفیسہ بیگم کی گرجدار آواز سنائی دی۔ عمر اُن کی آواز سنتے ہی خوفزدہ ہوکر تایا جان کے پیچھے چھپ گیا اور اُن کی قمیض مضبوطی سے پکڑلی۔

''نفیسہ بیگم......کیا ہوا آپ نے تو معصوم بچے کو ڈرا ہی دیا ہے۔'' ابراہیم صاحب عمر کو خوفزدہ دیکھ کر بولے۔

''میں آپ سے صرف یہ پوچھ رہی ہوں کہ یہ یہاں کیوں آیا ہے۔'' نفیسہ بیگم ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولیں۔

''یہ میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون دربدر کی ٹھوکریں کھائے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ اب ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔'' وہ حتمی انداز میں بولے۔

''آگے میری جان کو مصیبتیں کم تھیں جو یہ ایک اور مصیبت اُٹھا کر لے آئے ہیں۔'' نفیسہ بیگم نے زہریلی نگاہ عمر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''نفیسہ بیگم خدا سے ڈریں' کس چیز کی کمی ہے ہمارے گھر میں اگر دو روٹیاں یہ بے چارہ بھی کھالے گا تو کون سی قیامت آجائے گی......اور ویسے بھی یتیم کی کفالت کا تو بہت اجر ہے اِس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی......'' ابراہیم صاحب قائل کرنے والے انداز میں بولے۔

''اچھا اچھا رہنے دیں بس آپ مردوں کے

پاس بڑا مضبوط ہتھیار ہوتا ہے جب اپنی مرضی چلانی ہوتو فوراً قرآن وحدیث کے حوالے دے کر عورتوں پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔'' نفیسہ بیگم سر جھٹکتی اندر چلی گئیں۔

☆......☆......☆

ابراہیم صاحب کی باتوں نے وقتی طور پر نفیسہ بیگم کو خاموش تو کروادیا تھا مگر دل کا زہر وقتاً فوقتاً زبان کے ذریعے نکلتا رہتا تھا۔

ابراہیم صاحب کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر ہوتے تو نفیسہ بیگم کھل کر اپنا زہر عمر پر نکالتیں......

گھر کے کام کرواتیں سخت دھوپ میں سودا سلف لینے بھیج دیتیں...... وہ بھاگ بھاگ کر سارے کام کرتا تاکہ کھانے کے وقت اُسے ایک روٹی نصیب ہوجائے۔

''تائی جان! بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ صندل اور مہرین کو کھانا کھاتے دیکھ کر بے چارگی سے بولا۔

''جاوہاں جا رومال میں تیرے لیے روٹی رکھی ہے اور فریج میں سالن رکھا ہوا ہے الگ سے اور دیکھ اور چیزوں میں ہاتھ نہ مارنا۔'' وہ سختی سے بولیں۔

اُس نے روٹیوں کا رومال خالی دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''تائی جان! اس میں تو کوئی روٹی نہیں ہے۔'' بھوک سے بے حال ہوکر وہ بے بسی سے بولا۔

''ارے کہاں چلی گئی میں نے خود رکھی تھی...... جھوٹے کہیں کے ایک کھا کر دوسری کے لیے بہانہ تو نہیں بنارہا۔'' وہ اُس کا کان کھینچ کر بولیں۔

''تائی جان قسم لے لیں میں نے روٹی نہیں کھائی۔'' وہ درد سے اپنا کان چھڑا کر رونے لگا۔

''امی روٹی تو مہرین نے بلی کو ڈال دی تھی۔'' صندل نے اصل بات بتا کر اُس کی جان چھڑائی۔

''اچھا ٹھیک ہے...... مرا کیوں جارہا ہے...... اب چمچ سے سالن کھالے اب تیرے لیے خاص روٹی پکانے سے تو رہی...... اور شام ہونے میں دیر ہی کتنی ہے شام کو کھانا کھالینا۔''

وہ لاپروائی سے کہہ کر سونے کے لیے اندر چلی گئیں۔

بھوک سے عمر کی بری حالت ہورہی تھی۔ وہ چپکے سے اُٹھا اور فریج کھول کر دیکھا فریج پھل سے بھرا ہوا تھا۔ وہ شدت سے کھانے لگا اور بے دھیانی میں نا جانے کتنے پھل کھا گیا۔ نفیسہ بیگم باہر آئیں عمر کو فریج کے پاس بیٹھا دیکھ کر بیخ پا ہوگئیں۔

''تیرے باپ کی کمائی ہے جو یُوں کھا رہا ہے۔'' وہ غصے سے بولتے ہوئے اُسے بے تحاشا مارنے لگیں۔

ابراہیم صاحب گھر میں داخل ہوئے تو یہ منظر دیکھا تو تڑپ کر رہ گئے۔

''نفیسہ بیگم! دو بیٹیوں کی ماں ہوکر بھی آپ میں اتنی سنگدلی ہے۔'' انہوں نے دُکھ سے کہتے ہوئے عمر کو اپنے ساتھ لپٹالیا۔

''لو آگئے ہیں تمہاری حمایتی۔'' وہ عمر پر طنز کرتی اندر چلی گئیں۔

☆......☆......☆

ایک دن سودا سلف لاتے ہوئے چند انڈے ٹوٹ گئے۔ نفیسہ بیگم نے اُسے ڈنڈوں سے خوب مارا اور سزا کے طور پر باہر صحن میں کھڑا کردیا۔

بارش بھی خوب ہو رہی تھی اور سردی بھی اپنا جوبن دکھا رہی تھی۔ وہ لرزتے وجود کے ساتھ دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔

''عمر......'' صندل کی آواز کھڑکی سے آئی تو وہ بھاگتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچا۔

''عمر یہ لو بسکٹ کھا لو......اور میرا سوئٹر پہن لو ورنہ سردی لگ جائے گی۔'' صندل تاکید کرتی واپس پلٹ گئی۔

نا جانے کب عمر روتا روتا سو گیا۔ جب ابراہیم صاحب گھر آئے تو سردی میں عمر کو زمین پر سوئے ہوئے دیکھا تو وہ بھڑک اٹھے۔

''نفیسہ بیگم!'' انہوں نے غضبناک ہو کر بیوی کو پکارا۔

ایک لمحے کے لیے تو نفیسہ بیگم گھبرا گئیں مگر پھر ازلی ہٹ دھرمی نے انہیں زیادہ دیر چپ رہنے نہیں دیا تھا۔

☆......☆......☆

عمر بھی کل سے اسکول جائے گا۔'' ابراہیم صاحب محبت سے بولے۔

''کیا ضرورت ہے اسے پڑھانے اور روپیہ برباد کرنے کی۔'' نفیسہ بیگم بھڑک کر بولیں۔

''کیوں ضرورت کیوں نہیں...... آپ کو تو مفت کا نوکر مل گیا......میں روزِ قیامت اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔'' وہ عمر کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔

''تاجاجان مجھے اسکول جانے کا بہت شوق ہے۔'' عمر معصومیت سے بولا۔ نفیسہ بیگم کو ان دونوں کا پیار ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔

عمر اسکول سے آ کر گھر کے کام بھی کرتا...... کھانے کے لیے دسترخوان لگاتا' برتن دھوتا جلدی جلدی ہوم ورک کرتا تاکہ کچھ دیر کے لیے کارٹون دیکھ لے مگر تائی جان اُسے بہانے بہانے سے کوئی نہ کوئی کام کہتی تو وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ اپنی تمام تلخیوں کو اپنے اندر سمیٹ کر بچپن جوانی میں گم ہو گیا تائی جان کی سختی اور نفرت نے اُس کے اندر تلخی بھر دی تھی۔

اپنے غصے کا اظہار وہ اکثر صندل اور مہرین کے ساتھ لڑ کر نکالتا......اب بھی وہ اپنا ہر کام خود کرتا' اپنے کپڑے دھوتا' اپنے لیے روٹی بھی خود پکاتا......

ایک دن روٹی پکاتے ہوئے روٹی جل کر کوئلہ ہو گئی۔

مہرین کی نظر پڑی تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''عمر بھائی آپ کو تو روٹی پکانے پر اور وہ بھی اتنی اعلیٰ پکانے پر انعام ملنا چاہیے اگلے گھر جا کر خوب ہمارا نام روشن کریں گے۔'' مہرین کی بات پر صندل بھی مسکرانے لگی تھی مگر وہ عمر کے مزاج کو جانتی تھی فوراً ہی اپنی ہنسی چھپا لی۔

روٹی جلنے کی وجہ سے ویسے ہی اُس کا دماغ کھول رہا تھا۔ مہرین کی بات سن کر اور اُسے ہنستا ہوا دیکھ کر اور آگ بگولہ ہو گیا۔ اُسے تھپڑ مارنے کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ مہرین چیخیں مارتی ہوئی شوخی سے بھاگ گئی۔

''لائیں عمر میں پکا دیتی ہوں روٹی۔'' صندل ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

''معاف کرو' نہیں چاہیے تمہارا احسان مجھے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر تلخی سے بولا۔

اس کے بعد صندل نے معمول بنا لیا۔ نفیسہ بیگم سے نظر بچا کر عمر کے چھوٹے چھوٹے کام کر دیتی اُس کے لیے روٹی پکا کر رومال میں چھپا دیتی۔ اپنی پاکٹ منی میں سے کچھ پیسے بچا کر اُس

کی کتاب میں رکھ دیتی۔ اپنے حصے کا دودھ کا گلاس اُس کے کمرے میں رکھ آتی۔ اپنے یونیفارم کے ساتھ اُس کی شرٹس بھی دھو دیتی...... عمر اُس کے خلوص کا جواب اکثر بے مروتی سے دیتا...... مگر صندل نے تو جیسے عمر کے ساتھ بھلائی اپنے اوپر فرض کرلی تھی۔ مہرین عمر کی بدتمیزی پر بل کھا کر رہ جاتی۔

''صندل آپی! یہ آپ کے خلوص کے قابل نہیں ہیں۔ اُن کو تو امی کے جوتے پر پڑنے چاہیے۔'' وہ عمر کی صندل کے ساتھ بدسلوکی پر کہتی۔

''تو مت کیا کرے میری خدمتیں، میں کون سا مرا جارہا ہوں۔'' وہ جل بھن کر جواب دیتا، نفیسہ بیگم جب یہ بحث و مباحثہ سنتی تو عمر پر برس پڑتیں۔

''صندل کتنی بار منع کیا ہے اس احسان فراموش پر زیادہ مہربانیاں نہ کیا کر خود کام کرتا ہے تو انسان بنا رہتا ہے...... اب دیکھو ایسے رعب ڈال رہا ہے جیسے ہم اِس سے مانگ کر کھاتے ہیں۔'' نفیسہ بیگم نے طنز کے تیر برسائے۔

نفیسہ بیگم کے طعنے عمر کو جلا کر کوئلہ کر دیتے تھے۔

وہ پیر پٹختا ہوا گھر سے نکل جاتا اور آدھی آدھی رات تک سڑکوں پر بلا مقصد پھرتا اور اپنا دل جلاتا، صندل جانتی تھی کہ انا کا مارا گھر آ کر بھی دروازہ نہیں بجائے گا بلکہ تکلیف اُٹھا کر باہر بیٹھا رہے گا۔ اس لیے وہ دروازہ کھول کر پاس ٹہلتی رہتی...... اُس کے آنے پر ہزار منتیں کر کے اُس کو مناتی اور کھانا کھلاتی۔

☆......☆......☆

عمر نے گریجویشن فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ تایا جان مہرین اور صندل نے اُسے دل سے مبارکباد دی، خوشی میں بھول کر اُس نے اپنا رزلٹ کارڈ تائی جان کو

بھی دکھانا چاہا مگر وہ نفرت سے اُس کا ہاتھ جھٹکتی ہوئی بولیں۔

''ارے ہٹو! اب اتنی بڑی کامیابی حاصل تو نہیں کر لی کون سا پورے صوبے میں ٹاپ کر لیا ہے۔'' وہ نفرت کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ عمر کا تاریک چہرہ تایا جان کے دل پر چوٹ لگا دیتا تھا۔

''نفیسہ بیگم کبھی تو اُسے اپنی اولاد کی طرح سینے سے لگا لیا کریں۔ کبھی تو اُس کی خوشی میں خوش ہو جایا کریں۔ نا جانے کیوں تم نے بے چارے سے بلاوجہ کی دشمنی پال لی ہے۔'' ابراہیم صاحب بہت دکھ سے کہتے۔

☆......☆......☆

عمر کو ایک کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی۔ وہ خود کو بہت آزاد محسوس کر رہا تھا۔ تائی جان کی محتاجی سے نجات اُس کے لیے خوشی کا باعث تھی۔ اب صرف رہائش کا مسئلہ تھا۔ جس کے لیے وہ دن رات دعا گو تھا۔

''عمر میری دوست کی سالگرہ ہے کیا آپ مجھے شام کو لے جائیں گے؟'' عمر جو کمرے میں لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ صندل نے اُسے پکارا۔

''میں تو لے جاؤں گا مگر آپ کی والدہ محترمہ کو کوئی مسئلہ نہ ہو تو...... کیونکہ مجھے تو بائیک بھی چلانی نہیں آتی کہیں اُن کی لاڈلی شہزادی صاحبہ کو کوئی چوٹ نہ لگ جائے۔'' وہ کتاب سے منہ ہٹائے بغیر اطمینان سے بولا۔

سالگرہ سے واپسی پر صندل اور عمر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ عمر کو معمولی چوٹیں آئیں مگر صندل اچھی خاصی زخمی ہو گئی تھی۔ نفیسہ بیگم نے جو اپنی لاڈلی بیٹی کا حال دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ...... زوردار تھپڑ عمر کے منہ پر مار دیا۔ عمر کا ضبط جواب دے گیا۔ بچپن کی اور بات تھی مگر اب وہ اُن کے ٹکڑوں پر نہیں پل رہا تھا۔ جو اُن کی مار کھاتا۔ وہ غصے سے بھرا گھر سے نکل گیا۔

جانے دو کم بخت کو جب ساری رات کسی ریلوے اسٹیشن کے بینچ پر گزارنی پڑے گی نا تو پھر اِس احسان فراموش کو تائی کا گھر یاد آئے گا۔'' نفیسہ بیگم اُس کو تن فن کرتا جاتا دیکھ کر غصے سے پھنکاری۔

ساری رات گزر جانے کے بعد بھی عمر نہ آیا تو صندل کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اُس نے متعدد بار فون کیا مگر وہ ہر بار کال کاٹ دیتا تھا۔ ابراہیم صاحب نے بھی اُسے ہر جگہ ڈھونڈا مگر نہ ملا...... صندل کی بے چینی و بے قراری لحہ بہ لحہ بڑھنے لگی تھی۔ وہ رات کو روز دروازہ کھول کر اُس کا پہروں انتظار کرتی...... آخر ایک رات وہ آ ہی گیا۔

اُسے دیکھ کر صندل کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ عمر بے نیازی سے سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور اپنا سامان بیگ میں ڈالنے لگا...... صندل خاموشی سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔

''عمر امی کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں مگر گھر چھوڑ کر جانا کہاں کی عقل مندی ہے؟'' صندل بھیگے لہجے میں بولی۔

''دیکھو صندل ہر انسان کی ایک برداشت ہوتی ہے۔ میں اس عورت کے طعنے اور سلوک مزید برداشت نہیں کر سکتا...... تایا جان کی وجہ سے صرف گستاخی نہیں کرتا مگر اب میرا ضبط جواب دینے لگا ہے۔''

وہ بنا دیکھے روانی سے بولا۔

''عمر پلیز گھر چھوڑ کر نہ جائیں۔'' وہ کہہ کر بے تحاشا رونے لگی تھی۔

اُس کے اس شدت سے رونے پر عمر حیران سا ہوکر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔
صندل کے آنسوؤں میں نہ صرف دوستی، خلوص اور ہمدردی تھی بلکہ پہلی دفعہ اُس نے محسوس کیا اُس کے آنسو دعویٰ محبت بھی کر رہے تھے۔
''یہ سب کب ہوا؟'' عمر اپنے دل سے حیران و پریشان ہوکر پوچھنے لگا۔
''دیکھو صندل میں مجبور ہوں میں مزید ذلت اور طعنوں کی زندگی نہیں گزار سکتا۔'' اب کی بار عمر کے لہجے میں نرمی تھی۔ صندل بھیگی نگاہوں سے اُسے دیکھے جارہی تھی۔
''ویسے بھی مجھے کمپنی کی طرف سے اپارٹمنٹ مل گیا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا چلو آج ہی سہی...... میں تم لوگوں سے ملنے آتا رہوں گا ویسے بھی تایا جان کی وجہ سے میرا اس گھر سے ناطہ مرتے دم تک نہیں ٹوٹ سکتا۔'' وہ بیگ اُٹھا کر باہر نکل گیا۔
ابراہیم صاحب اُسے نم آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر عمر کے ارادے صاف ظاہر کررہے تھے کہ اب کسی کے آنسو اُس کے فیصلے کو بدل نہیں سکتے۔
وہ کبھی کبھار آکر سب سے مل جاتا...... صندل اُسے ہر پل یاد کرتی رہتی اور جب وہ گھڑی دو گھڑی کے لیے آتا تو جی بھر کر دیکھ لیتی وہ جانے لگتا تو اُسے بھیگی آنکھوں کے ساتھ رخصت کرتی۔ وقت کا کام تو گزرنا ہے سو وہ گزر رہا تھا۔
نفیسہ بیگم سے شدید اختلاف کے باوجود ابراہیم صاحب نے عمر کو اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کرلیا عمر انکار کرنا چاہتا تھا مگر تایا جان کے احسانوں کے سامنے مجبور ہوکر انکار نہ کرسکا۔
صندل دلہن بنی اُس کی منتظر تھی۔ محبت کو پالینے کا احساس اُس کی خوبصورت آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ عمر کو اندر آتا دیکھ کر اُس نے حیا سے نظریں جھکالیں۔
''یہ مت سمجھنا کہ تمہاری محبت یا تمہارے حسن نے اتنا مجبور کردیا تھا کہ میں نے تم سے شادی کرلی۔ تایا کے احسانوں کی وجہ سے یہ طوق اپنے گلے میں ڈالا ہے ورنہ اُس عورت کی بیٹی سے شادی کرنا یہ تو عمر کو مر کر بھی قبول نہ تھا۔'' اُس کا لہجہ اور آنکھیں زہر اُگل رہی تھیں۔
صندل نم آنکھوں سے اُس سنگدل کا ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔
''انتقام...... صرف اور صرف انتقام ہے۔ یہ شادی اُس عورت سے انتقام لینے کا بہترین طریقہ تھی۔ اب پتھر تمہیں لگے گا اور زخم تمہاری ماں کو آئے گا...... اب دل تمہارا دکھے گا اور آنسو تائی جان بہائیں گی۔'' عمر کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ بکھر گئی۔
صندل نجانے کس حوصلے سے اُس کا زہر آلودہ لہجہ سن کر کتنے ہی آنسو اپنے حلق میں اُتار رہی تھی۔
''عمر لیکن امی کی غلطیوں میں میرا کیا قصور ہے؟'' صندل بے بسی سے بولی۔
''تو میرا کیا قصور تھا؟ اگر میرے ماں باپ اچانک اِس دنیا سے چلے گئے اور مجھے تم لوگوں کی چھت کے نیچے پناہ لینی پڑی۔ اِس پناہ کی بہت قیمت چکانا پڑی ہے۔ میرا بچپن روتے دھوتے اپنے دکھوں اور محرومیوں پر ماتم کرتے ہوئے چلا گیا۔ ساری ساری رات تائی جان کی مار سے درد سے تڑپتا رہتا تھا مگر کسی کو اپنا درد نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ بول رہا تھا اور کرب اُس کی آنکھوں سے جھلکنے

لگا۔

ایک امی کا ہی برا سلوک تھا باقی سب تو آپ سے محبت کرتے تھے۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''ہاں کرتے تھے مگر تائی جان کی نفرت کا زخم اس قدر گہرا تھا کہ تم میں سے کسی کی محبت اُس پر مرہم کا کام نہیں دے سکتی تھی۔'' عمر کا لہجے میں درد وکرب اُمڈ آیا تھا۔

''مجھے نیند بہت آ رہی ہے اور ویسے بھی بچپن سے ہی تنہائی کا عادی ہوں میں اپنا کمرہ کسی کے ساتھ شیئر کرنے کا عادی نہیں ہوں۔'' وہ انتہائی سپاٹ لہجے میں بولا۔

صندل پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی جا رہی تھی۔ نئی نویلی دلہن کی اتنی بے عزتی شاید ہی کبھی ہوئی ہوگی۔ وہ آنسو سے بھری آنکھیں رگڑتے ہوئے بیڈ سے اُتر آئی وہ اپنا بھاری بھرکم لہنگا سنبھالتی دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ عمر کی آواز پر رک گئی۔

''یہ لو تمہاری منہ دکھائی کا تحفہ.....لوگوں نے بھی بیکار رسمیں نکال لی ہیں۔'' اُس نے سر جھٹکتے ہوئے انگوٹھی کی ڈبیا اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے حقارت سے کہا۔ صندل نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے وہ تحفہ اپنی مٹھی میں دبا لیا جیسے وہ جلتا ہوا کوئلہ عمر نے اُسے تھما دیا ہو۔

تکلیف اُس کے چہرے اور آنکھوں سے عیاں تھی۔ وہ دکھ بھری نگاہ اُس پر ڈالتی دروازے تک آ گئی۔

لائٹ اور دروازہ بند کر کے جانا' بچپن سے ہی اندھیروں کا عادی ہوں اس لیے اب روشنی اچھی نہیں لگتی۔'' کمرے سے جا۔ تے جاتے آخری حکم سنا تھا اور بھاری دل کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔

زندگی کے دامن میں نا جانے اور کتنے غم تھے چھپے صندل کا دل غم سے ڈوب رہا تھا۔ صبح بہت بوجھل تھی۔

رات کو دیر تک روتے رہنے کی وجہ سے نا جانے کب صبح کے وقت آنکھ لگی تھی۔ دروازے پر تیز دستک پر وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

''کتنی دیر سے میں دروازے پر دستک دے رہا ہوں، آواز نہیں آ رہی تھی تمہیں۔'' عمر کھا جانے والی نظروں سے اُسے گھورتا ہوا دھاڑا۔

صندل نے بمشکل اپنی سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے اُس کی بات سنی۔

''ہوش میں آ جائیں میڈم میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں اور ابھی تک ناشتے کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اور ان محترمہ کی نیند ہی ٹوٹنے میں نہیں آ رہی۔'' عمر اُسے بری طرح سے جھنجھوڑ کر بولا۔

''آفس؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''کیوں کیا ایسا ہو گیا ہے جو آفس سے چھٹی کر لوں اور اب فضول باتیں بند کرو میری شرٹ پریس کرو اور پھر ناشتہ تیار کرو۔'' وہ اُسے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔

صندل کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ تذلیل تحقیر کا یہ سلسلہ نا جانے کب تک چلنا تھا محبت کے سفر میں وہ بالکل تنہا اور نامراد تھی۔ اپنی بے بسی پر وہ صرف آنسو ہی بہا سکتی تھی اور اپنے اندر اُتار سکتی تھی کیونکہ آنسوئں کے سوا اب کسی چیز پر اختیار نہیں رہا تھا۔

''اور یہ گندی عادت جو تمہاری والدہ محترمہ نے تمہیں دیر تک سونے کی ڈالی ہے اِسے بدل ڈالو الارم لگا کر سویا کرو۔'' عمر بخشنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔

دروازے پر بیل بجی تو اُس نے دروازہ کھولا سامنے مہرین اور تائی جان کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا تھا۔ صندل کی ابتر حالی اب تائی جان کو جلائے گی تبھی مجھے سکون ملے گا۔'' سوچتے ہوئے دل خود خود مطمئن ہوگیا۔

''عمر بھائی! صندل آپی کہاں ہیں۔'' مہرین ناشتے کا سامان پکڑے پوچھنے لگی۔

''کیا ہوگیا ہے آتے ساتھ ہی طوفان مچا دیا ہے۔ آرام سے بیٹھو تمہاری چہیتی آپی شرٹ پریس کررہی ہیں۔'' عمر کاٹ دار انداز میں بولا۔

''کپڑے پریس کررہی ہیں کیوں آپ لوگ کہیں جارہے ہیں؟'' مہرین شوخی سے بولی۔

''ہم لوگ نہیں صرف میں جارہا ہوں وہ بھی آفس!'' عمر نے کہتے ہوئے تائی جان کے بجھے سوئے چہرے پر نظر ڈالی۔

تائی جان کی زبان کو آج تالا لگا تھا۔ آج وقت کی طنابیں عمر کے ہاتھ میں تھیں۔

''لیکن عمر بھائی آج تو آپ کی شادی کا پہلا دن ہے آپ آج آفس کیوں جارہے ہیں؟'' مہرین حیرت سے بولی۔

''کیوں ایسا کیا انقلاب آگیا ہے میری زندگی میں جس کے لیے چھٹی کرلوں۔'' عمر نے صندل کو آتے ہوئے دیکھا تو طنزیہ انداز میں بولا۔

ماں اور بہن کو دیکھ کر صندل ضبط نہ کرسکی اور اُن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اُس کو اس قدر روتا دیکھ کر نفیسہ بیگم کا دل لرز کررہ گیا تھا۔

''کیا ہوا صندل خوش تو ہے نا؟'' نفیسہ بیگم فکر مندی سے پوچھ رہی تھیں۔

''یہ جذباتی سین بعد میں فلمبند کروالینا...... مجھے دیر ہورہی ہے پہلے مجھے ناشتہ دو۔'' وہ صندل کو دیکھ کر غصے سے بولا۔

''امی آپ لوگ بیٹھیں پہلے میں عمر کو ناشتہ دے دوں۔'' وہ کہہ کر کچن میں چلی گئی۔

ابھی بھی عمر کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں پڑی تھی۔ وہ تائی جان کو مزید اذیت دینے کے ارادے سے واپس مڑا۔

''شام کو میرے کچھ دوست دعوت پر آرہے ہیں۔ کھانا ڈھنگ سے بنالینا شادی کے بعد پہلی دفعہ آرہے ہیں کہیں میری بے عزتی نہ کروادینا۔'' وہ کہہ تو صندل کو رہا تھا مگر دیکھ وہ تائی جان کا چہرہ رہا تھا۔ جس پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔ عمر کے جلتے سینے پر ٹھنڈک کا احساس بڑھتا جارہا تھا۔

اب احساس ہورہا ہوگا کہ رویوں اور باتوں کی اذیت کس درد دردناک ہوتی ہے۔ کتنا کٹھن ہوتا ہے طنز کے تیروں کو اپنے سینے پر جھیلنا...... سارا دن آفس میں تائی جان کا مرجھایا چہرہ اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں یاد آتی تو اُس کا دل خوشی سے لبریز ہوجاتا۔

☆......☆......☆

''عمر سب کچھ تیار ہوگیا ہے، مہمان کب تک آئیں گے؟'' وہ آفس سے لوٹا تو صندل نے اُسے خوشدلی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مہمان...... کون سے مہمان؟'' عمر حیرت سے بولا۔

''وہ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ آپ کے دوست دعوت پر آرہے ہیں۔'' اُس نے یاددہانی کرائی۔

''اوہ...... ہاں وہ دعوت تو کینسل ہوگئی تھی۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''کینسل ہوگئی تھی...... لیکن عمر میں نے تو بہت کچھ پکالیا ہے۔'' وہ فکر مند ہوئی۔

''تو کیا کروں اب وہ لوگ نہیں آرہے تو کیا اُن کو پھانسی کی سزا سنادوں۔'' عمر غصے سے ٹائی ڈھیلی کرتا ہوا بھڑک کر بولا۔

صندل اُسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔

''عمر......'' صندل کی آواز پر وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' وہ چڑ کر بولا۔

''عمر وہ کھانا پکاتے ہوئے میرا ہاتھ جل گیا تھا بہت تکلیف ہورہی ہے۔'' صندل کا چہرہ شدت درد سے سرخ ہورہا تھا۔

عمر نے دیکھا تو ہاتھ اچھا خاصا جل گیا تھا پل بھر کے لیے وہ گھبرا اٹھا۔

''ٹائم دیکھا ہے تم نے رات کے تین بجے کون سا میڈیکل اسٹور کھلا ہوگا۔ شام کو نہیں کہہ سکتی تھی۔'' عمر غصے سے بولا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا مگر شاید آپ نے دھیان نہیں دیا تھا۔'' صندل آہستگی سے بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے کرانا ہوگا یا داب عدالت نہ لگا کر بیٹھ جانا کہ اُس کی غلطی' اِس کی غلطی۔'' وہ غصے سے بڑبڑاتا گاڑی کی چابی پکڑ کر دوا لینے چلا گیا۔

دوائی تو صندل کو لاکر دے دی وہ تو آرام سے سوگئی مگر عمر تمام رات بے چین و بے قرار ہی رہا تھا۔ ضمیر نے عدالت لگالی تھی اور جب ضمیر کی عدالت میں انسان پیش ہوتو پھر پُرسکون نیند کیسے آسکتی ہے۔

اُسے رہ رہ کر پچھتاوا ہورہا تھا کہ دعوت تو صرف بہانہ تھی کسی نے دعوت پر نہیں آنا تھا۔ خوامخواہ صندل کو تکلیف پہنچائی۔ صندل تو جلے ہوئے ہاتھ کے ساتھ پُرسکون سوگئی تھی کیونکہ اُس کے ضمیر پر بوجھ نہیں تھا مگر عمر پھر سو نہ سکا تھا۔

☆......☆......☆

''ارے عمر یہ آپ کو سگریٹ پینے کی عادت کب سے پڑگئی؟'' صندل دھوئیں کی وجہ سے کھانستے ہوئے بمشکل بولی۔

''یہ بھی تمہاری والدہ محترمہ کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ جب دل دُکھا ہوتا تو اُس سے ہی بہلاتا تھا۔'' عمر خود اذیتی سے بولا۔

''عمر کب تک یوں خود کو اذیت دیں گے؟ اب تو اللہ نے آپ کی ہر محرومی دور کردی ہے۔ جب تک ماضی کو یاد کرتے رہیں گے یونہی تکلیف میں رہیں گے اور ماضی کے زخموں کو کھرچ کھرچ کر تازہ رکھنے والا کبھی خود پُرسکون نہیں رہ سکتا ہے۔ بظاہر وہ اوروں کو تکلیف دیتا ہے مگر اصل میں خود تکلیف میں رہتا ہے۔ زندگی سے شکوے نکال کر شکر کرنے کی طرف اب توجہ دیں۔'' صندل محبت بھرے انداز میں اُسے سمجھاتی ہوئی بولی۔

عمر جو کسی حد اُس کی بات سے قائل ہونے لگا تھا مگر انتقام کی چنگاری پھر سے بھڑک اٹھی۔ مثبت سوچیں دوبارہ سے منفی ہونے لگیں پھر وہ ہر بات کو نظر انداز کردیتا اور صرف انتقام انتقام ہی اُس کے من میں سمایا رہتا۔

گھر میں صندل سے مشینی انداز میں کام لیتا' چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہانہ بناکر اُس کی غلطیاں نکالتا' فجر کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹتی تو وہ اپنی کسی فائل گم ہوجانے کا بہانہ بناکر اُسے جگائے رکھتا......

یہاں تک کہ اُس کے جاگنے پر وہ پُرسکون رہتا اُسے اذیت پہنچا کر خوش ہوتا۔ ٹی وی کے

دریافت

انڈونیشیا کے سابق صدر سوئیکارنو کا قول ہے کہ 30 بہاروں کے بعد رَبر کا درخت اور بنتِ حوا کسی مصرف کے نہیں رہتے۔ جب کہ مرد کسی عمر میں حُسن سے مامون نہیں۔ ایسے مقولے کی تردید یا تائید ہمارے جیسے کا کام نہیں۔ سوئیکارنو تو بزرگِ مردم دیدہ و زن گزیدہ ہونے کے علاوہ صدارت کے صدمے بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم تو ان سے بھی محروم ہیں پھر یہ چھوٹے منہ کو بڑی بات زیب بھی نہیں دیتی۔ رَبر کے بارے میں ہم ابھی صرف اتنا دریافت کر پائے ہیں کہ غلطیوں کو مٹانے کے لیے خاصی کارآمد چیز ہے۔ رہی صنفِ نازک، سو اپنے محتاط و محدود مشاہدے کی بنا پر ہم کوئی خوب صورت جھوٹ نہیں بول سکتے۔ شیرنی کو کچھار میں کلیلیں کرتے دیکھنا اور بات ہے اور سرکس کے پنجرے میں بینڈ کی دُھن پر لوٹیں لگاتے دیکھنا اور بات! البتہ اپنے ہم جنسوں کے بارے میں بہت سے بہت کہہ سکتے ہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سائیں سائیں کرتا ریگستان جو راتوں رات جیتی جاگتی زمین کو نگلتا چلا جاتا ہے۔ لق و دق صحرائے اعظم جو سن رسیدہ سینوں میں دمادم پھیلتا رہتا ہے، وہ کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتا ہے کہ دل آنکھ سے پہلے بوڑھے ہو جایا کرتے ہیں۔ اس ہُو کے صحرا میں گونج کے سوا کوئی صدا، کوئی ندا سنائی نہیں دیتی اور کیکٹس (Cactus) کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ مرزا اس بنجر، بے رس، بے رنگ، بے اُمنگ دھرتی کو No Woman`s Land کہتے ہیں جس کی ملی جلی سرحدیں صرف بائی فوکل سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ بڑھتے ہوئے سایوں اور بھینی بھینی یادوں کی سرزمین ہے۔ جس کے باسی پیاس کو ترستے ہیں اور بے پیاس پیتے ہیں کہ انہیں ''اس کا بھی مزہ یاد ہے اُس کا بھی مزہ یاد!''

مشتاق احمد یوسفی کی تصنیف ''خاکم بدہن'' سے رازِ عدن، بحرین کا انتخاب

آگے بیٹھا دیکھ کر اُس پر برس پڑتا کہ گھر کتنا گندا ہو رہا ہے اور تم ٹی وی دیکھ رہی ہو۔ صندل سے دُگنا کام لینے کے چکر میں خانساماں اور ملازم کو فارغ کر دیا......

وہ ماں باپ سے ملنے کی فرمائش کرتی تو صاف انکار کر دیتا۔ چند دنوں میں صندل اُس کے سلوک کی وجہ سے مرجھا کر رہ گئی۔ گھر میں صندل کو نوکروں کی طرح کام کرتا دیکھ کر نفیسہ بیگم کا دل خون کے آنسو روتا تھا......

اُن کی ابتر حالت دیکھ کر عمر کے دل کو قرار سا آ جاتا تھا۔

نفیسہ بیگم کا جب بھی فون آتا تو عمر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر صندل کی بات نہ کرواتا۔

''بیٹا! میں جانتی ہوں میں نے تم پر بہت ظلم کیے ہیں مگر میرے گناہوں کی سزا میری صندل کو مت دو...... وہ تم سے بے حد محبت کرتی ہے...... وہ بالکل بے قصور ہے۔'' وہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔

ان کے یوں بے بسی سے رونے پر عمر کا دل و دماغ برف کی طرح ٹھنڈا ہونے لگتا۔ سکون روح کی گہرائیوں تک اترتا محسوس ہوتا۔ یہی تو وہ چاہتا تھا کہ اس مقام پر لا کھڑا کرے اُس عورت کو کہ وہ

بھی جان لے کہ کیسے دن رات جان سُلگتی ہے۔ کیسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر تڑپا جاتا ہے۔ اب اپنے دل پر چوٹ پڑی ہے نادر تو ہوگا۔'' وہ بے رحمانہ انداز میں سوچتا اور مسکراتا رہتا۔

☆......☆......☆

''عمر! ابو کا فون آیا ہے امی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' وہ آفس سے لوٹا تو صندل کو روتا ہوا پایا۔

''ہارٹ اٹیک؟'' عمر نے دوہرایا۔ صندل بھیگی آنکھوں سے اُسے تکنے لگی تھی۔

''میرا مطلب ہے وہ دل رکھتی ہیں...... اُن کے سخت پتھر دل پر کس چیز نے اٹیک کرنے کی ہمت کرلی۔'' عمر بے رحمی سے قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔

صندل اُسے صدمے اور افسوس سے دیکھ رہی تھی۔

''عمر یہ وقت نہیں ہے اِن باتوں کا مجھے امی کے پاس جانا ہے۔'' وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں چلے جائیں گے...... مگر پہلے ایک کپ چائے کا مل جائے گا۔'' وہ آرام دہ انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آپ اتنے ظالم اور بے حس ہوجائیں گے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا...... آپ نے نہیں جانا تو مت جائیں میں خود ہی چلی جاؤں گی۔'' وہ آنسو پونچھ کر دروازے کی جانب بڑھنے لگی تھی کہ عمر نے اُسے پکارا۔

''ضرور جاؤ میری طرف سے مکمل اجازت ہے لیکن دوبارہ اِس گھر میں آنے کی زحمت نہ کرنا...... طلاق کے کاغذات تمہیں جلد مل جائیں گے۔'' صندل اُسے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''عمر اتنی بڑی بات آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دی ہے۔'' وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ عمر کو پل بھر کے لیے ضمیر ملامت کرنے لگا تھا۔ اس سارے قصے میں صندل نے ناحق تکلیف اٹھائی تھی مگر صندل کا یہ جرم کم تو نہیں تھا کہ وہ نفیسہ بیگم کی بیٹی ہے...... انتقام کا جذبہ اُسے پھر سے تھپکنے لگا۔

دروازے پر بیل بجی...... عمر نے دروازہ کھولا تو مہرین کو سامنے کھڑا پایا۔

''صندل آپی کہاں ہیں...... میں انہیں لینے آئی ہوں۔'' وہ غصے سے کہتی اندر بڑھ گئی۔

''مہرین میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی...... عمر نے مجھے طلاق کی دھمکی دی ہے۔'' صندل اُس کے گلے لگتے ہوئے رونے لگی۔

''اوہ تو مجھے جس بات کا شک تھا وہی نکلی اس انسان سے اسی گھٹیا پن کی امید کی جاسکتی ہے۔'' مہرین نے عمر پر تنفر بھری نگاہ ڈالی۔

''اور آپی آپ، یہی تھا نا آپ کا 'دعویٰ محبت' کہ ایک نہ ایک دن آپ عمر بھائی کے پتھر دل کو موم کرلیں گی۔ امی کی زیادتیوں کا ازالہ کریں گی آپ کی بے پناہ چاہت ان کی اندر کی تلخیاں دور کردے گی۔ ایسے لوگ محبت کے قابل نہیں ہوتے......

آپ بہت غلط کررہی ہیں جو ابو کو ان کی اصلیت نہیں بتا رہیں نقصان اٹھائیں گی یہ اسی طرح شیر ہوتے رہیں گے۔'' صندل بے بسی سے آنسو بہا رہی تھی مہرین بولتے بولتے آبدیدہ ہوگئی۔

عمر بھائی کب تک آپ مظلوم ہونے کا راگ الاپتے رہیں گے امی سے انتقام لینے کی خاطر آپ نے صندل آپی کی زندگی اجیرن کردی ہے اس طرح تو آپ مظلوموں کی فہرست میں سے

نکل کر ظالموں میں شامل ہو چکے ہیں۔ امی سے انتقام تو آپ لے ہی رہے ہیں مگر کبھی سوچا ہے آپ سے انتقام کون لے گا وقت' قدرت یا پھر آپ کی اپنی اولاد...... دنیا بھری پڑی ہے اُن لوگوں سے جو ظلم وستم کے مارے ہیں مگر کیا سب اسی طرح تلوار لے کر میدان میں نکل آتے ہیں اپنا انتقام لینے کے لیے۔'' مہرین نے کہتے ہوئے طنزیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا تو عمر تلملا کر رہ گیا۔

'' میں صندل آپی کو لے کر جا رہی ہوں اور آپ کو طلاق دینی ہے تو شوق سے دیجیے آخر ابو کو بھی تو اپنے چہیتے بھتیجے کی اصلیت کا علم ہو۔'' مہرین نفرت سے کہتی صندل کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

نفیسہ بیگم کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی۔ صندل کے دل کو قرار آنے لگا۔

'' امی آپ کو بہت دعائیں دے رہی تھیں۔'' صندل نے عمر کا دل نرم کرنے کی کوشش کی۔

'' دعائیں واقعی...... اُن کی دعاؤں میں کب سے شامل ہو گیا میں، ہاں بددعاؤں میں سرفہرست رہا ہوں۔'' عمر تلخی سے ہنسا۔

'' نہیں عمر امی بہت بدل گئی ہیں۔'' وہ مجرموں کی طرح صفائی دینے لگی۔

'' محترمہ! اب اگر وہ بدلی ہیں نا تو میرے لیے نہیں بدلیں بلکہ اپنی بیٹی کے لیے بدلی ہیں کہ کہیں اُن کی زیادتیاں اُن کی لاڈلی کے آگے نہ آئیں جو دکھ انہوں نے مجھے دیے ہیں وہ اُن کی بیٹی کو پلکوں سے نہ چُننے پڑیں صندل میرے دل میں اُن کے لیے کبھی ہمدردی پیدا نہیں ہوگی تم بیکار میں اُن کی حمایتیں کرنا چھوڑ دو۔''

وہ نفرت سے کہتا ہوا اُٹھ کر چلا گیا۔

عمر کا زیادہ وقت اب باہر گزرنے لگا تھا صندل آدھی آدھی رات تک اُس کا انتظار کرتی رہتی۔ اِس مصروفیت کی وجہ پوچھتی تو عمر اپنی بدمزاجی کا ایسا مظاہرہ کرتا کہ وہ ضبط کر کے رہ جاتی۔

صندل میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ صندل کا دل خوش فہم ہو چلا تھا۔

'' صندل! تایا جان کے احسانوں کے سامنے مجبور ہو کر میں نے تمہیں اپنا تو لیا ہے مگر میں اپنی زندگی میں خلا سا محسوس کرتا ہوں ایک کمی جو مجھے بے چین رکھتی ہے میرا اور تمہارا رشتہ سوائے مجبوری کے کچھ نہیں ہے میں تمہیں طلاق دوں گا نہ ہی گھر سے نکالوں گا لیکن میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں...... زویا میری آفس کولیگ ہے میں تمہارے اور اپنے مصنوعی تعلق سے تنگ آ گیا ہوں۔''

عمر نے بے حسی کی انتہا کر دی تھی صندل آنکھوں میں حیرت اور اشک لیے اُس بے رحم کو تکتی جا رہی تھی۔ حیرت تھی کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

'' واہ عمر واہ...... آپ نے تو خوب انصاف کیا ہے پہلی بیوی کے حقوق فرائض جس خوبصورتی سے آپ نے ادا کیے ہیں آپ کو پورا حق پہنچتا ہے کہ آپ دوسری شادی کریں۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

'' میرے ساتھ ظلم کر کے آپ کا جی نہیں بھرا کہ امی کو اذیت دینے کا نیا منصوبہ بنا لیا ہے۔'' وہ کرب سے بولی۔

'' میں تمہارا لیکچر سننے نہیں آیا بلکہ تمہیں اپنا

فیصلہ سنا رہا ہوں۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ وہ کہہ کر جانے لگا تھا کہ صندل اُس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''عمر میری محبت میں کمی تھی آپ جیسے پتھر کو موم نہ کر سکی سب مجھے منع کرتے رہے کہ عمر سے محبت کے راستے میں صرف مجھے کانٹے ملیں گے مگر مجھے اپنی محبت پر بڑا زعم تھا کہ میں ان کانٹوں کو اپنی محبت اور خلوص کے لہو سے پھول بنالوں گی۔'' وہ آنسو بہاتی تلخ سا مسکرائی۔

''عمر میں آپ کی ہر زیادتی پر خاموش رہی کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی پھر شکایت کرتی بھی کیوں آپ سے محبت کا دعویٰ بھی تو میں نے کیا تھا کبھی ابو کو آپ کے بے رحمانہ سلوک کے بارے میں نہیں بتایا۔

مگر آج خاموش نہیں رہوں گی میں آج ابو کو آپ کی ہر زیادتی اور ظلم بتاؤں گی۔'' وہ غصے سے کہتی ہوئی فون کی جانب بڑھی۔ عمر کو اِس کے اِس ردِعمل کی توقع نہیں تھی بدحواسی میں اُسے زور کا دھکا دیا اور کسی قسم کا غور کیے بغیر گھر سے نکل گیا۔

رات کو دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا جب گھر پہنچا تو صندل کا وجود خون میں لت پت پڑا تھا۔ عمر کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔

☆......☆......☆

درختوں پر پرندوں کا شور شرابہ اُسے ماضی سے باہر نکال لایا تھا۔ شام ہو رہی تھی سرخی مائل آسمان اُس کے دل کو بوجھل کرنے لگا تھا۔ پرندوں کے غول کے غول اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں انتقام کی آگ نے اُس کے اپنے نشیمن کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ صندل کا خون آلود چہرہ آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگا تو وہ آسمان کی طرف بے بسی سے دیکھ کر رونے لگا تھا۔

''یا اللہ مجھ گناہگار کو ایک موقع دے دے۔ میرے گناہوں کو معاف کر دے مجھے ظالموں کی صف سے نکال کر اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے کا موقع عطا فرما مجھے میری محبت میری صندل واپس لوٹا دے۔'' وہ دعا کر کے بے تحاشا رونے لگا تھا کہ فون کی بیل پر چونک اٹھا۔

مہرین کا نمبر دیکھ کر اُس کا دل لرزنے لگا تھا۔ نا جانے مہرین کیا خبر دینے لگی تھی۔ کانپتے ہاتھوں اور لرزتے دل کے ساتھ اُس نے فون ریسیو کیا۔

''عمر بھائی، صندل آپی اب ٹھیک ہیں اب خطرے سے باہر ہیں۔'' مہرین کی آواز سن کر عمر کے دل کو قرار آنے لگا تھا اُس نے تشکر آمیز نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور صندل کو دیکھنے چل پڑا۔

''صندل میں تمہیں منالوں گا تمہارے ساتھ کیے گئے ہر ظلم کی تلافی کروں گا میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے بھی زندگی میں صرف تمہیں چاہا ہے......

تم سے نفرت کر کے میں ایک پل بھی سکون سے نہیں رہا......صندل تمہاری محبت جیت گئی اور میری نفرت ہار گئی......

میں تمہارے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کروں گا جس کی بنیاد نفرت پر نہیں محبت پر ہوگی ہم مل کر محبت کی آبیاری کریں گے کیونکہ مجھے نشیمن کو سجانا ہے۔'' صندل کے روم کی طرف بڑھتے ہوئے اُس کے قدموں میں تیزی آنے لگی تھی۔

زندگی مسکرا رہی تھی آنے والوں دنوں کا سوچ کر......

☆......☆......☆

افسانہ

سعدیہ سیٹھی

ایک ہی کمی ہے... تُو

''شافع تمہیں مجھ سے کتنا پیار ہے''۔ وہ لہروں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتا لیکن تمہاری محبت میں کیا کوئی پیمانہ بھی مقرر ہے''۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔ ''محبتوں میں پیمانے نہیں ہوتے''۔ وہ سنجیدہ تھی۔ ''پھر میری محبت کے لیے ''کتنا'' کا لفظ......

تیرے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو تیرا غم

آج کے دن کی ابتداء ہی بہت بری ہوئی تھی۔ صبح صبح بی بی جان کی خان دادا سے کسی بات پر جھڑپ ہوگئی۔ ''مسئلہ'' وہی تھا برسوں سے زیر بحث۔ ''شافع خان کو آپ ڈھیل پر ڈھیل دیتے جارہے ہیں۔ ماشاء اللہ دو سال سے اپنا کلینک چلا رہا ہے۔ اب تو تعلیم اور پریکٹس کے بکھیڑے بھی نہیں رہے۔ بس اب اسے شادی کرلینا چاہیے۔'' بی بی جان نے دوٹوک بات کی تھی۔

''جان گل۔ وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا''۔ خان دادا کا تحمل دیکھنے لائق تھا۔

''میرے کان پک گئے ہیں سن سن کر...... اب اسے ہماری سننا ہوگی۔ میں اپنے دل میں کوئی بوجھ لے کر جانا نہیں چاہتی۔ بس اب بہت ہوگئی ہے۔ اسے کہہ دیں فون کر کے آج شام تک ہر حال میں گھر پر ہو۔ بلائیں۔ رامز کو۔ ابھی فون کرائیں۔ بی بی جان نے رونا شروع کردیا تھا۔

خان دادا ابھی انہیں دیکھ کر پریشان ہوگئے اور رامز کے موبائل پر بیل دی تو رامز فوراً اپنے باپ کے سامنے حاضر ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شہنیلا بھی آگئیں۔

''بابا صاحب کیا بات ہے۔ بی بی جان کو کیا ہوگیا''۔ وہ ساس کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے سر سینے سے لگائے پوچھنے لگیں۔ حالانکہ خوب جانتی تھیں کہ ماں کا بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا شوق آج کل گرتی ہوئی طبیعت نے کس قدر ابھارا ہوا ہے لیکن بیٹا بھی ایسا کہ پہلے تعلیم کی آڑ، پھر پریکٹس کی آڑ لے کر انہیں ٹالتا رہا تھا۔ اب تو ماشاء اللہ دو سال سے اپنا کلینک کامیابی سے چلا رہا تھا۔ اب کون سا بہانہ کرتا۔

''شہنی چندا۔ شافع کو سمجھاؤ۔ رامز میرے بچے اس سے پوچھو کیا بات ہے۔ کیوں وہ ہمیں ستا رہا ہے''۔ بی بی جان ہلکا ہلکا کانپنے لگی تھیں۔

''بی بی جان۔ انشاء اللہ میں آج شافع سے فائنل بات کرتا ہوں۔ آپ دل پر نہ لیں''۔ رامز

نے بھی ماں کو حوصلہ دیا۔

''جان گل۔ آج ہم بھی اس نامعقول سے باز پرس کریں گے۔ آپ ہلکان نہ ہوں۔ اگر وہ آج ہی مان گیا تو کل کو آپ نے ڈانڈیا بھی کرنا ہوگا بیٹے کی مہندی میں۔ کول ہو جائیں پلیز۔ ورنہ طبیعت خراب میں خاک ارمان پورے کریں گی''۔

خان دادا کی بات سن کر سب ہی ہنس پڑے تھے۔ اچانک کمرے میں شاہ نور اور علیزے بھی پہنچ گئیں۔ ''بھئی ہم لوگوں کے بغیر یہ ڈانڈیا کون ڈال رہا ہے''۔ دونوں یک زبان ہو کر بولیں۔

''بچے یہ ڈانڈیا تمہاری بی بی جان ڈال رہی تھیں تمہارے ''کاکا'' کی شادی کی خوشی میں''۔ خان دادا نے مسکراتے ہوئے پوتیوں کو اطلاع دی تھی۔

''بی بی جان۔ یہ فاؤل ہے۔ ہمارے بغیر آپ ایک بھی اسٹیپ نہیں لے سکتیں۔ اوکے''۔ دونوں نے ان کو اٹھایا اور ماں کی سنگت میں گول گول خان دادا کی کرسی کے گرد چاروں گھومنے لگیں۔

''اوہو۔ علیزے، شاہ نور تم لوگ اسکول کو لیٹ ہو رہے ہو۔ معلوم ہے نا تمہاری وین کا ڈرائیور شاید فوج کا ریٹائرڈ حوالدار ہے۔ ایک منٹ لیٹ ہونے پر ''مجھے'' تم کو چھوڑ کر آنا پڑے گا۔ ہری اپ۔ جلدی کرو''۔

دونوں تیاریوں میں مصروف ہوگئیں۔ کچھ ہی دیر بعد سب کچھ معمول کے مطابق ہوگیا۔ علیزے، شاہ نور اسکول اور رامز آفس۔

☆......☆......☆

لاہور سے مسلسل سردی بڑھ جانے کی خبریں آرہی تھیں۔ وہ خبروں کو مسلسل سن اور دیکھ رہا تھا کہ پورا لاہور دھند کی لپیٹ میں ہے۔ اسے بی بی

جان کی بہت فکر رہتی تھی۔ ڈاکٹر تھا جانتا تھا ان کے لیے ایسی خفگی کس قدر نقصان دہ ہے مگر مجبور تھا وہ اس کے پاس آنے کو تیار نہ تھیں۔ ان کی ایک ہی ضد تھی شادی کرو اور لاہور میں سیٹل ہو جاؤ۔ اب تو بابا صاحب بھی ان کی ضد کے آگے مجبور سے ہو گئے تھے۔

خبریں سنتے سنتے وہ جلدی جلدی ناشتہ بھی ختم کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے ناشتہ ختم کیا اور موبائل کو چارجنگ سے نکال کر مس کالز چیک کیں۔ بابا صاحب کی مس کال دیکھ کر وہ فوراً ان کا نمبر ملانے لگا۔

''ہیلو۔ السلام وعلیکم بابا صاحب''۔ وہ فطری گرمجوشی سے گویا ہوا۔

''نامعقول...... کہاں ہوتے ہو؟'' بابا صاحب گرجے۔

''وہ بابا صاحب آج کل اسپتال میں ایمرجنسی لگی ہوئی ہے۔ اس لیے بہت کم فراغت ہوتی ہے''۔

''میاں صاحبزادے...... ابھی سے تمہیں اتنی مصروفیات ہو گئیں کہ گھڑی بھر اپنے ماں، باپ سے بات کرنے کا وقت نہیں''۔ وہ یاس سے کہہ گئے۔

''بابا صاحب۔ آپ نے کیسی بات کہہ دی۔ آپ نے مجھے جس پروفیشن میں کمانڈ دی ہے۔ اس کا تقاضہ ہی خدمت انسانیت ہے۔ بابا صاحب یقین جانئے پچھلے پانچ دن مسلسل ڈے نائٹ ڈیوٹی دی ہے اور کلینک کے لیے صرف ایک گھنٹہ دے پاتا تھا تاکہ ڈیلی پیشنٹس کو پرابلم نہ ہو۔ آپ تو میرے ہر پل ساتھ ہوتے ہیں اور بی بی جان تو میری ہر آتی جاتی سانس میں دعاؤں کے ساتھ شامل ہیں''۔ وہ جذب سے کہہ رہا تھا۔

''اچھا۔ صاحبزادے اب بس۔ بہت بولنے لگے ہو۔ جانتے ہو نا اب میں تمہاری بی بی جان کو کوئی بھی بہانہ بنا کر ٹال نہیں سکتا۔ اب گھر بسا ہی لو...... تمہاری شادی کو لے کر ہر وقت پریشان رہتی ہیں۔ کچھ خیال کرو۔ اب تم مزید وقت کا تقاضا نہ کرو اور بس جلدی سے خوشخبری سناؤ۔ تاکہ ہم بھی تمہاری شادی کے ارمان پورے کر سکیں۔ یار کچھ اپنی بھتیجیوں اور بھابھی کا ہی خیال کرو''۔

بابا صاحب مزے سے موڈ میں آ گئے تھے۔

ادھر اس کے چہرے پر سایہ لہرا گیا تھا۔

''بابا صاحب میں آپ کو بعد میں کال کروں گا۔ ابھی ذرا جلدی ہے۔ سب کو سلام کہیے گا''۔

ادھر بابا صاحب ''بات تو سنو، ہاں، ناں میں جواب تو دے دو''۔ کہتے ہی رہ گئے اور پھر فون ٹوں ٹوں کرنے لگا۔ موبائل ہاتھ میں لے کر وہ بالکل گم سم سا ہو گیا۔

''شادی''۔ یہ لفظ بھی اپنے اندر ایک زندگی رکھتا ہے۔ ''محبت'' چار حروف کی یہ مالا جس کے گلے پڑ جائے اس کی ساری زندگی، صبح و شام، چین سکون اس مالا کے گرد طواف کرتا رہتا ہے۔ وہ تو ایک بالکل سیدھا سادا سا میڈیکل اسٹوڈنٹ تھا۔ جانے کب سے رافعہ اپنے ہاتھ میں یہ مالا لئے اس کے نام کے دیپ جلا رہی تھی۔ اس دیپ کی ''لو'' اس کٹھور تک اب تک کوئی حرارت نہ پہنچا پائی تھی۔

میڈیکل اسٹوڈنٹس کا گروپ "A" لیب میں جمع تھا اچانک لائٹ چلی گئی حالانکہ روشنی کا خاصا انتظام تھا لیکن پھر بھی لیب میں اندھیرا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک رافعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف لے گئی۔ وہ اچانک پڑی افتادہ پر بھونچکا ہو گیا۔

''کیا بات ہے۔ رافعہ علی، اس طرح مجھے''۔ وہ پوچھنا چاہ رہی رہا تھا کہ اچانک رافعہ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ کانچ کی سلائیڈ اس کے ہاتھوں میں چار ٹکڑوں میں دبی ہوئی تھی۔ اس کی گلابی ہتھیلی میں گاڑھا گاڑھا خون نکل کر جمع ہو چکا تھا۔

اس نے بڑھ کر اس کی ہتھیلی اپنے ہاتھوں میں لے لی اور اس کے ہاتھ سے کانچ نکال کر ڈسٹ بن میں پھینکنے لگا ہی تھا کہ کسی خیال کے تحت جیب سے ایک چھوٹی پلاسٹک کی تھیلی نکال کر وہ ٹکڑے تھیلی میں ڈال لئے۔ ''چلو تمہاری بینڈج کرا دو''۔ وہ اسے لے کر لیب سے باہر آ گیا۔

''کیفے ٹیریا'' میں وہ دونوں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ رافعہ کو چائے پسند نہ تھی لیکن وہ شامخ کے ساتھ بیٹھنے کے لیے زبردستی چائے پی رہی تھی۔

''کیسے ٹوٹی تھی یہ سلائیڈ..... اتنا بڑا زخم ہاتھ میں لگا لیا''۔ وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

''اس زخم کے مقابلے میں کچھ نہیں جو آپ نے مجھے دیا ہے''۔ وہ گہری آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ گئی۔

وہ ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''کیا کہہ رہی ہو رافعہ میں کچھ سمجھا نہیں''۔ وہ واقعی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

''دیکھیئے میں آج کی لڑکی ہوں۔ آپ سے کچھ بھی لگی لپٹی نہیں رکھوں گی۔ گھما پھرا کر بات بھی نہیں کروں گی۔ سچ کہوں گی اور سچ ہی سنوں گی۔ آپ کے منہ سے .....'' وہ بغیر رکے سب کچھ کہہ گئی۔

''کیا بات کہنا چاہتی ہو''۔ وہ کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''مجھے نہیں پتہ کہ محبت، عشق کیا فلاسفی ہے۔ میں اتنا جانتی ہوں۔ آپ کو دیکھتے ہی میرا روم روم آئی لو یو I Love You کا ورد کرنے لگتا ہے۔ پہلی دفعہ میری زندگی میں ایسا ہو رہا ہے۔ سچی میرا پورا ایک سال اس کیفیت میں ہو گیا ہے۔ میں آج بہت مجبور ہو گئی تھی خود سے۔ ہاتھ میں سلائیڈ اس شدت سے دبائی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں شامخ۔ آپ نہیں جانتے میں ہر وقت آپ کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہوں۔ راتوں کی نیند اڑ چکی ہے۔ میں امتحان میں کامیاب بھی نہیں ہو سکتی کہ ہر وقت کتاب کھولتے ہی آپ سامنے ہوتے ہیں''۔ وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔ ''میں صرف آپ کی ہوں اور آپ صرف میرے''۔

اس کی ہچکیاں بندھ گئیں تھیں۔ کیفے میں رش نہیں تھا۔ ورنہ تمام لوگ اس وقت یہ منظر دیکھ رہے ہوتے۔ وہ گھبرا سا گیا تھا۔ جانے کون سے جذبے نے اسے اس کے ہاتھ تھامنے پر مجبور کر دیا۔ ''خاموش ہو جاؤ پلیز، لوگ دیکھ رہے ہیں''۔ اس نے بھی گردن جھکا لی تھی۔

''نہیں آپ وعدہ کریں کہ آپ صرف میرے ہیں''۔ وہ بضد ہو گئی۔

''بچوں جیسی باتیں نہ کرو رافعہ..... مان جاؤ شاباش''۔ وہ اس کے ہاتھ سہلانے لگا۔

''آپ پہلے ہاں کریں''۔

''کیوں کیا زبردستی ہے''۔ اب وہ صورتحال سمجھ رہا تھا اسی لیے یکدم شوخ ہوا۔

''ہاں زبردستی ہے''۔ رافعہ نے گردن کو اکڑا کر کہا۔ اب وہ رافعہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ معصوم سی گلابی گلابی موم جیسی لڑکی، گھنی پلکوں کے نیچے بڑی بڑی گہری کالی چمکتی آنکھیں۔ اس کا معصوم چہرہ اس کی تمام باتوں کی سچائی کا گواہ تھا۔

''اچھا اب چلتے ہیں۔ باقی باتیں بعد کے لیے اٹھا رکھو''۔ وہ اٹھ کر بل دینے چل دیا۔ اس نے بھی ایک فائل اور رجسٹر اٹھا کر گویا سامان باندھ لیا تھا۔

☆......☆......☆

واردات عشق رونما ہو چکی تھی۔ زندگی کا یہ رنگ شامخ کے لیے اس قدر عجیب اور نیا تھا کہ ہر وقت اس کی طبیعت میں ایک ترنگ سی آ گئی تھی۔ ہر وقت کتاب کا کیڑا بنا رہنے والا اب اکثر گنگنانے بھی لگا۔ تھا۔ اس کے کلاس میٹ بھی اس تبدیلی کو محسوس کر چکے تھے۔ رافعہ کی بے قراری تو پہلے ہی سے سب کے علم میں تھی مگر اب شامخ کے بدلے رویے کو سب نے جان لیا تھا کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

☆......☆......☆

وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ رافعہ کی محبت میں شدت بھی اتنی ہی زیادہ عروج پر پہنچ رہی تھی۔ رافعہ ایک بے انتہا جذباتی لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ اکثر عجیب عجیب حرکتیں کرتی۔ اچانک کلاس سے اسے لے کر اٹھ جاتی لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ کونوں میں اس کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیتی، جب تک وہ اس کے ماتھے پر بوسہ اس کی ضد سے مجبور ہو کر نہ دیتا وہ وارفتگی کے عالم میں ہاتھ چومے چلی جاتی تھی۔ ایسے وقت میں اسے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے اندر رافعہ کی محبت اور دیوانگی نے ایک خوف سا بٹھا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس دیوانی لڑکی کی محبت میں اس کے دل میں ایک نرم گوشہ تو پیدا ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ زندگی کا سفر کاٹنا بہت مشکل ہوگا۔ رافعہ کی دیوانی حرکتیں اس کی عادتیں، اس کی باتیں وہ ہر لمحے ایک آسیب کی طرح اس کی ذات سے چپکتی چلی جا رہی تھی۔ روشن مستقبل کا خواب اس مرتبہ کے فرسٹ سمسٹر رزلٹ نے دھندلا دیا تھا۔ اس کے نمبرز بہت ہی کم تھے۔ گھر سے باقاعدہ فون آتے تھے۔ سب ہی افراد ہونے والے ڈاکٹر کی ہر پروگریس کی خبر رکھتے تھے۔

رامز نے جب رزلٹ کا سنا تو اس کی طبیعت کی فکر لاحق ہو گئی اور وہ فوراً اگلی فلائٹ سے کراچی پہنچ گیا۔ بھائی نے بھائی کو جو کہ اس کا دوست بھی تھا ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ اتفاق سے اسی دن سر شام میڈیکل اسٹوڈنٹس نے ساحل سمندر پر پکنک کا پروگرام رکھا ہوا تھا۔ شامخ بھائی کو بھی انکار کے باوجود ساتھ لے گیا۔ رامز رافعہ کی دیوانگی کو محسوس کر رہا تھا۔ شامخ نے اسے نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کا بھائی ہے۔ لہٰذا وہ اسے بھی کالج ہی کا کوئی فرد سمجھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ٹھاٹھیں مارتا جھاگ اڑاتا سمندر سامنے تھا۔ تمام اسٹوڈنٹس ٹکڑیوں میں بٹ کر سمندر کی خوبصورتی کا لطف لے رہے تھے۔ اچانک باتیں کرتے کرتے رافعہ شامخ کو بہت دور لے گئی۔ زندہ سمندر آوازیں بلند کر رہا تھا۔

''شامخ تمہیں مجھ سے کتنا پیار ہے''۔ وہ لہروں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''میں نہیں جانتا لیکن تمہاری محبت میں کیا کوئی پیمانہ بھی مقرر ہے''۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

''محبتوں میں پیمانے نہیں ہوتے''۔ وہ سنجیدہ تھی۔

''پھر میری محبت کے لیے ''کتنا'' کا لفظ کیوں لگا رہی ہو۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیوں کتنی یہ تو شاید کوئی بھی نہیں بتا سکتا''۔ وہ سمندر کے شور میں کیا کچھ کہہ گیا اسے خود نہیں پتہ چل رہا تھا۔

''لیکن میں جانتی ہوں میں تمہاری محبت میں

سمندر کی آخری حد کو بھی چھو سکتی ہوں''۔ وہ اپنے ہی دھیان میں کہہ رہی تھی۔

''اوہو یعنی اتنی محبت ہے جناب کو ہم سے۔ دعوؤں سے بہلاؤ گی کیا۔ ثبوت بھی تو دو''۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر مسکرانے لگا۔

''میں ابھی ثبوت دیتی ہوں''۔ اس نے گھنیری پلکوں کے نیچے چمکتی کٹورا آنکھیں اٹھائیں اور اس کے ہاتھوں کو چوم کر سمندر کی آتی لہروں کی سمت چلنے لگی۔

''چھو کر جلدی آجانا مجھے کافی پینی ہے۔ اکٹھے پی لیں گے''۔ وہ ابھی بھی مذاق سمجھ رہا تھا۔ رافعہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ کافی کا آرڈر دے کر پیسے دے کر پلٹا تو رافعہ کا سر نظر آ رہا تھا اور ایک بڑی لہر آتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ رافعہ زندگی سے بہت دور چلی گئی۔

ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ پکنک پر آئے سب ہی اسٹوڈنٹس اس زندہ دل لڑکی کی موت پر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ شارخ کی حالت دیکھنے لائق تھی۔ رافعہ اس کی ساری محبت اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ شارخ کی زندگی کے کشکول میں اس نے اتنے تھوڑے سے عرصے میں یادوں کی وہ خیرات ڈالی تھی جو شارخ کی پوری زندگی گزارنے کے لیے کافی تھی۔

رافعہ نے واقعی سمندر کی آخری حد کو چھو لیا تھا۔ اسی لیے اس کی لاش بھی نہیں ملی تھی۔ رامز بھائی کی حالت پر پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ جتنے تسلی کے الفاظ اس کے پاس تھے وہ بھائی سے کہہ گیا تھا۔ مگر بھلا محبت کی موت تسلیوں سے بہل سکتی ہے۔ رامز کے جانے کے بعد وہ بہت اکیلا ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ رافعہ کی یادوں کے سہارے زندگی گزارے گا۔ وہ بھی تو اس کی محبت میں قربان ہوئی تھی۔ وہ دلجمعی سے تعلیم کی پناہ میں آ گیا۔ وہ ڈاکٹر بن کر انسانیت کے لیے خود کو وقف کر دینا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

مسلسل فون کی بجتی بیل نے اسے ماضی کے گرداب سے نکال باہر کیا۔ ''ڈاکٹر پلیز اآپ جلدی آئیں کوئی اور ڈاکٹر اس وقت موجود نہیں آپ ہی پر ہم بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ایک پیشنٹ بہت سیریس آیا ہے''۔ سسٹر زلیخا نے گویا التجا کی تھی۔ وہ تو ویسے بھی ہاسپٹل کے لیے نکل ہی رہا تھا۔ 'او کے آئی ول کم''۔ وہ جلدی سے دروازے کو لاک کرتا باہر نکل گیا۔

مریضہ کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ مطمئن ہو کر وہ راؤنڈ پر چلا گیا تھا۔ راؤنڈ سے واپسی پر وہ اپنے روم میں آ گیا۔ وہاں پر ڈاکٹر علینہ چائے پی رہی تھی۔ انہوں نے اس کے لیے بھی چائے منگوالی۔ ''ڈاکٹر شارخ۔ کیا خیال ہے کیا اتنی اونچائی سے گرنے کے بعد اس لڑکی کی یادداشت رہ سکے گی۔ ویسے ہی دھان پان سی ہے''۔ وہ تازہ کیس پر ڈسکس کر رہی تھیں۔

''ڈاکٹر...... یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر گرنے والا کیس یادداشت سے ''ری لیڈ'' ہو۔ آئی تھنک شی از آل رائٹ۔ ذرا ہوش آجائے تو پتہ چلے گا۔ اس کے چہرے پر پھیلا خون اس کے ناک اور منہ سے نکلا تھا جو آپ کو پریشان کر رہا تھا''۔

ڈاکٹر علینہ کے ڈر کی وجہ واقعی اس کا خون سے تر بتر چہرہ ہی تھا اور پھر پولیس کیس پرا کیلے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لڑکی سمندر میں پڑی لائی گئی تھی۔

اچانک ایک زوردار چیخ نے دونوں کو اٹھنے

پر مجبور کر دیا۔ یہ چیخ نئی مریضہ کے بیڈ سے آئی تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ ''نہیں جینا مجھے۔ مار دو مجھے۔ ہاں میں غلام علی شاہ کی بیٹی ہوں۔ جائز اولاد ہوں مار دو۔ پھینک دو سمندر میں''۔ نرس نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پھر ڈاکٹر کے کہنے پر ایک انجکشن لگا دیا گیا۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بھی چلا رہی تھی۔ مریضہ کی یادداشت نہیں کھوئی تھی۔

وہ ایک سولہ، سترہ سال کی بے حد خوبصورت نقش و نگار والی نازک سی لڑکی تھی اب جو ہوش آتے ہی اس کے منہ سے الفاظ نکلے تھے ان سے ہر شخص اس کی کہانی سننے کا منتظر نظر آتا تھا۔ شامخ نے سختی سے منع کر دیا کہ اگر اسے ہوش آ بھی جائے تو مجھے اطلاع دی جائے کوئی اس سے کسی بھی قسم کی بات نہیں کرے گا۔ اس کی آواز کی شدت میں وہ راقعہ کی محبت کی شدت تلاش کرنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

رات کو اسے ہوش آیا تھا۔ نرس نے آ کر اطلاع دی۔ وہ اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ گلوکوز کی سوئی نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''دیکھو۔ پلیز۔ اسے نہ نکالو''۔ وہ اس کے سر پر کھڑا تھا۔ وہ اچانک بالکل نارمل ہو گئی۔ ''میں ڈاکٹر شامخ ہوں اور آپ اس وقت میری پیشنٹ ہیں۔ ہم ایسا کرتے ہیں پہلے دوستی کر لیتے ہیں۔ باقی باتیں بعد میں''۔

اس لڑکی کے لیے جانے اس کے دل میں کیوں نرم گوشہ پیدا ہوتا ہی چلا جا رہا تھا۔ وہ خاموش ہی رہی کچھ نہیں بولی۔ بس ماتھے پر بل ڈالے سامنے ہی گھورتی رہی۔

''آپ نے مجھے کیوں بچایا؟'' بڑی دیر بعد اس نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک الجھا ہوا سوال کیا تھا۔

''یہ میرا فرض تھا اس لیے''۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

''نہیں ڈاکٹر۔ یہ آپ نے بہت غلط کیا۔ اب میں۔ میں تو بالکل اکیلی ہوں''۔ وہ بولنے لگی تھی۔ یعنی ڈاکٹر سے دوستی ہو گئی تھی۔ یہی تو وہ چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بولے ''اندر'' کو باہر لے آئے تاکہ اندر کا غبار باہر آئے تو وہ کچھ کھوج لگا سکے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ ''آپ کو خوشی ہوئی یہ سن کر''۔ وہ بہت سنجیدہ تھی۔

''نہیں۔ اچھا لگ رہا ہے تم کچھ کہہ تو رہی ہو''۔ اپنے بارے میں بتاؤ۔ مگر رکو میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ کہہ کر باہر آ گیا۔ اور پھر دودھ اور بسکٹ کا پیکٹ اس کے لیے اور اپنے لیے چائے کا کپ اٹھائے چلا آیا۔ ''پہلے کچھ کھا لو پھر باتیں ہوتی رہیں گی''۔

اسے بھی شاید بھوک لگی تھی یا زندہ رہنے کا تاوان سمجھ کر اس نے بغیر چوں چرا کے آدھا پیکٹ بسکٹ اور دودھ پی لیا۔ وہ اسے چور نظروں سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا معصوم چہرہ اس کی کہانی سننے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔

پیٹ میں کچھ پڑا تو گویا اس کے اندر حرارت نے شعلہ بھڑکایا۔ ''تم کچھ دیر آرام کر لو۔ یہ ٹیبلٹ لو''۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ کچھ بولنا چاہ رہی ہے لیکن اسے ابھی آرام کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے اس نے اسے آرام کرانا مناسب سمجھا اور پھر جب تک وہ سو نہ گئی وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے سونے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے روم میں چلا آیا۔ ڈیوٹی نرس کو اس کے متعلق ہدایات اس نے خاص طور پر دی تھیں۔

کرسی پر پشت ٹکائے دونوں ہاتھوں کے

سہارے سر پیچھے کیے وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا رافعہ نے اس کی آنکھیں آکر نرم ہاتھوں سے چھپالی تھیں۔ اس کی سوچ ٹوٹ گئی تھی۔ ایک جھرجھری سی لے کر وہ کسمسایا اور سیدھا ہو بیٹھا۔ ایک تو ڈیوٹی۔ دوسرے ایک نئی کہانی لیے نئی مریضہ اور پھر اس کی رافعہ کی یاد۔

ماضی کی یادوں نے آنکھوں سے نیند تو پہلے ہی اڑا دی گئی تھی مگر آج اسے بار بار رافعہ اپنے اردگرد اٹکھیلیاں کرتی نظر آرہی تھی۔

کسی کی یاد میں آنکھوں کو لال کیا کرنا
جسے بچھڑنا تھا اس کا ملال کیا کرنا
محبتیں تو فقط انتہائیں مانگتی ہیں
محبتوں میں بھلا اعتدال کیا کرنا

وہ واقعی اس کی محبت کو وقتی ابال سمجھا تھا لیکن اس کی محبت سچی تھی۔ وہ محبت پر قربان ہوگئی تھی۔ وہ محبت کی موت مر کر خود کو اس کے وجود کے ساتھ جوڑ گئی تھی۔ اس نے سرخ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ''رافعہ واقعی میں تمہاری محبت کی گہرائی اور شدت نہیں جان سکا تھا''۔ اس نے گویا اعتراف کرلیا تھا۔

راؤنڈ سے فارغ ہو کر اس کے کمرے کی طرف خود بخود اس کے قدم اٹھ گئے تھے۔ وہ کل کی طرح آج بھی دیوار کو گھور رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کچھ دوستانہ سی ہنسی اس کے لبوں پر آئی تھی۔ تبدیلی خوشگوار تھی وہ بھی اندر سے خوش ہوا۔

''دوا کھائی تھی ناشتے کے بعد یا نہیں''۔

''جی ہاں سسٹر کھلا گئی تھیں''۔ جواب ملا۔ اس کا بخار چیک کرنے کے بعد اس نے فائل پر کچھ انٹری کی اور پھر وہیں قریبی چیئر پر بیٹھ گیا۔

''کیسا فیل ہورہا ہے''۔ وہ نرم روئی سے گویا ہوا۔

''اگر میں بہتر بھی فیل کروں گی تو بھی کیا فائدہ۔ ڈاکٹر صاحب یہ زندگی کی رونقیں میرے لیے بیکار ہیں۔ کیونکہ زندگی پر حق ان کا ہے جو اپنے حسب نسب کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں''۔ وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔

''ڈونٹ بی ایموشنل ابھی عمر ہی تمہاری کتنی ہے جو ایسی بڑی بڑی باتیں کررہی ہو''۔ وہ اس کا دکھ جان تو رہا تھا لیکن اس وقت وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ ذہن پر زور دے اور تلخ یادیں اس کو پھر سے بکھیر دیں کچھ اور اس میں بہتری آجاتی تو یہ اس کے لیے بہت اچھا تھا۔ ابھی اس کے دماغ کو آرام کی ضرورت تھی۔

کوئی بھی شخص زندگی سے کنارہ کش بہت بے بس ہو کر ہوتا ہے۔ زندگی جیسی انمول دولت سے ہاتھ بہت شدید مجبوری کے تحت دھویا جاتا ہے۔ انسان زندگی سے فرار اس وقت اختیار کرتا ہے جب جینے کے سارے راستے بند ہوجاتے ہیں کبھی نہ کھلنے کے لیے۔ ادھر بھی شاید ایسی ہی کیفیت تھی اسی لیے ایسا ''کارنامہ'' انجام پایا ہوگا۔ پھر وہ خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ بھی واپس چلا گیا۔

دن جتنی دیر بعد روشن ہوا تھا رات نے اپنی چادر اتنی ہی جلدی تان لی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے اپنے فلیٹ پر گیا تھا اور پھر واپس آن ڈیوٹی ہوگیا۔

ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا تھا وہ اب ماشاء اللہ بالکل صحت یاب ہوگئی تھی۔ اس میں اس کی خاص دیکھ بھال کا دخل تھا۔ وہ گزشتہ رات اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اس کا نام ''رمشا'' تھا۔ وہ اپنی ماں کی جذباتی محبت کی نشانی تھی جسے دنیا میں لانے کا سبب غلام علی شاہ بنے تھے۔ صدیوں کی پرانی کہانی۔ وہی آقا اور لونڈی کی محبت جسے آقا اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے محبت کا چارہ ڈال کر

شادی کا دلاسا دے کر رام کرتا ہے اور مطلب نکل جانے پر اس کی حیثیت اس کی اوقات یاد دلا کر دور کر دیا جاتا ہے۔ محبت کی نشانی کو لیے لونڈی دکھ کے تپتے صحرا میں سفر کرتی ہے اور پھر زمانے کے خوف، آدم زادوں کی تہمت اسے ننگی، جلتی ریت پر رگیدتی ہے اور وہ نشانی اپنی کوکھ سے دنیا میں لے آتی ہے۔

اس کی نانی نے سولہ سال اس کی پرورش اپنے پروں میں لے کر کی تھی۔ لیکن جب آخری وقت آیا تو وہ اسے اس کا اصل بتا کر ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئیں۔ وہ بہت جذباتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ سنا تھا کہ وہ اسے جنم دے کر دنیا سے منہ موڑ گئی تھی۔ وہ اپنے اصل کی کھوج میں نکلی۔ بالکل اکیلی۔ لیکن غلام علی شاہ نے اس کو پہچان کر بھی ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا تھا اور ساتھ ہی بدچلن ماں کی ناجائز اولاد کا ایسا طعنہ مارا کہ اس کے دماغ کے چیتھڑے اڑ گئے۔ وہ خالی دماغ کے ساتھ جانے کتنے راستوں کی خاک چھانتی ساحل تک پہنچی تھی۔ جب وہ سمندر کی تیز آواز سنتی۔ ''ناجائز اولاد ذلیل عورت، بدچلن ماں کی تصویر''۔ یہ الفاظ اس زور سے اس کے کان میں دھماکہ کرتے کہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتی۔ اس کے لیے زندگی کی حقیقت دو کوڑی کی ہو گئی تھی۔ اس نے آسمان کی جانب دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''اے دونوں جہانوں کے رب۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ مجھے تو نے کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا وجود کیوں نہیں دیا۔ کیوں بے نام کر دیا مجھے نام والوں کی دنیا میں۔ میری ماں کا گناہ مجھے ہی کیوں بنایا۔ زندگی سے منہ موڑنا گناہ ہے لیکن۔ ناجائز اولاد کا دکھ اس وقت کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ مالک مجھے معاف کرنا''۔ اور پھر اس نے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی گود میں چھلانگ مار دی۔ زندگی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ جلد ہی ماہی گیروں کی ایک ٹولی نے اسے باہر نکال دیا۔ چلتے ہوئے سانس زندگی کے گواہ تھے۔ وہ اسے اسپتال لا کر بڑی نیکی کر گئے تھے۔

☆......☆......☆

اس کی کہانی واقعی بہت دکھی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا کہ رافعہ سمندر کی حدوں کو چھو کر واپس آ گئی ہو۔ اسے دیکھ کر اس نے اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیئے۔ اس مرتبہ وہ محبت میں پہل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا رافعہ سمندر سے رمشا کے روپ میں واپس آ گئی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے لاہور بابا صاحب کو فون ملایا۔

''بابا جان السلام وعلیکم''

''وعلیکم السلام۔ صاحبزادے ہم ٹھیک ہیں تم بی بی جان سے بات کرو''۔ انہوں نے بی بی جان کو موبائل دے دیا تھا۔

''ارے میرے چاند۔ بس اب تو مجھے بہو لا کر دے دے۔ تیری بھابھی اور بھتیجیاں۔ سب تجھ سے ناراض ہیں''۔ بی بی جان تو گویا اس کی منتظر ہی تھیں۔

''بی بی جان آپ کا حکم سر آنکھوں پر، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ارے چندا کیا کوئی لڑکی پسند کر لی ہے''۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ کو ایک سرپرائز دینا ہے۔ اگر ہو سکے تو آپ کراچی آ جائیں۔ رامز بھائی کے ساتھ۔ اچھا بی بی جان میں بعد میں کال کروں گا۔ ابھی ذرا جلدی ہے''۔ وہ فون بند کر کے رامز بھائی کا نمبر ملانے لگا۔ ''ہیلو بھائی جان۔ السلام علیکم''۔ اس نے مختصر وقت میں پوری بات ان کے گوش گزار کر کے ایک سکون کا سانس خارج کیا تھا۔

رامز نے بھی اسے دو دن میں کراچی پہنچنے کا کہا تھا۔ اس نے انتظار شروع کر دیا۔

☆......☆......☆

وہ اسپتال کے باہر اپنے باغ میں ٹہل رہی تھی، ڈاکٹر شامخ کی آمد کے ساتھ ہی وہ ان کے پاس چلی آئی۔ ''ڈاکٹر صاحب اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کب تک مجھے اسپتال میں رکھیں گے''۔ وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھی حالانکہ جانتی بھی تھی کہ اس ٹھکانے کے علاوہ فی الحال تو وہ بے گھر بے سائبان ہی تھی۔

''بس اسی ہفتے آپ کو چھٹی مل جائے گی''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

شام کو رامز سیدھا اسپتال ہی میں آ گیا تھا۔ دونوں بھائی کچھ خریداری اور ضروری کاموں کے سلسلے میں باہر نکلے تو رات گئے لوٹے تھے۔ رامز نے اس لڑکی کو دیکھا تو سمندر کی لہروں میں شامخ کا ہاتھ تھامے رافعہ ذہن میں آ گئی تھی۔ وہ بھائی کے فیصلے پر خوش تھا۔ ''آپ تیاری کر لو کل آپ کی چھٹی ہو جائے گی''۔ شامخ نے رمشا سے کہہ کر ہونٹ کو دانت تلے داب لیا تھا۔

وہ پژمردہ سی دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھلا کیا تیاری کرنا تھی۔ کپڑے جھاڑ باہر کھڑی اور کیا۔ اس کی سوچیں ''اب کیا ہوگا؟'' ہی کی گردان کر رہی تھیں۔ رات رمشا نے جاگ کر گزاری تھی۔ ''نام'' کی تلاش میں نکلی تھی۔ لیکن زندگی کی حقیقت عیاں ہوئی تو اس اسپتال میں۔ زندگی اتنی ہلکی پھلکی بھی ہو سکتی ہے۔ اسے یہاں آ کر پتہ چلا تھا۔

اسپتال سے جانے کے تصور نے گویا اس کے جسم سے لہو کا ہر قطرہ نچوڑ لیا تھا۔ صبح جب شامخ اس کے پاس آیا تو اس کی آنکھیں لال گلابی ہو کر رات کی کہانی سنا رہی تھیں۔

کیوں جاگتی رہیں رات بھر حالانکہ آج تو تمہیں یہاں سے آزادی مل جائے گی''۔ وہ ہنوز مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

''ڈاکٹر میں یہاں سے''۔ وہ کچھ بولتے بولتے رک گئی۔

''بولو۔ رک کیوں گئیں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے حوصلہ دیا۔

''ڈاکٹر میں جاؤں گی کہاں۔ سب کچھ میں آپ کو بتا چکی ہوں''۔ وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تمہاری اس پریشانی کا حل میں نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ تمہیں ہتھکڑی لگے گی۔ ساری عمر تم قید میں رہو گی''۔

وہ اس کی باتیں سن کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ''کیوں بچایا تھا مجھے کیوں مرنے نہیں دیا۔ میں پھر اکیلی اور بے نام ہو گئی ہوں آج''۔ اس کے اس طرح رونے نے اسے تڑپا کر رکھ دیا وہ تو اسے اچھی طرح ستانا چاہتا تھا آج، لیکن جلد ہی موم ہو گیا۔

''تمہیں اس لیے بچایا تھا۔ تاکہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کر لوں''۔ وہ اس کے قریب آ کر اس کے چہرے کو اٹھاتا ہوا بولا۔ سوجی آنکھیں گلابی ہو کر آنسوؤں سے چہرہ گیلا کرتے ہوئے اس کے حسن کو دو آتشہ کر رہی تھیں۔ ''رمشا تمہیں میں اپنا نام دوں گا۔ تم بے نام نہیں۔ بے نام تو وہ ہوتے ہیں جن کے دل دنیا کی دولت اور ہوس سے بھرے ہوتے ہیں۔ بے نام تو وہ ہوتے ہیں جو گناہ کو ثواب کرنے کے چکر میں خوف کی بولی لگاتے ہیں اور اپنے خوف کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے راستے کی ریت کی طرح ٹھوکر مار دیتے ہیں۔ تم آج سے رمشا شامخ خان ہو۔ شامخ خان کی زندگی ہو تم۔ تمہیں میں جلد ہی شادی کے بندھن میں باندھ کر

اپنی محبت کی قید کی سزا دوں گا۔ پیار کی ہتھکڑی تمہارے ہاتھوں میں ہوگی اور ہاں تم یہ سارے آنسو آج اور ابھی بہادو۔ آئندہ یہ آنسو ان آنکھوں میں نہ آئیں''۔ اس نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ وہ بھی مسکرانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

شام کی فلائٹ سے تینوں لاہور پہنچ گئے۔ ساری صورتحال رامز نے بی بی جان اور خان دادا کے گوش گزار کر دی تھی۔ بی بی جان اور خان دادا اس کے فیصلے پر بہت خوش تھے۔ واقعی اس نے انسانیت کی بے لوث خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا اور عملاً ثابت بھی کر دیا تھا۔

وہ جس لڑکی سے خواہشمند تھا۔ اس نے اس پر ترس نہیں کھایا تھا بلکہ اس سے محبت کے ساتھ شادی کر رہا تھا۔ شادی کی تیاریاں اسی دن سے خوب دھوم دھام سے شروع ہوگئیں۔ شہنیلا اپنی شاہنور اور علیزے کے ساتھ گرمجوشی سے مصروف ہوگئی تھی۔ پورے گھر میں نئے رنگ اتر آئے تھے ہر کونے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ رمشا ایسا سب کچھ دیکھ کر اپنی قسمت پر نازاں تھی۔

☆......☆......☆

آج مہندی کی رسم میں خوب ہلا گلا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے اپنے کمرے میں آنے کی فرصت ملی تھی۔ آج اسے رافعہ بڑی شدت سے یاد آئی تھی۔ وہ رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک نظم نے اس کے سامنے رافعہ کا وجود لا کھڑا کیا تھا۔

دل بھول نہیں پاتا
وہ خواب محبت کا
دل بھول نہیں پاتا
کیا بھید انوکھا ہے
جب سوچنے بیٹھو تو
کچھ یاد نہیں آتا
اک پل کے لیے، پھر بھی
وہ خواب محبت کا، دل بھول نہیں پاتا
دل بھول نہیں پاتا
بے چین جو گزری ہیں، راتیں تو بہت سی تھیں
کرنے کے لیے اس سے، باتیں تو بہت سی تھیں
وہ سامنے آیا تو سب بھول گئیں مجھ کو
سوچا ہے، بہت لیکن
کچھ یاد نہیں آتا
دل بھول نہیں پاتا

اس کی آنکھوں سے کون سے لمحے آنسو رواں ہوگئے تھے، اسے کچھ پتہ نہیں چلا۔ اچانک کسی نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے تھے۔ حنا کی خوشبو اس کے دل کو چھو گئی تھی۔ اس نے بڑھ کر حنائی ہاتھوں والی کو اپنے آگے کر لیا۔

رمشا کو آج شاید کوئی شرارت سوجھی تھی۔ اس نے سامنے موجود رمشا کے سراپے کو آنکھوں کے راستے دل میں اتار لیا۔ ''آج ستا لو۔ تمہیں، کل پوچھوں گا''۔ وہ اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے بولا۔ رمشا بری طرح گھبرا گئی تھی۔

''چھوڑیں مجھے۔ کوئی آجائے گا''۔ وہ ڈرتے ہوئے سارے رنگ چہرے پر لا کر لجا کر بولی تھی۔

''یوں بھئی اپنی ڈاکٹرنی کو پکڑا ہے۔ کسی کو کیا ہے؟ اگر کوئی آیا تو خود ہی چلا جائے گا''۔

اس نے رمشا کو دیکھ کر اپنے اندر کا موسم تبدیل کر لیا تھا۔ رافعہ کی جگہ۔ رمشا ایک ''حقیقت'' بن کر اس کا روپ لے کر آ گئی تھی۔ وہ رمشا پر محبتوں کی بارش کر کے اپنا آپ مکمل کرنا چاہتا تھا۔ رافعہ کے بعد پیدا ہونے والا خلا اب پر ہونے والا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

ندا حسنین

دیوتا

"کہو! کیا یہ یادیں اب بھی تمہارے اندر سانس نہیں لیتیں؟" اجنبی کے لبوں سے اک آہِ نیم کش خارج ہوئی وہ کھوئے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔ "کیا یاد دلا دیا تم نے...... وہ وادی نہیں ایک طلسم کدہ تھا۔ شاید وہ اُس دھرتی کی آخری وادی تھی۔ جس تک رسائی......

وہ اجنبی مسافر تھا جو غالباً اپنی راہ بھٹک کر پُراسراریت کا لبادہ اوڑھے اس جنگل میں آ نکلا تھا۔ وہ عجیب جنگل تھا نہ کوئی جھینگر بولتا تھا نہ ہی کسی ڈار سے بچھڑی کونج کی دہائی گونجتی تھی نہ کسی گوشے میں

ندی شور کرتی تھی۔ ہر سو تاریکی چنگھاڑتی خاموشی گونجتی اور وحشت راج کرتی تھی۔ ایسے وحشت ناک عالم میں جہاں تاریکی اتنی سیاہ تھی کہ بینا' نابینا میں کوئی فرق نہ چھوڑے دیتی۔ وہ اِس سیاہی کی انگلی تھامے' سرو قد پیڑوں کا سہارا لیے جنگل سے باہر نکلنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہا تھا۔

دفعتاً اُسے امید کی کرن دکھائی دی۔ آسمان کے بطن سے روشنی پھوٹتی تھی۔ اور پیڑ پودوں سے چھن چھن کرتی ہوئی جنگل کے ایک مخصوص حصے کو ہالے کی صورت میں روشن کیے دے رہی تھی۔ اتنی دیر سے تنہا بھٹکتے اور ٹھوکریں کھاتے اس کے بدن میں تھکاوٹ بھر چکی تھی۔ ناامیدی سرائیت کر چکی تھی۔ مگر اب سامنے کا منظر اُس کے دم توڑتے حوصلوں کو دوام بخش رہا تھا۔ وہ پُر جوش سا اس ہالے کے اندر داخل ہوا۔ جنگل میں وحشیانہ رقص کرتی تاریکی نے ایک ادا سے اُسے ہالے کے اندر داخل ہوتے دیکھا اور اُس کے اردگرد دھمال ڈالنے لگی۔ نور کے ہالے کے بیچوں بیچ آبنوسی لکڑی کے پنجرے میں قید قد آور آئینہ ایستادہ تھا جس پر صدیوں کی دھول جمی ہوئی تھی۔ اُس کی بناوٹ قدیم زمانوں کی داستان سنائی نظر آتی تھی۔

وہ مسحر نگاہوں سے آئینے کو تکتا اُس کے مدِ مقابل آ کھڑا ہوا۔ آئینے کی سطح پر مٹی کی ایک دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ جو آئینے کے دیدار سے محروم رکھتی تھی۔ اجنبی نے اپنے دامن سے دھول مٹی کو صاف کیا۔ آئینے کی چمکدار سطح واضح ہوئی۔ اجنبی نے سطح پر ہاتھ پھیر کر اُس کی طویل العمری کا اندازہ لگانا چاہا۔ مگر وہاں ایک آشفتہ مُو شخص کی تصویر ابھرنے لگی۔ اُس کا تن خاکی رنگ کے مٹیالے سے لباس نے ڈھانپ رکھا تھا' اِس کے بھورے بال بے ترتیب انداز میں اُس کی جبیں پر بکھرے ہوئے تھے۔ خشک پپڑی زدہ لب پیوست باہم تھے۔ یوں جیسے کبھی وا نہ ہوئے ہوں۔ اُس کی بڑی سیاہ آنکھوں میں لالی تیرتی اور وحشت برستی نظر آتی تھی اور اُس کی نگاہیں مقابل کھڑے اجنبی پر جمی ہوئی تھی۔ اجنبی بدک کر کچھ قدم پیچھے جا ہٹا۔

''کون ہو تم؟'' اجنبی نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے جاننے میں تمہیں کچھ وقت لگے گا دوست...... پہلے کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔ چلو تمہاری بات کرتے ہیں۔'' آشفتہ مُو کے اس دعویٰ نے اجنبی کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر ڈالا۔

جنگل کی پُر اسرار تاریکی اور سیاہ رات کے آسیب کے خوف کا اثر نور کے اس ہالے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی رفتہ رفتہ اُس کے اندر سے زائل ہونے لگا تھا۔ وہ وہیں حیرت زدہ سا پیڑ سے پشت ٹیکائے آئینے کی جانب چہرہ کیے بیٹھ گیا اور مارے تجسس کے سوال کرنے لگا۔

''بھلا بتاؤ کس حد تک جانتے ہو مجھے؟''

''آخری حد تک۔'' آشفتہ مُو نے اطمینان سے جواب دیا۔

اجنبی مسافر کچھ دیر سوچتے ہوئے سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے کہنے لگا۔

''تم دعویٰ تو بہت خوب کرتے ہو۔ مگر میں کیسے مان لوں کہ تم میرے حوالے سے آخری حد تک باخبر ہو۔'' آشفتہ مُو کے پپڑی زدہ لب مسکرائے اور مسکرانے سے ان میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ جیسے شاید مسکرانے کے عادی نہ ہوں۔ اُس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''تمہارے من میں کچھ ایسی یادیں دفن ہیں۔ جو آج بھی تمہارے اندر سانس لیتی ہیں۔ اگر تم کہو تو تمہارے سینے میں دفن اُن یادوں کو بے پردہ

کروں؟'' اجنبی کو آشفتہ مُو کی سرگوشی میں للکار کی بُو محسوس ہوئی۔ من میں دعوئ کو آزمانے کی خواہش نے سر اٹھایا اس لیے جھٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آشفتہ مُو ایک بار پھر مسکرایا اور پھر اگلے ہی پل آئینے کی سطح سے معدوم ہوتا چلا گیا۔ سطح پر اب وادی کا منظر کھلنے لگا۔ وہ وادی فلک بوس پربتوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ پہاڑوں کے سیاہ حجم سے اترتا نیلگوں اندھیرا رفتہ رفتہ اپنے پر وادی میں پھیلاتا چلا جارہا تھا۔ فضاء ڈھول کی تھاپ پر مردانہ 'ہو ہو' کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔ بھیرسا کے چاروں اطراف سوکھی لکڑیوں کو بھڑکا کر الاؤ روشن کیا گیا تھا۔ اور اس کے شعلے نیلگوں اندھیرے میں لالی بکھیر رہے تھے۔ وہاں مقامی مرد گلے میں ڈھول لٹکائے زور زور سے پیٹتے اور بلند آواز میں 'ہو ہو' کی صدا لگاتے۔ اُن میں سے ایک شخص آنکھیں موندے کسی قدیم گیت کی دھن بجائے جاتا تھا۔ بھیرسا کے عین وسط میں دیوتائی رتھ ایستادہ تھی اور اس رتھ پر ایک نوجوان انتہائی رعونت کے ساتھ براجمان تھا۔

وہ وجاہت میں سب کو مات دیتا مضبوط جسامت اور بلند قد وقامت کا مالک تھا۔ اُس کی بڑی سیاہ آنکھوں میں سحر چھپا تھا۔ جو دیکھنے والوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر اپنا غلام بنا ڈالتا۔ وہ اس وادی کا یزدان تھا اور نیکی و بدی کے حساب کتاب سے آزاد تھا۔ جائز و ناجائز کے اصول اُس پر لاگو نہ ہوتے تھے۔ وہ یہاں کا دیوتا تھا اور وادی کے باسی اُس کے پجاری...... دیوتا کے اِردگرد گلابی پریاں جھومتی تھیں اور وہی قدیم گیت گنگناتی تھیں جس کی دھن بانسری پر بجتی تھی۔

اُن کے بال مینڈھیوں کی صورت اُن کے شانوں پر پڑے تھے۔ اُن کی گہری نیلی آنکھوں کے گرد سیاہ بیل بوٹوں کے نقش ونگار بنے تھے۔ اُن کا حسن ہوش رُبا تھا۔ دیوتا کی بے باک نگاہیں اُن کے رنگین ریشمی پوشاک میں مخفی' جھومتے سنگِ مرمر کے ابدان سے لپٹ لپٹ جارہی تھی۔ اُس کے اندر کی بے تابی اُس کے چہرے پر عیاں تھی اور وادی کے باسی اُسے مسرور دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ وہ بھیرسا کے چاروں اطراف دوزانوں بیٹھے تھے اور اُن کے درمیان اجنبی بھی شامل تھا۔ اُس کے بدن کی مٹی پر گزرے برسوں کی لکیریں ناپید تھیں۔ وہ بھرپور جوان اور توانا نظر آرہا تھا۔ دیوتا کا وجود اُس کی آنکھوں میں چبھتا تھا۔ ناگواری اُس کے چہرے پر عیاں تھی۔ مگر وہ گلابی پریاں ساحرائیں تھیں۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُن میں سے ایک ساحرہ کی سحرانگیز نگاہیں شعلوں کی مانند بار بار اُس کی جانب لپکتی تھیں۔ اُس کے اندر ایک عجیب نوع کی بے کلی جاگ اٹھی۔ دل میں خواہش مچلتی کہ شعلہ جوالہ کو اپنی بانہوں میں قید کرکے للکارے کہ اے دلربا اب ڈھا ستم...... فاصلوں سے کیئے گئے حملے وہ مزہ نہ دیتے۔ تو قریب آ' پھر کر ستم' کہ اس ستم کا مزہ دونوں چکھیں۔

دیوتا نے اشارہ کیا۔ چاروں اطراف بیٹھے وادی کے باسی اپنی جگہوں سے اٹھے اور نظریں جھکائے دیوتائی رتھ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں میں پھلوں اور میوؤں سے لدی بید کی ٹوکریاں اور دودھ سے لبریز پیتل کی پیالیاں تھیں۔ وہ دیوتا کے اشارے پر باری باری اُس کے حضور سوغات پیش کرتے۔ سوغات کی رسم کے بعد دیوتا رتھ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ فضاء میں یکدم خاموشی تیرنے لگی۔ ساحرائیں سر جھکائے باندی بنی ایک قطار میں جا کھڑی ہوئیں۔ وہ سب دم سادھے دیوتا کے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ دیوتا کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور اشارہ ہوا۔ قطار سے اُن لڑکیوں کو علیحدہ کرلیا گیا جن کی جانب اشارہ کیا گیا تھا۔ دیوتا اپنے اوطاق کی جانب بڑھنے لگا۔ دو اشخاص اُن علیحدہ کی

گئی لڑکیوں کو دیوتا کے لے کر پیچھے چلنے لگے۔ دیوتا اور ساحرائیں اوطاق کے اندر داخل ہوئیں۔ اوطاق کا لکڑی کا دروازہ بند ہوتا چلا گیا۔ اندر دیے بجھنے لگے۔ الاؤ میں بھڑکتے شعلے دم توڑنے لگے۔ وادی والے خوش باش اس امید پر اپنے گھروں کو لوٹنے لگے کہ آج کی حسین رات کی بدولت دیوتا اِن سب پر ضرور اپنے کرم کی بارش کرے گا۔

اجنبی کو وادی والے نابینا طائر معلوم ہوئے تھے جن کی آنکھوں میں جہالت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مگر وہ دیوتا کو ننگی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ دیوتا کے مکھوٹے کے پیچھے چھپا اُس کا بدصورت چہرہ اُسے صاف نظر آرہا تھا۔ منظر ایک بار پھر سے دھندلاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ آئینے کی سطح صاف ہوگئی اور اُس پر آشفتہ مُو کا سراپا پھر سے نمودار ہوا اور کہنے لگا۔

''کہو! کیا یہ یادیں اب بھی تمہارے اندر سانس نہیں لیتیں؟'' اجنبی کے لبوں سے اِک آہِ نیم کش خارج ہوئی وہ کھوئے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔

''کیا یاد دلا دیا تم نے...... وہ وادی نہیں ایک طلسم کدہ تھا۔ شاید وہ اُس دھرتی کی آخری وادی تھی۔ جس تک رسائی حاصل کرنا جان جوکھوں میں ڈالنا تھا۔ اُس وادی کے باسی پتھر کے زمانے کے معلوم ہوتے تھے۔ اور وہاں کی دوشیزائیں ساحرائیں تھیں ساحرائیں......!''

''اور اُس میں سے ایک ساحرہ کے سحر کا شکار تو تم بھی ہوگئے تھے۔'' آشفتہ مُو نے اجنبی کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے چھیڑا۔

''اوہ! تو تم اِس راز سے بھی واقف ہو۔'' اجنبی مسکرایا۔

''کہا تو ہے تمہارے ہر معاملے سے باخبر ہوں۔'' آشفتہ مُو نے ایک بار پھر یاددہانی کرائی۔

مگر اجنبی اُس وقت ساحرہ کی خوش کن یادوں میں غرق ہو چکا تھا۔

''وہ بے حد حسین تھی۔ اُس کی ہنسی کی کھنک قدیم زمانوں کی دیویوں کی گنگناہٹ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے مرمریں بدن کے پیچ و خم، نشیب و فراز...... آہ! تمہیں بتلاؤں کہ اُس کا حسن نہ معصومانہ تھا نہ قاتلانہ وہ حسن تو کافرانہ تھا۔ کفر پر مجبور کر ڈالنے والا، اُس کی دلنشین شباہتیں مرگ نین، اُس کے عشق کا خمار آج بھی میرے دل میں ایک ہوک کی طرح اٹھتا ہے۔'' اجنبی ایک جذب کے عالم میں کہتا چلا جا رہا تھا۔

آشفتہ مُو اُس کے شدتِ جذبات کو دیکھتے ہوئے کہہ اٹھا۔

''کیا تم اُسے دیکھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں!'' اجنبی نے بے اختیار اثبات میں سر ہلایا۔ یوں جیسے اُس کے دل میں برسوں سے دبی خواہش آج بر آئی ہو۔ آئینے کی سطح پر وادی کا منظر ابھرنے لگا۔ اجنبی مبہوت سا اس منظر کو دیکھتا چلا گیا۔ وہاں کسی فلم کی مانند منظر ابھرتے جا رہے تھے۔ اجنبی کبھی اس ساحرہ کے ہمراہ پربتوں کے سینے میں دامِ الفت بھرتا تو کبھی شور کرتی ندی کے کنارے سرگوشیاں اور کبھی وادی کی کچی پگڈنڈیوں پر مرمریں ہاتھوں کو تھامے عہد کرتا۔ اس ساحرہ کی ہنسی فضا میں مندر کی گھنٹیوں کی صورت بلند ہوتی۔ مبہوت اجنبی کے چہرے پر غم و یاس کی لکیروں نے راستہ بنا ڈالا۔ وادی کے جان فزاء مناظر دم توڑتے چلے گئے اور آئینے کی سطح پر ایک بار پھر آشفتہ مُو کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔

''تم آج بھی اُسے بھول نہ پائے۔'' آشفتہ مُو نے اجنبی کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے رائے زنی کی۔

''ہاں...... میں اُسے نہیں بھولا! وہ ایک گزری

ہوئی داستان ہے اور میں اسی میں ٹھہر گیا ہوں۔''
اجنبی شائد یادوں کی مسافت سے ہانپ گیا تھا۔
تب ہی اُس کے لہجے میں تھکن در آئی تھی۔

''میں جانتا ہوں اُس کا غم تمہیں ہلکان کیے دیتا تھا۔ تم اُسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔'' آشفتہ مُو کی بات پر اجنبی آنے والے لمحات کو بھانپ گیا۔ سو جلدی سے بول اٹھا۔

''اوہ تو کیا تم وہ سب کچھ بھی دکھانے والے ہو۔ نہیں! اُن یادوں کو نہ کھنگالو۔ وہ یادیں زہریلے ناگ کی طرح ڈستی ہیں۔ میرے سینے میں دفن ہیں پر میں اُن سے منہ موڑے ہوئے ہوں کہ اب اتنا یارا نہ رہا کہ انہیں یاد کر کے آہ وفغاں کروں۔ ماتم کناں ہوں۔'' اجنبی اس سے التجا کر رہا تھا۔ مگر اُس کی التجائیہ نگاہیں خالی گئیں۔ آشفتہ مُو جا چکا تھا۔ اور نیلگوں وادی کا منظر دوبارہ ابھرتا تھا۔ ڈھول کی تھاپ ہو ہو کی صدائیں' قدیم گیتوں کی الوہی آواز پر بتوں سے ٹکراتی فضاؤں میں بازگشت کرتی۔ شعلے بھڑکتے بلند ہوتے معدوم ہوتے۔

دیوتا اپنی رتھ پر کروفر کے ساتھ براجمان تھا۔ رقص و سرور کی محفل جاری تھی۔ نابینا طائر اپنی سوغات نچھاور کر کے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ ان سب کے درمیان اجنبی بھی موجود تھا۔ اُس کے چہرے پر آج بھی دیوتا کے لیے ناپسندیدگی کے تاثرات جھلکتے تھے۔ مگر اُس کی نگاہیں اس ساحرہ کے سحر آگیں وجود کا طوائف کر رہی تھیں اور یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ الف لیلیٰ آنکھ مچولی دیوتا کی زیرک نگاہوں سے مخفی رہتی۔ جوں جوں ڈھول کی تھاپ اور ہو ہو کی صداؤں میں شدت آتی جاتی' ساحراؤں کے رقص میں ہیجان خیزی در آتی۔ اجنبی کو اپنا دم نکلتا محسوس ہوتا۔ اور دیوتا کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں کھنچ جاتیں اور پھر اچانک حکم صادر ہوتا۔ ساحراؤں کے قدم تھم جاتے۔ دھم دھم بجتے ڈھول مردہ ہو جاتے اور ہو ہو کرتے پجاری پتھر کے ہو جاتے۔ چاروں اطراف بیٹھے نابینا طائر سر جھکائے کھڑے ہو جاتے۔ اس بار فیصلہ عجب ہوا تھا۔ صرف ایک ساحرہ کو منتخب کیا گیا تھا۔ دیوتا کے نفس کی آگ بجھانے کے لیے آج ایک ہی ساحرہ کافی تھی۔ وہ اختیار بدست تھا۔ ساحرہ کی ہرنی جیسی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرائے اور وہ بے اختیار اجنبی کی جانب اٹھیں۔ اجنبی کے چہرے کی رنگت سرخ اور اعصاب تنے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ نابینا طائر کے مجمعے سے دو اشخاص حکم بجا لاتے ساحرہ کی جانب بڑھے دیوتا کی نگاہیں اجنبی کے جوش کھاتے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اُس کی نگاہوں میں پنہاں جیت کا خمار مدمقابل کے لیے آتش افروز ثابت ہوا۔ ساحرہ پر نگاہ کی مرگ نین میں بغاوت جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کر گئی۔ اور فضا پر چھائے سکوت کو چیرتی پاٹ دار آواز آئی۔

''جاؤ تم اُسے نہیں لے جاسکتے، اُس کی مرضی نہیں تمہارے ان فرسودہ رواج پر اپنی عزت پامال کرنے کی۔'' نابینا طائر نے خوف زدہ انداز میں جبکہ دیوتا نے قہر آلود انداز میں آداب شاہانہ سے بے بہرہ اس شخص کو دیکھا۔

''تم لوگ نابینا طائر ہو' تمہاری آنکھوں میں نور بستا ہے مگر وہ اتنا بے بس کہ نہ تمہیں دکھائی دیتا ہے نہ سجھائی دیتا ہے۔ تم نے اپنی عقل کو اِن جاہلانہ رواج کی پاسداری کے عوض گروی رکھوا دیا ہے۔ ایک معمولی انسان کو آفریدگار بنا کر خود آفریدگاں بنے بیٹھے تھے۔ نری جہالت' نرا ظلم تم لوگ اپنی ہی جانوں پر کر رہے ہو۔'' اجنبی کی شعلہ بیانی پر نابینا طائر تھر تھرا اٹھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کرنے لگے کہ اے آزاد منش! خاموش رہ' یہ ہمارا

دیوتا ہے اس پر سب جائز ہے سب قربان ہے۔"
مگر اجنبی آج بغاوت پر آمادہ نظر آتا تھا سو سینہ تانے بے خوفی سے کہتا چلا گیا۔
"یہ دیوتا تمہارا اپنا بنایا ہوا ہے۔ میری نظر میں یہ ایک بھٹکا ہوا بے ہودہ انسان ہے۔ جسے تم اپنا خون پلا پلا کر پال رہے ہو۔ نہ صرف اسے بلکہ اُس کے نفس کو بھی ایک خون آشام بلا کا روپ دے چکے ہو۔" اجنبی کی کڑے کمان کی تیر ایسی آواز سب پر حاوی تھی۔ دیوتا نے ایک قہر آلود نگاہ پہلے اجنبی اور پھر نابینا طائر پر ڈالی۔ وہ سب لرز اٹھے۔
"اے آزاد منش سنبھل جا! یہ تیری نہیں ہماری دنیا ہے۔ یہاں بہکی بہکی باتیں نہ کر' ایسا نہ ہو دیوتا کا قہر تجھ پر ٹوٹے اور آسمانی گولا تجھے آلے۔" مجمعے میں سے ایک نابینا طائر آگ بگولہ ہوتا اجنبی کے مدِ مقابل آ کھڑا ہوا۔ مجمع اس کی تائید کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ دیوتا کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
"تمہارا دیوتا کوئی آسمانی جاہ نہیں جو کوئی آسمانی گولا مجھ پر برسے' مجھے تمہارے اس خبیث دیوتا سے کوئی خوف نہیں۔ میں آج کسی کی آبروریزی نہ ہونے دوں گا۔" اجنبی نے نڈر ہو کر ساحرہ کی جانب دیکھا۔ اُس کی ممنون نگاہیں آخری بار دبریں ہمت مردانہ کا پیغام دیتی تھیں۔
"اے گستاخ! تُو نے شاید ہماری قربان گاہیں نہ دیکھیں اب تک...... ورنہ تجھے معلوم ہوتا وہاں جانوروں کے ہی نہیں تجھ جیسے گستاخوں کے خون کے چھینٹے بھی موجود ہیں۔" ایک اور شخص دھمکی آمیز لہجے میں اجنبی کو مخاطب کرتے آگے بڑھا۔ معاملہ سنجیدگی اختیار کر چکا تھا۔ نابینا طائر دیوتا کے بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اجنبی کے ساتھ اب اُن کا معاملہ ہُما شُما کا بن چکا تھا۔ دیوتا دلچسپی سے کبھی بے بس ساحرہ تو کبھی اجنبی سے اُلجھتے مجمع کو دیکھ رہا تھا۔
وہ اس وادی کا دیوتا تھا اور اس ہیبت کزائی میں پلڑا اسی کا بھاری تھا۔ وادی والے نابینا طائر تھے جو جہالت کے پنجرے میں قید ایسے پرندے تھے جو آزادی کا نام سن کر توبہ توبہ کرتے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوا وہوس کے دیوتا کی جے جے کار فضا میں بلند ہوئی۔ دیوتا ایک استہزائیہ نگاہ اجنبی کے ارزاں وجود پر ڈالتا اپنے اوتاق کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے غلام ساحرہ کو دونوں بانہوں سے جکڑے اُس کے پیچھے ہو لیے۔ ڈھول کی تھاپ ایک بار پھر بلند ہوئی۔ ہو ہو کی صدائیں فضا میں گونجنے لگیں۔ نابینا طائر دیوتا کی جنگ جیتنے پر بے حد خوش تھے۔
"آہ!" ایک لرزتی ہوئی سسکی جنگل کی خاموشی کو چھیڑ گئی اور آئینے کے منظر کی طرح معدوم ہوتی چلی گئی۔ اجنبی کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔
☆......☆......☆
"تو تم ہار گئے تھے دیوتا سے......" آشفتہ مُو اس کی آزردگی دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔
"ہاں میں اُن لوگوں کی نادانی اور جہالت سے ہار گیا تھا۔ میں اُسے بچا نہ سکا۔" اجنبی شکستہ لہجے میں اعتراف کر رہا تھا۔
"کیا تمہاری اس ساحرہ سے پھر کبھی ملاقات ہوئی؟" آشفتہ مُو نے استفسار کیا۔
"وہ تو بھینٹ چڑھ چکی تھی اپنے آسودگانِ خاک کے بنائے گئے بے ہودہ ریت و رواج پر قربان ہو چکی تھی۔ وہ مجھے پھر کبھی نہ مل سکی۔" اجنبی کے لہجے میں بچھڑنے کا غم کراہ رہا تھا۔
"نہیں ایسا نہیں ہے۔ کہانی ابھی ادھوری ہے۔" آشفتہ مُو کی اس بات سے اجنبی کے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور بے چینی سے چلا اٹھا۔

"کیا...... مطلب کیا ہے تمہارا؟ کہانی ابھی ادھوری ہے اس سے مراد کیا ہے آخر؟" مگر جواب ندارد...... آشفتہ مُو جا چکا تھا۔

اجنبی آئینے کی جانب متوجہ ہوا جہاں ایک نیا منظر کھلتا تھا۔ وہ اجنبی کی قیام گاہ تھی جس کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اجنبی بے نیاز سا بے سدھ پڑا خلاء میں تکتا رہا۔ اُس کے دل میں ہیجان برپا تھا۔ دروازے پر پہلے سے بھی شدید دستک ہوئی۔ وہ چار و ناچار اٹھتا ہارے ہوئے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ وا ہوا اور سامنے ساحرہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس قیامت خیز رات کے گزر جانے کے بعد بھی اُس کا حسن سحر انگیز تھا۔ وہ خوش ہوتا تو کبھی حیران' ساحرہ اُس کی ہمت پر داد دینے آئی تھی۔ اُس کی احسان مند تو تھی ہی مگر شرمندہ بھی کہ وہ اب اس کے قابل نہ رہی۔ اجنبی خود وارفتگی کے عالم میں اُس کے ہاتھوں کو تھامتا اپنی محبت اور وفا کا یقین دلانے لگا۔ اُسے سینے سے لگا کر کبھی ساتھ نہ چھوڑنے کا عہد کرنے لگا۔ اُس کی بانہوں کی گرمی سے ساحرہ موم کی طرح پگھلنے لگی۔ ایک نیچ نام نہاد دیوتا سے شکست کھانے کے بعد جو بھانبھڑ اُس کے اندر چل رہے تھے وہ ساحرہ کے وجود اور لمس سے بجھنے لگے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے بے جان وجود پر دمِ عیسیٰ پھونکا گیا ہو۔ ٹوٹتے بدن کو واصل آمیز لمس کی سرشاری نے جوڑ دیا ہو۔

دروازے پر قفل چڑھ چکا تھا۔ کافرانہ حسن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ نہ محبت ادھورا رہا نہ محبوب ادھورا۔ کمرے میں روشن دیے بجھ چکے تھے۔ نیلگوں اندھیرا! سیاہ حجم سے اترتا وادی میں چھاتا چلا جا رہا تھا اور پھر یہ اندھیرا مزید تاریک ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس میں سحر خیزی رنگ بھرنے لگی۔ اور سحر خیزی کے اس عالم میں کوئی خاموشی سے اپنی قیام گاہ سے نکلا تھا۔ وہ وادی کے حدود سے نکلتا دور ہوتا چلا گیا...... دور بے حد دور......

جنگل میں ایک جگر پاش قہقہہ بلند ہوا۔ اجنبی ہڑبڑا اٹھا۔ آئینے کی سطح پر آشفتہ مُو قہقہے لگاتا تھا۔

"تو تم وادی والوں کو لعن طعن کرتے تھے' نابینا طائر کہتے تھے۔" آشفتہ مُو اجنبی پر ہنس رہا تھا۔

"تم...... تم آخر ہو کون؟" اجنبی ہکلایا۔

"کیا اب بھی نہیں پہچانے تم؟" آشفتہ مُو اُس کی غیر ہوتی حالت پر محظوظ ہو رہا تھا۔

"نن...... نہیں......! تم میرے ہر راز سے واقف ہو۔ بالآخر تم ہو کون؟" اجنبی پر آشفتہ مُو کی ہیبت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

"میں وہ ہوں جو تم سے ملاقات کا ایک عرصے سے متمنی تھا۔ تم سے ملنے کی غرض سے آج اس قدیم آئینے میں ظاہر ہوا۔

آشفتہ مُو کی سرخ آنکھیں اب انگارہ ہوتی جا رہی تھیں۔

"اوہو...... پہیلیاں نہ بجھواؤ...... اب بتا بھی چکو آخر تم کون ہو؟" اجنبی جھنجلا گیا۔

"میں دیوتا ہوں۔" آشفتہ مُو کی گونج دار آواز اجنبی کو دہلا گئی۔

"دیوتا...... یہ کیسے ممکن ہے...... وہ تو اُس وادی میں بستا تھا......" لفظ اجنبی کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں بے یقینی چھائی تھی۔

"دیوتا صرف وادیوں اور بستیوں میں ہی نہیں بستے...... یہ مٹی کے جیتے جاگتے پتلوں کے اندر بھی سانس لیتے ہیں اور میں تمہارے اندر بسنے والا دیوتا ہوں۔" جنگل ایک بار پھر واشگاف قہقہے سے کانپ اٹھا تھا۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

فرح انیس

وہ مرے گمان جیسا

''اچھا بھئی اب رکشے میں بیٹھو۔'' عینی اس کا ہاتھ پکڑ کر رکشے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ وہ دونوں آرٹ ایگزیبیشن میں جا رہی تھیں۔ فرازین کو آرٹ سے کافی شغف تھا اور اس کی خواہش تھی فائن آرٹ پڑھنا مگر نعمان کی وجہ سے وہ اپنی اس......

پوری رات ہوتی تیز بارش نے سردی کی شدت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ سردی سے بے حال لوگ اپنے کمبلوں اور لحافوں میں دبکے ہوئے تھے مگر وہ پوری رات کھڑکی کھولے تیز بارش میں بھیگتی رہی۔ وہ بار بار پلٹ کر بیڈ کی جانب دیکھتی جہاں پر کل تک اک وجود سانس لے رہا تھا۔ اس نے اپنی کنپٹیوں کو دونوں ہاتھوں سے دبانا چاہا۔

''قسم سے یار کیا عجیب و غریب چیز ہو تم......'' وہ ہاتھ روک کر تیزی سے مڑ کر اس ہنستی آواز کو دیکھنے لگی۔ مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

''مجھ سے ناراض ہو کر تم کو نیند آ جائے گی کیا؟'' وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی وہ تیزی سے پلٹ کے بیڈ تک آئی۔

''تم سے ناراض ہو کر میں کیا سو سکتی ہوں؟'' وہ بیڈ پر لیٹے وجود کو دیکھتے ہوئے بولی۔ مگر وہاں اب کوئی نہ تھا۔ یہ درد تو میری جان لے کر چھوڑے گا اک روتی ہوئی آواز نے اس کا تعاقب کیا گھبرا کر دونوں ہاتھوں کو کانوں پر رکھ لیا۔

''نہیں نہیں مجھے کچھ نہیں سننا۔'' وہ اِن آوازوں کو چپ کراتے ہوئے چیخ کے بولی۔

کمرے میں پھیلی کافور کی خوشبو اس کے حواس معطل کر رہی تھی۔

''میں یہاں نہیں رہوں گی۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر کی جانب بھاگی اس تیز بارش میں وہ بری طرح سے بھیگ رہی تھی۔ آتے جاتے لوگ حیرت سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ جو اتنی شدید سردی میں دوپٹے سے بے نیاز اندھا دھند بھاگ رہی تھی کہ سامنے سے آتی سیاہ گاڑی سے ٹکرا کر جھٹکے سے اِک جانب جا گری۔ گاڑی میں بیٹھا شخص گھبرا کر گاڑی سے نکل کر زمین پر گری ہوئی لڑکی کو اٹھانے لگا جونہی نظر لڑکی پر پڑی اُس کو اِس حال میں دیکھ کر بری طرح سے چونکا۔ اپنی جیکٹ اُتار کر اُس کو پہنانے لگا اس کو دیکھ کر وہ بکھری گئی اور اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی اس کو اپنی بانہوں کے حصار میں لیے ہوئے گاڑی

میں بٹھا کر وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔
''اِک بات پوچھوں تم سے؟'' گاڑی اسٹارٹ کرتا ہاتھ رُک سا گیا۔ سوالیہ نگاہوں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جو بری طرح سے سفید ہو رہا تھا۔
''کوئی ایسا ورد آتا ہے تم کو جو میرے وجود کو ہوا میں تحلیل کر دے اگر آتا ہے تو پڑھ دو پلیز ......'' آنکھوں میں حسرت لیے اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔
''مت رو ایسے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔'' اس کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے بے ساختہ اُس کے منہ سے نکلا۔
''تم جھوٹ بول رہے ہو میرے رونے سے کسی کو درد نہیں ہوتا اس پوری دنیا میں کوئی ایسا وجود نہیں جس کو میرے رونے سے تکلیف ہو' میرا رونا اگر اتنا اہم ہوتا تو آج میں یوں تہی داماں نہ ہوتی۔'' اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے ہچکیوں کے درمیان بولی۔
''مجھے تو اب لگتا ہے اک دن میری موت اس رونے کے ہاتھوں ہوگی۔ تم جب سب کو بتاؤ گے مرگئی اور کوئی پوچھے گا تم سے کہ بیماری کیا تھی۔ بولنا روتی بہت تھی اس لیے مرگئی۔ یہ آنسو انسان کی جان لے لیتے ہیں یہ اندر تک کھوکھلا کر دیتے ہیں۔'' بولتے بولتے وہ ہانپنے لگی تھی سیٹ کی پشت سے سر لگا کر اس کو دیکھنے لگی۔ جو پُرنم آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔
''میری اک بات مانو گے میری موت پر کوئی رونے والا نہیں ہوگا۔ کیا تم میری موت پر روؤ گے۔'' اس کے سوال پر وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

☆......☆......☆

''اتنی دیر لگا دی تم نے آفس سے آنے میں......'' کمرے میں داخل ہوتی عائشہ کو دیکھ کر گل شروع ہوگئی۔
''قسم سے یار میرا باس ایک نمبر کا سنکی ہے۔ آج جتنا میں سوچ رہی تھی کہ جلدی کام کر کے واپس آنے کا اتنا ہی زیادہ لوڈ پڑ گیا کام کا......'' بیگ بیڈ پر ڈال کر وہ چت لیٹ گئی۔
''اچھا تم نے سامان کی لسٹ بنالی نہ......'' لسٹ بناتی گل کو دیکھتے ہوئے بولی۔
''ہاں بس بن گئی۔'' وہ پیپر فولڈ کر کے بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔
''تم تھکی ہوئی لگ رہی ہو کل چلتے ہیں گل۔'' اس کے تھکن زدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔
''نہیں نہیں بس میں پانچ منٹ میں فریش ہو کر آتی ہوں۔'' عائشہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔
''تم نے اور کیا لینا ہے۔'' گل جوتوں کی دکان سے نکلتے ہوئے عائشہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔
''نہیں بس اور کچھ نہیں لینا چلو لنچ کرتے ہیں۔'' دونوں خوشگوار موڈ میں ریسٹورنٹ میں لنچ کر رہی تھیں گل کی کسی بات پر بے ساختہ ہنستے ہوئے عائشہ کی نگاہ دروازے سے باہر نکلتے روحان پر پڑی منہ تک جاتا چمچ وہیں رُک گیا۔ وہ تیزی سے کرسی کھسکاتی ہوئی روحان کے پیچھے بھاگی جو پارکنگ کی طرف جا رہا تھا۔ گل دونوں ہاتھوں میں سر دے کر بیٹھ گئی اس نے عائشہ کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے روحان کو دیکھ لیا تھا مگر دانستہ اس نے نظر چرالی تھی۔ مبادا عائشہ اس کی نظروں کے تعاقب میں نہ دیکھ لے۔ بے دلی سے وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر ٹیبل پر پیسے رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ جانتی تھی آج پوری رات اب اس نے بھوکے پیاسے گزار دینی ہے گل ریسٹورنٹ سے

نکل کر اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی کچھ ہی فاصلے پر کھڑی عائشہ اس کو نظر آ گئی۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو ایسے چلو......''

''گل دیکھو وہ گیا میں نے آوازیں بھی دیں پر وہ مجھے نظر انداز کرتا چلا گیا۔'' عائشہ آنکھوں میں آنسو لیے اِسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا واپس چلو......'' اس کا ہاتھ پکڑ کے تقریباً کھینچتے ہوئے بولی۔

عاشی سونا نہیں ہے۔'' اس کو بیڈ پر سوچوں میں گم دیکھ کے بولی۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی۔'' عائشہ اسے دیکھتے ہوئے بے چارگی سے بولی۔

''صبح آنکھ نہیں کھلے گی پھر...... آفس بھی جانا ہے۔''

''کاش ایسا ہو کہ یہ آنکھیں کبھی نہ کھلیں۔'' عائشہ تلخی سے بولی۔ گل خفگی سے اُسے دیکھنے لگی۔

''تمہاری بیکار باتیں شروع ہو گئیں نا۔'' عائشہ برا مانتے ہوئے بولی اور تکیہ درست کر کے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ کافی دیر تک وہ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں موند لی۔

☆......☆......☆

نعمان گھر میں داخل ہوا تو ماں کے برابر بیٹھی پڑوس سے آئی ہوئی ساجدہ خالہ کو سلام کرتا ہوا وہ ماں سے فرازین کا پوچھنے لگا۔

''کچن میں کام کر رہی ہے۔'' کہتے ہوئے عالیہ کی تیز نگاہوں نے نعمان کے ہاتھ میں دبے لفافے کو دیکھ لیا تھا وہ کچن کی طرف چلا آیا۔ جہاں فرازین کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ وہ کچن کے دروازے میں ہی رُک کر اسے دیکھنے لگا۔ لال سادہ سالان کے سوٹ میں بالوں کا جوڑا بنائے وہ تیزی سے ہنڈیا میں کفگیر چلا رہی تھی۔ بہت توجہ سے اس کی ناک میں چمکتی نوز پن کو دیکھنے لگا۔ اسے فرازین کی ناک میں چمکتی نوز پن بہت پسند تھی۔

''اوہ آپ کب آئے؟'' اس کو دروازے کے پاس کھڑا دیکھ کر وہ مسکرا کر بولی۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں۔'' مسکرا کر کہتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

''دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟''

نعمان لفافے میں سے گجرے نکالتے ہوئے بولا۔ فرازین کو موتیے کے گجرے بہت پسند تھے وہ شوق سے ہاتھوں میں ان گجروں کو پہننے لگی۔ نعمان کی نگاہیں اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں پر ٹھہر سی گئی۔ بہت غور سے اس کی دراز پلکوں کو دیکھ رہا تھا نعمان کے دیکھنے کے انداز پر فرازین جھینپ سی گئی۔

نعمان کی کسی بات پر فرازین زور سے ہنس دی۔ باہر صحن میں تخت پر بیٹھی عالیہ اور ساجدہ تک فرازین کی ہنسی کی آواز آئی تو ساجدہ دل جلا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ عالیہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''نومی تو پورا دیوانہ ہے فرازین کا' حسین بھی تو اس قدر ہے۔'' ہاں بھئی ماں بھی ایسی ہی تھی۔ آتے ہی اپنے حسن سے قابو میں کر لیا تھا شوہر کو' ہماری ساس بھی دیوانی ہوئی پھرتی تھیں ایسے کچھن ہمیں نہ آ سکے۔'' عالیہ نخوت سے مرحوم دیورانی کا ذکر کرتے ہوئے بولیں۔

ہاشم اور رخسانہ کو اللہ نے دو بیٹوں سے نوازا تھا رخسانہ کو بیٹی کی بہت چاہ تھی اس لیے بڑے بیٹے صدیق احمد کمانے لائق ہوئے تو رخسانہ نے جھٹ اپنی بہن کی بیٹی عالیہ کا ہاتھ مانگ لیا یوں

عالیہ ان کے گھر بیاہ کر آ گئی رخسانہ جو بہت خوش تھی کہ بہو کے آنے سے ان کے سونے آنگن میں رونق ہو جائے گی۔ ایسا نہ ہوا عالیہ مزاج کی کافی تیز نکلی۔ ذرا ذرا سی بات پر ہنگامہ کر دینا اُن کی عادت تھی۔ رخسانہ شادی سے قبل جس خوش اخلاق عالیہ کو جانتی تھی وہ ویسی نہ تھی۔ دوسرے بیٹے انور کی دفعہ رخسانہ نے خاندان سے باہر کی لڑکی کو پسند کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں نفیسہ نے اپنے اخلاق سے سب کو گرویدہ کر لیا۔ انور تو پہلے ہی بیوی کی خوبصورتی کے دیوانے تھے۔ نفیسہ کو بیاہ کر لاتے ہوئے جو اندیشے رخسانہ کو ستا رہے تھے اس سے اب وہ مطمئن تھی۔ عالیہ نے جونہی سب کا جھکاؤ نفیسہ کی طرف دیکھا تو آئے دن کی لڑائیاں شروع کر دیں۔

ان لڑائیوں سے تنگ آ کر ہاشم صاحب کو مجبوراً دو پورشن کرنے پڑے اس بار بھی عالیہ نے اپنی ضد دکھائی کہ نیچے وہ ساس سسر کے ساتھ رہے گی اور اوپر نفیسہ اور انور...... نفیسہ کو بھی چین نہ تھا دن میں دس چکر ساس سسر کے پاس لگا لیتی۔

کچھ وقت بعد اللہ نے نفیسہ کو بیٹی دی رخسانہ نے بہت چاؤ سے اس کا نام فرازین رکھا۔ فرازین کو بھی اللہ نے ماں کی طرح حسن کی دولت سے بے انتہا نوازا تھا عالیہ کا آٹھ سالہ بیٹا نعمان اس کا دیوانہ تھا ماں کے سوتے ہی نفیسہ کے پورشن میں آ جاتا اور گھنٹوں فرازین کو گود میں لیے بیٹھا رہتا۔ نفیسہ نعمان کی محبت پر مسکرا دیتی ان کو بھی نعمان بہت عزیز تھا مگر عالیہ کو اس ننھی گڑیا سے خدا واسطے کا بیر تھا نفیسہ عالیہ کے تیز مزاج سے واقف تھی۔ مگر وہ چپ رہتی تھی۔ فرازین دو سال کی تھی اور نفیسہ کے بھائی کی منگنی تھی اس سلسلے میں لاہور جانا تھا۔ نفیسہ کا میکہ لاہور میں مقیم تھا۔ ان دنوں فرازین کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اور میکے کی طرف سے بار بار ان کے آنے پر اصرار ہو رہا تھا۔ نعمان نے فرازین کے جانے کا سنا تو رو رو کر اپنا برا حال کر لیا مجبوراً وہ فرازین کو رخسانہ کے پاس چھوڑ کر انور کے ساتھ لاہور روانہ ہو گئی عالیہ نعمان کی اس حرکت پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

لاہور سے واپس آتے ہوئے ٹرین حادثے نے ہاشم صاحب کے خاندان پر قیامت برپا کر دی۔ ہاشم صاحب جوان بیٹے اور بہو کی میت دیکھ کر یہ صدمہ سہار نہ سکے اور غش کھا کر گر پڑے اک ساتھ تین جنازے اٹھنے پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ رخسانہ دنوں سکتے کی کیفیت میں رہی وقت نے ان کی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔

صدیق احمد بھی باپ اور چھوٹے بھائی کی موت کے بعد سے چپ سے ہو گئے تھے پورے گھر پر عالیہ کا راج تھا فرازین میٹرک میں تھی کہ رخسانہ نے صدیق احمد سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ صدیق احمد کو کوئی اعتراض نہ تھا ان کو اپنی بھتیجی بہت عزیز تھی اور وہ چاہتے تھے کہ بھائی کی نشانی ان کے گھر ہی رہے یوں اک شام فرازین اور نعمان کا نکاح کر دیا گیا۔ نعمان کا خوشی سے چمکتا چہرا عالیہ سے چھپا نہ تھا مگر فرازین بے تاثر چہرے کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نکاح سے عالیہ کے سینے پر سانپ لوٹ گئے تھے مگر شوہر اور ساس کے آگے وہ بے بس تھی جس کی ماں کو وہ دو منٹ برداشت نہیں کر سکتی تھی اس کی بیٹی ساری زندگی ان کو برداشت کرنی تھی کاش یہ بھی اس ٹرین میں ہوتی بے حسی سے وہ سوچنے لگی۔

رخسانہ بیگم بس اس ہی دن کے انتظار میں جی رہی تھیں۔ نکاح کے ایک ہفتے بعد فرازین ان کو صبح اٹھانے گئی مگر فرازین کی چیخیں بھی ان کو نہ

اٹھا سکیں۔ دادی کی موت کے بعد فرازین خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگی تھی مگر تایا اور نعمان کی محبت پر وہ سنبھل سی گئی اور کچھ عرصے بعد تایا بھی اسے چھوڑ کر چلے گئے۔

☆......☆......☆

وجدان کافی دیر سے ہاسپٹل کے کوریڈور میں ٹہلے جار ہا تھا اتنی ٹھنڈ میں بھی اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ آیا ہوا تھا وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو آپس میں مسلتا اس کی نگاہیں لیبر روم پر جمی ہوئی تھیں اندر اُس کی بیوی زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔ ڈاکٹر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ تیزی سے ڈاکٹر کی جانب بڑھا۔

''مبارک ہو آپ کے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر کی بات پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اور میری وائف ......'' اس کے سوال پر ڈاکٹر کے جواب نے اسے ساکت کر دیا۔

''سوری ہم آپ کی وائف کو نہیں بچا سکے۔'' افسردگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے ڈاکٹر آگے بڑھ گیا وہ وہیں ٹھنڈے فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔

''حیا یہ دنیا کس قدر خوبصورت ہے۔'' وجدان کو اپنی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''نہیں وجدان یہ دنیا ویسی نہیں ہے جیسی معلوم ہوتی ہے دور سے بہت حسین لگتی ہے مگر جو قریب سے اس دنیا کی حقیقت کو جان لے اس کے لیے انتہائی بدصورت ہے۔'' حیا کی دور سے آتی ہوئی آواز نے اُسے بے چین سا کر دیا۔

وجدان کو یہ دنیا بہت بدصورت محسوس ہو رہی تھی۔

''ایسے کیوں کھڑے ہو گھر چلو۔'' عثمان نے آگے بڑھ کر وجدان کا بازو ہلاتے ہوئے کہا جو اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا وہ خاموشی سے اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گھر آ کر وہ چپ چاپ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا عثمان کمرے میں دودھ کا گلاس لے کر داخل ہوا تو وجدان کو یوں خاموش چھت کو تکتے دیکھ کر اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔

''یہ دودھ پی لو کل سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔'' مگر وہ ہنوز خاموش تھا۔

وجدان میرے پاس تسلی کا کوئی ایسا لفظ نہیں کہ جو میں تم کو بولوں اور میں جانتا ہوں دکھ کی اس گھڑی میں کوئی تسلی کا لفظ کام نہیں آتا نہ وہ الفاظ ہمارے دکھ کا مداوا کر سکتے ہیں۔ مگر بس اتنا کہوں گا کہ حیا بھابی اتنا ہی وقت لکھوا کر آئی تھی دنیا میں اب تم کو خود کو سنبھالنا ہو گا۔ اپنی بیٹی کی خاطر جو اِس دنیا میں آتے ہی ماں کی نرم گرم آغوش سے محروم ہو گئی۔'' عثمان وجدان کے برابر سوئی ننھی گڑیا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

وجدان اُٹھ کے بیٹھ گیا اور اپنے برابر لیٹی گڑیا کے ماتھے پر محبت سے بوسہ دے ڈالا۔

''یہ لو پیو۔'' وہ اس کی جانب دودھ کا گلاس بڑھاتے ہوئے بولا۔ اس نے خاموشی سے پی لیا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ عثمان کو اُس کی خاموشی سے وحشت ہو رہی تھی۔

وجدان کچھ بولو تو عثمان اس کی چپ پر گھبرا کر بولا۔

''کیا بولوں......'' وجدان خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

عثمان نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اس کے سینے سے لگتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیا کب کے رُکے ہوئے آنسو تھے جو اب بہہ رہے تھے عثمان نے اس کو رونے دیا۔

☆......☆......☆

''کپڑے استری تک کرنے نہ آ سکے تم کو اتنی بڑی ہو گئی ہو۔'' عالیہ کپڑوں کا گولہ بنا کر غصے

سے فرازین پر اچھالتے ہوئے بولی۔ فرازین جو بیڈ پر بیٹھی پیپر کی تیاری میں مگن تھی عالیہ کی تیز آواز پر اچھل سی گئی۔

''تائی امی میں نے تو ٹھیک سے کپڑے استری کیے تھے۔'' فرازین اپنی ایک گھنٹے کی محنت کی یوں درگت بنتے دیکھ کر روہانسی ہو کر بولی۔ کتنی مشکل سے اس نے ٹائم نکال کر کپڑے استری کیے تھے۔

''تو میں کیا تم سے جھوٹ بول رہی ہوں۔'' عالیہ آنکھیں نکال کر تیز لہجے میں بولی۔

''میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔'' فرازین اپنی صفائی دیتے ہوئے بولی۔

''جو بھی ہے دوبارہ سے اِن کو استری کرو۔'' کپڑوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عالیہ بولی۔

''تائی میرا کل پیپر ہے میں کل کردوں گی۔'' فرازین عالیہ کو دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولی۔

''تم نے کون سا آفیسر لگ جانا ہے آئی بڑی تائی کل پیپر ہے۔'' ناک چڑھا کر کہتے ہوئے عالیہ کمرے سے چلی گئی۔ فرازین بے بسی سے کپڑوں کے ڈھیر کو دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا سرکار کا مزاج ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' نعمان اس کے اترے چہرے کو دیکھ کر شرارت سے کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''اوہ اچھا سمجھ گیا آج پھر امی سے ڈوز ملی ہے تو یار تم کام ٹھیک سے کیا کرو نہ۔'' وہ بیڈ پر بکھرے سلوٹ زدہ کپڑوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

''نعمان میں کام ٹھیک سے ہی کرتی ہوں۔'' نعمان کی بات پر وہ افسوس سے بولی۔

''یار یہ تو ہر ساس بہو میں چلتا ہے تم اتنا موڈ کیوں خراب کرتی ہو ابھی تو رخصتی بھی نہیں ہوئی کیا بعد میں بھی اس ہی طرح بندر کی طرح منہ لٹکا کر بیٹھو گی۔'' وہ اس کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ پر وہ خاموش رہی۔

''یار میں جانتا ہوں امی بعض اوقات بہت زیادتی کر جاتی ہیں تمہارے ساتھ پر پلیز میری خاطر درگزر کر دیا کرو۔''

''درگزر تو کرتی آرہی ہوں میں۔'' فرازین افسردگی سے کہتی ہوئی کپڑوں کا ڈھیر اُٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ نعمان اس کی بات پر لب بھینچ کر رہ گیا ماں سے کچھ کہنا اک نئے ہنگامے کو دعوت دینا تھا۔

کالج سے پیپر دے کر وہ نکلی تو اس کی نظر گلی کے کونے پر درخت کے نیچے بیٹھے اس مجذوب پر جا ٹھہری آج بھی اس کے قدم بے اختیار اس جانب بڑھے اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس مجذوب کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ مجذوب نے اک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ سر جھکا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔

''جب انسان بہت بے سکون ہو تو کیا کرے۔'' وہ آہستگی سے پوچھنے لگی۔

''وہی کرے جس کا اک مسلمان کو حکم ہے دعا کرنے کا۔''

''ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ ہماری دعا قبول ہوگئی ہے بابا۔'' اس نے بے صبری سے پوچھا۔

''جب تیرے دل کو سکون مل جائے تو سمجھ لینا تیری دعا قبول ہوگئی۔''

''جن کے دل رہتے ہی بے سکون ہوں وہ کیا کرے بابا۔'' فرازین بے بسی سے بولی۔

''عشق کا روگ ایسا ہی ہوتا ہے اچھے اچھوں کو بے چین کر ڈالتا ہے۔'' کہتے ہوئے وہیں درخت کی چھاؤں میں لیٹ کر چادر منہ پر ڈال لی۔ مجذوب کی بات پر فرازین گھبرا سی گئی جیسے کسی

نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

''دعا کر دعا سے تقدیریں بدل جاتی ہیں بیٹا......''

''اور جن کی قسمت کے فیصلے ہو چکے ہو وہ کیا کرے؟'' فرازین نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''پھر وہ رب کی رضا میں راضی ہونا سیکھ لے رب خود ہی ان کے لیے اسباب بنا دے گا۔''

''مجھے بھی رب کی رضا میں راضی ہونا ہے بابا پر میرا دل راضی نہیں ہوتا۔'' وہ بے چارگی سے بابا کو دیکھتے ہوئے بولی۔ مگر وہ بے خبر سو چکا تھا۔ آہستگی سے وہاں سے اٹھ کے گھر کی طرف چل دی۔ گھر میں داخل ہوئی تو صحن میں تخت پر لیٹے نعمان کو سلام کرتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔

''فرازین بات سنو۔'' نعمان کی آواز پر وہ رُک سی گئی اور اس کے پاس تخت پر آ بیٹھی۔

''کیسا ہوا پیپر؟'' نعمان اس کی سنہری رنگت کو دیکھتے ہوئے بولا جو گرمی کی شدت سے سرخ ہو رہی تھی۔

''اچھا ہوا پیپر......'' فرازین کی بہت خواہش تھی کہ انٹر کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے مگر نعمان کو مخلوط تعلیمی ادارے لڑکیوں کے لیے پسند نہ تھے۔ اس لیے اس کے کہنے پر اس نے مقامی گرلز کالج سے بی اے میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔

''تائی کہاں ہیں؟'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

''برابر ساجدہ خالہ کی طرف گئی ہیں۔ اتنی چپ چپ سی کیوں ہو۔''

''ایسے ہی بس کل کے پیپر کا سوچ رہی تھی۔''

''اوہ اچھا...... مس فرازین بھی سوچتی ہیں۔''

وہ اسے شوخی سے دیکھتے ہوئے بولا اس کی بات پر وہ دھیمے سے ہنس دی۔

☆......☆......☆

چیختے چلاتے میوزک کلب میں موجود جوڑے اک دوسرے کی بانہوں میں مدہوش تیزی سے تھرک رہے تھے۔'' وہ بھی میہرین کو بانہوں میں تھامے تیزی سے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے ہم رقص تھا۔ کافی دیر بعد جب دونوں تھک گئے تو وہاں رکھی کرسی پر بیٹھ گئے میہرین کرسی کی پشت سے لگ کر اپنی بے ترتیب ہوتی سانسوں کو درست کرنے لگی کشادہ گلے کی بغیر آستین کی مختصر سی سیاہ جرسی جس پر گھٹنوں تک آتا اسکن کلر کا ٹراؤزر اسے مزید بے باک بنا رہا تھی۔

بالوں میں ہاتھ چلاتی ہوئی وہ برابر کرسی پر بیٹھے ڈینی کو دیکھنے لگی جو ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے سپ لے رہا تھا۔ مگر خود پر جمی میہرین کی نظروں سے غافل نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی سحر انگیز شخصیت اور مضبوط بیک گراؤنڈ بہت سی لڑکیوں کی کمزوری تھا۔ ڈینی کو اپنے مقابل کو ہمیشہ چت کرنے میں مزہ آتا تھا۔ وہ اپنی ان خوبیوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کب اور کون سا پلس پوائنٹ کہاں استعمال کر کے کسی لڑکی کو اپنا اسیر کرنا ہے بیک وقت وہ بہت ساری لڑکیوں کی دل کی دھڑکن بنا ہوا تھا مگر اب تک اس کی زندگی میں کوئی ایسی لڑکی نہ آئی تھی جو اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ سکے۔

ماتھے پر لمس کے احساس سے ڈینی نے آنکھیں کھول دی تو برابر بیٹھی جہاں آرا بیگم کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

''سالگرہ مبارک ہو چندا......'' محبت سے اس کا سر سہلاتی ہوئی بولیں۔

''تھینکس مائی سویٹ گرینی۔'' جہاں آراء

بیگم کا ہاتھ محبت سے چومتے ہوئے بولا۔

''کتنی دیر تک میں تمہارے انتظار میں جاگتی رہی ہوں۔'' انہوں نے اس کا سر محبت سے سہلاتے ہوئے کہا۔

''سوری گرینی رات ڈنر پر بہت دیر ہوگئی تھی۔ کل سب کو ٹریٹ دی تو یونو دیر ہو جاتی ہے۔'' وہ اُٹھ کے بیٹھتے ہوئے چہرے پر بے چارگی سجاتے ہوئے بولا۔

''ہاں بیٹا کہاں خیال آئے گا اس بوڑھی دادی کا تم کو' خیر سے چوبیس برس کے ہوگئے ہو پڑھائی بھی تمہاری اس ہی سال مکمل ہوگئی ہے اب تو چھوڑ دو یہ حرکتیں اور انسان بن جاؤ۔''

''ارے آپ سے کس نے کہا کہ آپ بوڑھی ہوگئی ہیں ذرا میک اپ کر کے کلرفل کپڑے تو پہنے پھر دیکھیے کیسے رشتے آتے ہیں۔'' ڈینی شرارت سے بولا۔

''شرم تو آئے گی نہیں بوڑھی دادی سے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔'' جہاں آراء بیگم جھینپتے ہوئے بولیں۔

''تمہاری ماں کے کل سے بس فون آچکے ہیں اسے کال کرلو۔'' اُن کی بات پر وہ خاموش سا ہوگیا۔

''ڈینی میں تم سے کچھ بول رہی ہوں۔'' اپنی بات کا جواب نہ پاکر وہ بولیں۔

''جو آپ نے کہا میں نے سن لیا۔'' وہ سنجیدگی سے کہتا ہوا بیڈ سے اُتر گیا۔

''مانی آنے والا ہے میں تیار ہونے جارہا ہوں۔'' کہتا ہوا وہ ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

''اور ہاں میری کوئی ماں نہیں میری ماں کب کی مرچکی ہے۔'' وہ رُک کر پلٹ کے بولا۔ جہاں آراء بیگم اس کو دیکھ کے رہ گئیں۔

☆......☆......☆

عائشہ اس کے ہاتھ پر سر رکھ کر خاموش سی لیٹی تھی پھر خود ہی بول اٹھی۔

''پتا ہے کل آج جب میں روحان کو آواز دے رہی تو اس نے مجھے دیکھا اور پھر نگاہیں پھیر لی، کیسا لگتا ہے آپ پر جان چھڑکنے والا شخص آپ کو اجنبی نگاہوں سے دیکھے ایسا لگتا ہے کوئی دھیرے دھیرے آپ کو اندر سے کاٹ رہا ہو۔ کل جب محبت لٹاتی نظروں میں بیگانگی آجائے نہ اس کی اذیت بڑی بری ہوتی ہے اور ساتھ لیٹے وجود نے اس کی بات پر اذیت سے آنکھیں بند کرلی تھی۔

سولہ سال کی تھی جب روحان کے نام کی انگوٹھی پہنی تھی جانتی ہو نہ اگر کچی عمر میں اک بار کسی کا نام اپنے دل کی خالی سلیٹ پر لکھ دیا جائے تو پھر اس نام کو مٹانے کے لیے اک عرصہ چاہیے ہوتا ہے بعض دفعہ تو اس نام کو مٹانے کے چکر میں آپ خود ہی مٹ جاتے ہو۔ وہ دن میرے لیے پھولوں سے بھرا خوشیوں والا دن تھا میں اپنا نام روحان کے نام کے ساتھ لکھتی اور کئی کئی گھنٹے اس نام کو دیکھ کر اپنی خوش بختی پر یقین کیا کرتی۔ جب بابا کی موت ہوئی تو ان کی موت نے مجھے اور ماں کو توڑ کے رکھ دیا تھا ان ہی دنوں ہم نے اپنے رشتوں کو بدلتے دیکھا اس وقت روحان نے ہمارا بہت ساتھ دیا میں اور ماں اس کے بہت احسان مند تھے کہ اس مشکل گھڑی میں ہمارے پاس کوئی تو ہے جس کو ہم اپنا کہہ سکتے ہیں۔ تئیس سال کی تھی میں کہ جب ماں ایسا بیمار ہوئیں کہ وہ بیماری ان کو اپنے ساتھ ہی لے گئی اس وقت مجھے لگا کہ میں اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہوگئی ہوں پر مجھے روحان کے ساتھ کا سہارا تھا میری دعائیں لمبی ہوگئیں۔ میں ہر دعا میں روحان کی زندگی کی

خوشیوں کی دعائیں مانگا کرتی رب سے۔ میں گھر میں بولتی خاموشی اور تنہائی سے ڈرنے لگی تھی۔

میں نے روحان سے کہا ہم شادی کر لیتے ہیں مجھے اکیلے گھر میں بہت ڈر لگا کرتا تھا اور پھر دوسرے دن روحان آیا تو اس کے ہاتھ میں منگنی کی انگوٹھی تھی وہ دن میرے لیے یوم سوگ تھا گل...... وہ بول رہا تھا میں تم سے شادی نہیں کر سکتا مجھے لگا میری سماعتیں شاید ٹھیک کام نہیں کر رہی میں نے دوبارہ اس سے پوچھا اور اس نے تین بار اپنی بات دہرائی جب کسی مجرم کو سزا دی جاتی ہے تو اس کا جرم بھی بتایا جاتا ہے اس نے تو میرا جرم بتائے بغیر مجھے پھانسی کی سزا سنا دی اور وہ چلا گیا۔

اس دن میں بہت روئی میں نے اللہ سے خوب شکوے کیے میں اس سے ناراض ہوگئی اور پھر میں اِدھر ہاسٹل آ گئی یہاں تمہارے ساتھ میں پانچ برسوں سے ہوں ان پانچ برسوں میں کوئی دعا نہیں کی میں نے روحان کے جاتے ہی میری دعائیں ختم ہوگئی گل اور ان پانچ برسوں میں بھی میں اس کو نہیں بھول پائی شاید اس کے لیے پانچ صدیاں بھی کم ہے کہتے کہتے وہ چپ سی ہوگئی۔ گل اس کے چہرے کو دیکھنے لگی جہاں پر اذیت ہی اذیت تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ آنکھیں بند کر کے سوگئی تھی جو لوگ محبت کو دھتکار دیتے ہیں نہ پھر نہ محبت ساری زندگی ان کو تڑپاتی ہے پر یہ محبت پھر ان کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی۔ گل سوئی ہوئی عائشہ کا محبت سے ماتھا چومتے ہوئے سوچنے لگی۔

☆......☆......☆

''ہاں بھئی کل آ رہے ہو نہ تم دونوں۔'' مانی مہرین اور پنکی کو دیکھتے ہوئے بولا جو مانی کے لان میں بیٹھیں چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

''کہاں آنے کی بات ہو رہی ہے۔'' پنکی منہ میں چپس ڈالتے ہوئے بولی۔

''کل ڈینی کی پینٹنگ ایگزیبیشن ہے وہاں کا پوچھ رہا ہوں۔''

''اوہ کل ہے میں سمجھی پرسوں ہے۔ اچھا ہوا بتا دیا۔''

''بڑی ہی کوئی آپ عقلمند خاتون ہیں کہ دن بھی یاد نہیں رہا آپ کو۔'' مانی اس کی عقل پر ماتم کرتا ہوا بولا۔

''مہرین میں نے سنا ہے تمہارے لیے علی کا پروپوزل آیا ہوا ہے؟'' اپنے کلاس فیلو کا نام لیتے ہوئے پنکی بولی۔

''ہاں یار میں نے منع کر دیا۔''

''کیوں منع کر دیا اچھا خاصا تو ہے علی۔'' پنکی حیرانگی سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

''یار بس ابھی میرا کوئی شادی کا ارادہ نہیں۔'' وہ ٹالتے ہوئے بولی۔ اس کے ٹالنے پر پنکی اور مانی ایک دوسرے کو معنی خیزی سے دیکھنے لگے۔ ان چاروں کا گروپ یونیورسٹی کے پہلے دن سے ہی بن گیا تھا اور ان چھ سالوں میں یونیورسٹی میں انہوں نے اپنی ذہانت سے کامیابی کے جھنڈے گاڑھے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ ان کی شرارتیں بھی جاری رہی اپنی تعلیمی قابلیت کی وجہ سے یہ چاروں اساتذہ کی ٹاپ لسٹ میں رہے خود اساتذہ بھی ان کی شرارتوں کو خوب انجوائے کرتے اور پھر یہی دوستی پنکی اور مانی کو کافی قریب لے آئی اور تعلیم مکمل ہونے کے کچھ ماہ بعد دونوں کی منگنی ہوگئی۔

☆......☆......☆

''شکر ہے تم نے بتا دیا نعمان بھائی کو کال کر کے آج دیر سے آنے کا ورنہ تو کال کر کر کے

تمہارا خون پی جاتے۔'' عینی کالج گیٹ سے نکلتے ہوئے بولی۔

''نہیں یار ایسی بات نہیں وہ بس فکر مند ہوجاتے ہیں۔'' فرازین صفائی دیتے ہوئے بولی۔

''ہاں بھئی جس کی بیوی اتنی حسین ہو وہ فکر مند تو ہوگا نہ، پھر تمہارے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں۔'' عینی ضرورت سے زیادہ منہ پھٹ تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے اور نعمان جیسے بھی ہیں مجھے اچھے لگتے ہیں۔'' فرازین عینی کی بات پر برا مانتے ہوئے بولی۔

''اچھا بھئی اب رکشے میں بیٹھو۔'' عینی اس کا ہاتھ پکڑ کر رکشے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ وہ دونوں آرٹ ایگزیبیشن میں جارہی تھیں۔ فرازین کو آرٹ سے کافی شغف تھا اور اس کی خواہش تھی فائن آرٹ پڑھنا مگر نعمان کی وجہ سے وہ اپنی اس خواہش کو دبا گئی تھی۔ دونوں دلچسپی سے آرٹ گیلری میں لگی پینٹنگز کو دیکھ رہی تھیں کہ فرازین کے قدم اک پینٹنگ کو دیکھ کر ٹھہر سے گئے۔ وہ غور سے پینٹنگ کو دیکھنے لگی سفید میکسی میں خوبصورت سی لڑکی سفید گھوڑے پر سوار تھی اور اس کے پیچھے بیٹھا لڑکا اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے اُس کے کان میں سرگوشی کررہا تھا۔ لڑکی ذرا سا رخ موڑے اس لڑکے کی سرگوشی پر مسکرا رہی تھی۔ لڑکی کی مسکراہٹ کو اس قدر دلکشی سے مصور نے پینٹ کیا تھا کہ وہ کھو سی گئی۔ فرازین کا دل چاہا وہ اس پینٹنگ کو خرید لے مگر اس کی قیمت دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔

''عینی دیکھو کتنی خوبصورت پینٹنگ ہے۔'' وہ اپنے برابر کھڑی عینی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ نگاہیں ہنوز پینٹنگ پر جمی تھی۔

''تھینکس......'' مردانہ آواز پر وہ اچھل سی گئی وہ لڑکا مسکرا کر اس کو دیکھتا ہوا بولا۔

''ڈینی بات سنو......'' کچھ ہی فاصلے پر کھڑی اک ماڈرن لڑکی اس کو ڈینی کہہ کر آواز دینے لگی اور وہ اس لڑکی کی آواز پر اس طرف چلا گیا جہاں اس لڑکی کے علاوہ اک لڑکا اور لڑکی بھی کھڑے تھے۔ فرازین گھبرا کر عینی کی تلاش میں اپنی نظریں دوڑانے لگی اور ایسے کچھ ہی فاصلے پر عینی اک لڑکی سے باتیں کرتی نظر آگئی۔

''عینی گھر چلیں۔''

''ہاں چلتے ہیں۔''

''فرازین ان سے ملو یہ میری اسکول فرینڈ ہے۔'' وہ بمشکل مسکرا کر اس سے ملی۔

''عینی مجھے کچھ کام ہے میں جارہی ہوں۔'' فرازین عینی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''تھوڑی دیر رُک جاؤ میں بھی چلتی ہوں۔''

''نہیں یار مجھے کچھ کام ہے میں تھوڑی دیر بھی نہیں رُک سکتی۔'' فرازین اس سے معذرت کرتے ہوئے وہاں سے نکل گئی۔

''میں جتنا چاہتی ہوں کہ تم سے سامنا نہ ہو تم مجھے اتنا نظر آجاتے ہو، اے اللہ یہ کیسا امتحان ہے مجھے اس شخص سے محبت ہوگئی ہے جس کو پتا بھی نہیں وہ تو میرا نام بھی نہیں جانتا۔ اے اللہ میں کسی کے نکاح میں ہوکر خیانت کررہی ہوں مجھے معاف کردے میرے دل میں نعمان کی محبت کو ڈال دے۔ میرے دل سے اس شخص کی محبت کو نکال دے جس کو میں ٹھیک سے جانتی بھی نہیں۔ فرازین کا دل چاہا اپنے خوابوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالے۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر محو تھی کہ رکشہ تک کرنا بھول گئی اور پیدل چلے جارہی تھی۔ اس کو آج بھی وہ بچپن کے دن یاد تھے جب وہ اپنی

دادی سے اکثر پوچھا کرتی۔
"دادی کیا میں بہت خوبصورت ہوں۔" وہ رخسانہ بیگم کے سینے پر سر رکھ کے بھولپن سے پوچھنے لگی۔
"ہاں بہت پیاری ہے میری شہزادی۔" رخسانہ بیگم شفقت سے اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔
"تو پھر تو میرے لیے کوئی خوبصورت سا شہزادہ آئے گا جو مجھ سے شادی کر کے مجھے اپنے محل لے جائے گا ہے نا۔" وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں خوشی لیے پوچھنے لگی۔
رخسانہ بیگم پوتی کی بات پر ہنس دیں۔
"پتہ ہے دادی اسکول میں سب بولتے ہیں میں بہت خوبصورت ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں خوب سارا پڑھوں اک بہت اچھی آرٹسٹ بنوں پھر میرے لیے میرے خوابوں جیسا شہزادہ آئے جو مجھے اپنے محل لے جائے جیسے سنڈریلا کی اسٹوری میں ہوتا ہے تاکہ میری جان تائی سے چھوٹ جائے ہر وقت مجھے ڈانٹی ہیں۔" فرازین برا سا منہ بنا کے بولی۔
"نہیں بیٹا ایسے نہیں کہتے وہ آپ کی بڑی ہیں۔" رخسانہ بیگم سرزنش کرتے ہوئے بولیں۔
اُسے آج بھی یاد تھا وہ میٹرک کا پیپر دے کر نکل رہی تھی کہ سامنے گاڑی میں بیٹھے لڑکے پر اس کی نظریں ٹھہر سی گئی جو اپنے برابر بیٹھے لڑکے کی بات پر ہنس رہا تھا۔ فرازین اس کے گال میں پڑتے بھنور کو دیکھنے لگی۔ گردن سے تھوڑا نیچے آتے براؤن گھنگھریالے بالوں کو ماتھے پر سے ہٹاتا ہوا اس کی نظر بے اختیار سامنے کھڑی لڑکی پر پڑی جو بے اختیار اس کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ لڑکا گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوا مسکراہٹ اس کی جانب اچھالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فرازین اس کی مسکراہٹ پر گھبرا سی گئی گھر آ کر بھی اس کے اوسان پر وہ لڑکا سوار رہا۔ رات لیٹنے کے لیے آنکھیں بند کی تو چھم سے اس کا سراپا آ گیا۔ فرازین نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور اک ہفتے بعد فرازین کو وہ پھر نظر آ گیا اپنی گاڑی کے دروازے سے لگا کسی کا انتظار کرتے ہوئے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے سر جھکائے اپنے جاگرز سے زمین پر پڑے پتھر کو اِدھر اُدھر کرتے ہوئے۔ فرازین اس کے خوبرو چہرے پر اُگی ہلکی ہلکی شیو کو دیکھنے لگی۔ جو اس کے چہرے پر بہت جچ رہی تھی وہ لڑکا گیٹ سے نکلتے ہوئے لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جس کے ساتھ فرازین نے اسے پچھلے ہفتے گاڑی میں بات کرتے دیکھا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس لڑکے نے فرازین کو دیکھ کے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ اس کی اس حرکت پر فرازین نے تیزی سے اپنا رخ موڑ لیا مگر وہ تب تک اپنی گاڑی آگے بھگا کے لے گیا تھا۔ فرازین رات لیٹی ہوئی اس لڑکے کو سوچے جا رہی تھی اس کا دل چاہا کہ پاس بیٹھی دادی کو بولے دادی مجھے شہزادہ نظر آ گیا۔
"فرازین بیٹا تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" رخسانہ بیگم لیٹی ہوئی فرازین کا سر سہلاتی ہوئی بولیں۔
"جی دادی......" وہ ان کی جانب متوجہ ہوگئی۔
"بیٹا میں بہت بیمار رہنے لگی ہوں اب ڈر لگا رہتا ہے کہ پتا نہیں کب موت کا بلاوا آ جائے۔"
"اللہ نہ کرے دادی کیسی باتیں کرتی ہیں۔" وہ اٹھ کے بیٹھ گئی اور روہانسی ہو کر رخسانہ بیگم کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''بیٹا مجھے سب سے زیادہ تمہاری فکر ہے میں چاہتی ہوں اپنی زندگی میں تمہاری شادی کردوں۔''

''پردادی میں تو ابھی میٹرک میں ہوں میری پڑھائی.....'' وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں بیٹا جتنا دل چاہے تم پڑھنا ابھی صرف تمہارا نکاح کریں گے۔ بیٹا میں یہ اطمینان لے کر اپنے ساتھ جانا چاہتی ہوں مجھے ڈر لگتا ہے میرے بعد پتا نہیں عالیہ تم سے کیا سلوک کرے۔ صدیق کی بھی خواہش ہے کہ تم اس کی بہو بنو تمہیں نومی بیٹا بہت خوش رکھے گا۔'' فرازین پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دادی کی جانب دیکھنے لگی۔ رخسانہ بیگم اس کی آنکھوں میں لکھے خوابوں سے بے ساختہ نظریں چرا گئیں۔

''میں جانتی ہوں نومی ویسا نہیں ہے جیسا میری بچی کی چاہ ہے پر میں بیٹا دعا کروں گی وہ تمہیں ضرور شہزادی کی طرح رکھے۔ یہ گھر محل جیسا تو نہیں پر میری دعا ہے کہ تمہارے لیے اس گھر میں اتنا سکون ہو کہ یہ گھر محل ثابت ہو تمہارے لیے۔'' رخسانہ بیگم کی بات پر وہ آنسو پی کر رہ گئی اس رات فرازین تکیے میں منہ چھپائے شدت سے روئی، ساتھ لیٹی رخسانہ بیگم اس کی دبی دبی سسکیوں سے غافل نہ تھیں۔

''میری دعا ہے کہ اللہ میری فرازین کو اس کے خوابوں کی نیک تعبیر عطا کرے۔'' رخسانہ بیگم اس کی پشت تھپکتے ہوئے محبت سے بولیں مگر فرازین ساکت لیٹی اپنے خوابوں کا ماتم کرتی رہی۔ دوسرے دن نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح سے کانپ رہے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیختی روتی کسی جنگل بیابان میں نکل جائے اور اتنا روئے کہ اس کا دم نکل جائے اس کی نگاہ برابر بیٹھے نعمان پر پڑی جس کی خوشی دیدنی تھی۔

''میں آج بہت خوش ہوں فری۔'' نعمان اس کے کان میں دھیرے سے سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ بمشکل مسکراتے ہوئے اس نے نعمان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ فربہی مائل سے سانولے چہرے پر ہلکی ہلکی شیو اس کی رنگت کو اور سانولا بنا رہی تھی۔ جھم سے اس کی نظروں میں کسی کا چہرہ آ گیا۔

''نہیں نہیں اب نہیں۔'' وہ بے بسی سے اپنے بے چین دل کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

سمجھ سکے نہ لوگ سیانے
عشق کا رتبہ عشق ہی جانے......

☆......☆......☆

دونوں باتیں کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ اچانک اس کے ساتھ چلتے وجود کے قدموں میں تیزی آ گئی وہ بھی اس کے ساتھ چلنے کی سعی میں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا رہا تھا۔ مگر اس کوشش میں وہ ناکام ہو رہا تھا۔ اس نے اس کے پیچھے تقریباً دوڑنا شروع کر دیا کہ راستے میں پڑے پتھر سے اٹک کر وہ بری طرح سے اوندھے منہ جا گرا اپنے وجود کو سنبھالتے ہوئے اٹھا اور اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا مگر اس قدر اندھیرے میں اس کی نگاہیں اسے ڈھونڈنے سے قاصر تھیں وہ آہستگی سے آگے بڑھنے لگا کہ ہلکی چاندنی روشنی میں اسے کچھ فاصلے پر کھڑی وہ نظر آ گئی اس نے اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا وہ بری طرح سے ہانپ رہا تھا اس تک پہنچنے کی کوشش میں وہ کامیاب ہو چکا تھا وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ اُس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا

تو اب وہاں وہ وجود نہ تھا جو اس کے ساتھ چل رہا تھا اب وہاں کوئی اور کھڑا تھا جو آنکھوں میں یاسیت لیے اسے تک رہا تھا۔ وجدان کی گھبرا کر آنکھ کھلی وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا سائیڈ ٹیبل سے جگ اُٹھا کر پانی گلاس میں ڈال کر غٹاغٹ پی گیا کیسا خواب تھا یہ وجدان بیڈ کراؤن سے لگتے ہوئے اپنے خواب کو سوچنے لگا عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی اس کے دل پر اپنی سوچوں کو جھٹکتے ہوئے وجدان پاس سوئی حریم کو جھک کر پیار کرنے لگا۔ سوئی ہوئی حریم باپ کے پیار سے کسمسا گئی۔ وجدان اس کے کسمسانے پر مسکرا دیا۔

☆......☆......☆

''کیا کر رہے ہو؟'' جہاں آراء بیگم بولتے ہوئے اس کے پاس لان میں چلی آئیں جو کینوس پر جھکا مہارت سے اسٹروک لگا رہا تھا۔

''ارے واہ زبردست......'' پینٹنگ کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں

''تمہاری پینٹنگز کی تو میں بھی فین ہوں۔'' جہاں آراء بیگم مسکرا کر بولتے ہوئے وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''اور میں آپ کا فین ہوں ڈینی۔'' شرارت سے گرینی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہاری ایگزیبیشن کیسی رہی۔''

''بہت زبردست۔'' سیل کی بیپ پر وہ سیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ نمبر دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکن آ گئی کال کاٹ کر ٹیبل پر سیل رکھ کر وہ دوبارہ اپنی پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کس کی کال تھی۔

''پتا نہیں گرینی......'سیل دوبارہ بجنے لگا اس بار اس نے سیل بجنے دیا۔ جہاں آراء نے جھک کر ٹیبل سے سیل اُٹھا لیا اور کال اٹھا کے بات کرنے لگیں۔

''ہاں میرے ساتھ ہی ہے وہ'' سیل اس کی جانب بڑھانے لگیں۔

''ہیلو جی فرمائیں......'' ڈینی بیزار کن لہجے میں بولا۔

''کیسے ہو میری جان......'' دوسری جانب مہوش اس کی آواز سن کر خوشی سے کھل اٹھیں۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ نے کال کیوں کی ہے؟''

''میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں میری جان' ماں ہوں' تمہاری۔'' مہوش روتے ہوئے تڑپ کے بولی۔

''سوری آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے میری ماں تب ہی مر گئی تھی جب میں بارہ سال کا تھا۔'' کہتے ہوئے اس نے سیل ٹیبل پر پٹخ دیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے ڈینی۔'' جہاں آرا بیگم اس کی بدتمیزی پر اسے گھور کر رہ گئیں۔ وہ خاموشی سے برش اُٹھا کر پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جہاں آرا بیگم حق دق سی اس کی حرکت کو دیکھنے لگیں۔ جو برش بے دردی سے پورے کینوس پر پھیر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے پورا کینوس سیاہ ہو گیا۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' وہ پینٹنگ کا حشر دیکھ کے افسوس سے بولیں۔

''اتنی خوبصورت پینٹنگ کا حشر کر ڈالا'' وہ اس کی محنت کو برباد دیکھ کے بولیں۔

''میرے دل سے زیادہ برباد نہیں ہوئی یہ پینٹنگ گرینی جن کے دل برباد ہونا ان کے لیے مشکل نہیں ہوتا اپنی محنت کو اجاڑ دینا کیونکہ ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''اچھا یہاں بیٹھو میرے پاس۔'' جہاں آرا اسے اپنے برابر کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولیں۔

''میری جان ایسا غصہ نہیں کرتے۔'' ماتھے پر بکھرے اس کے بالوں کو محبت سے سنوارتے ہوئے بولیں۔

''ایسی ہوتی ہے ماں کیا گرینی۔'' ضبط کی شدت سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

جہاں آراء نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ جہاں آراء اور ان کے شوہر کا تعلق امیر و کبیر گھرانے سے تھا۔ جہاں آراء اک عبادت گزار خاتون تھیں ایک تقریب میں اُن کو مہوش اس قدر اچھی لگی کہ انہوں نے اس کی منگنی اپنے اکلوتے بیٹے رضا سے کر دی۔ دو بیٹیاں اور تھیں جو شادی کے بعد باہر اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھیں۔ شادی کے بعد رضا مہوش کا بہت خیال رکھتے وہ دیوانگی کی حد تک مہوش کو چاہتے تھے ان کی اس قدر دیوانگی کے باوجود بھی مہوش کے سرد جذبات نہ پگھل سکے۔ مہوش ہمیشہ اپنے شوہر اور بیٹے ڈینی سے غافل ہی رہیں۔ رات رات بھر پارٹیوں میں رہنا جہاں آراء نے کئی بار بہو کو سمجھانا چاہا مگر اس کی ہٹ دھرمی پر وہ دل مسوس کے رہ جاتیں۔

ڈینی اس وقت بارہ سال کا تھا جب اس کی چھوٹی بہن لائبہ جو فقط چار برس کی تھی سخت بیمار ہوگئی۔ اس کی اپنی چھوٹی بہن میں جان تھی۔ مہوش کی لاپروائیوں کی وجہ سے وہ بچی اس دنیا سے چلی گئی یہاں سے مہوش اور رضا کی لڑائی شروع ہوئی۔ لائبہ کی موت کے بعد سے ڈینی کو اپنی ماں سے نفرت ہوگئی تھی۔ اور پھر ایک دن رضا نے مہوش کو کسی سے فون پر بات کرتے دیکھ لیا۔

''محبت کرتی ہوں میں اُس سے کلاس فیلو تھا میرا یہ میرے باپ نے میری ایک نہ سنی اور تم سے کر دی شادی۔'' وہ نفرت سے رضا کو دیکھتے ہوئے طلاق کا مطالبہ کرنے لگیں۔

''میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ میں خلع کا کیس دائر کر دوں گی تم پر......''

''میں تمہیں کیسے طلاق دے دوں میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' رضا بے بسی سے بولے۔

''پر میں تم سے محبت نہیں کرتی۔''

''مہوش تم پر طلاق کا داغ لگ جائے گا۔'' یہ کیسی محبت تھی اس مرد کی اس عورت سے کہ اسے اس پر طلاق کا داغ لگ جانے کی فکر تھی۔

''تم اِس فکر میں مت گھلو میں دوسری شادی کرلوں گی۔'' مہوش بے حسی سے بولی۔

''لوگ کیا بولیں گے کہ ایسی کیا بات تھی کہ شادی کے تیرہ سال بعد طلاق لے لی۔''

''میں صرف اور صرف اپنے باپ کی زندگی تک چپ تھی کیونکہ میں جانتی تھی اگر میں نے کوئی ایسا قدم اٹھایا تو میرا باپ میری شکل نہیں دیکھے گا۔''

''ایک بار پھر سوچ لو ہمارا بیٹا بھی ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں سوچنا۔'' مہوش خود غرضی سے بولی۔

''کیا میری محبت بھی تمہارے پیروں میں زنجیر بن کر روکنے سے تمہیں قاصر ہے۔''

''تمہاری محبت اور تمہارا ساتھ میرے لیے صرف اذیت تھا یہ تیرہ سال میں نے بس اذیت میں گزارے۔ ہاں اگر تم مجھے رہا کر دو تو میں تمہیں ضرور دعا دوں گی۔'' رضا اس کی بات پر بہت خاموشی سے چپ چاپ مڑ گئے۔

''رضا مجھے طلاق چاہیے۔'' مہوش اس کو جاتا دیکھ کر حلق کے بل چلائی اس کی نظر دروازے کے پاس کھڑے ڈینی پر پڑی جو نجانے کتنی دیر سے وہاں کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی غصے کی لہر ان کے تن بدن میں دوڑ گئی۔ آگے بڑھ کر اس کے گالوں پر کس کس کر دو تھپڑ مار کر اسے زور سے دھکا دیا۔

''دفع ہو جاؤ اپنے باپ کے پاس۔'' کہتے ہوئے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

دروازہ زور سے بجانے پر صبح مہوش کی گھبرا کر آنکھ کھلی۔

''کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔'' دروازہ کھول کر مہوش ملازمہ پر چیخنے لگی۔

''وہ باجی وہ صاحب......'' ملازمہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھی۔ وہ ملازمہ کو ہٹا کر دوسرے کمرے کی جانب بڑھی۔ سامنے کا منظر دیکھ کے اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے رات کسی وقت رضا کا برین ہیمبرج ہو گیا اور بروقت طبی امداد نہ ملنے کے باعث وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ جس وقت رضا تکلیف سے تڑپ رہا ہو گا اس وقت مہوش آرام سے اپنے کمرے میں بند فون پر عشق بگھار رہی ہو گی؟ سوچ کر ہی جہاں آراء بیگم کو اس عورت سے نفرت ہونے لگی۔ جو اُن کے جوان جہان بیٹے کو کھا گئی۔

وہ سارے منظر ڈینی کی آنکھوں میں جیسے بس سے گئے تھے۔ دادی کا بلکنا' ماں کا بے رحمی سے باپ کی لاش کو دیکھنا وہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب کبھی بھلا نہ پایا۔

رضا کی موت مہوش کے لیے رہائی نہیں بلکہ آزمائش بن کر آئی تھی۔ وہ امریکہ چلی گئی تھی اپنے کلاس فیلو کے پاس مگر اس کے کلاس فیلو وقار نے مہوش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

''میں نے تم سے شادی کا وعدہ کب کیا تھا ہم بس اچھے دوست ہیں اور ایک ساتھ اچھا وقت گزارتے ہیں تم اتنی مڈل کلاس سوچ کیسے رکھ سکتی ہو۔'' وقار کے الفاظ گویا بم کی مانند مہوش کی سماعتوں پر گرے۔ کتنی پاگل تھی وہ جو اس انسان کے لیے اپنی ہنستی بستی دنیا اپنے ہی ہاتھوں سے اجاڑ بیٹھی۔ اس نے وقار کے سامنے بار ہا ہاتھ جوڑے منت سماعت کی مگر وہ تو ایک عیاش آدمی تھا۔ ذمہ داری اٹھانا اُس کی سرشت میں تھا ہی نہیں یوں مہوش اُس کے اشاروں پر ناچتی چلی گئی کوئی اور راستہ بھی تو نہ تھا واپسی کے تمام راستے خود بخود بند ہوتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

کیا ہوا تمہیں، اتنی چپ کیوں ہو؟'' عائشہ خاموش بیٹھی گل کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''یار مجھے لگتا ہے مجھے یہ جاب چھوڑ دینی چاہیے عاشی۔''

''ارے کیوں بھئی اچھی خاصی تو تمہاری جاب چل رہی ہے۔'' عائشہ اس کی بات پر حیران ہوتے ہوئے بولی۔

گل اسکول میں ٹیچنگ کر رہی تھی اور وہ اپنی جاب سے خوش بھی تھی۔

''یار جب سے یہ نئے پرنسپل آئے ہیں نہ......'' گل کہتے کہتے رُک سی گئی۔

''ہاں پھر کیا ہوا عائشہ......'' اس کی چپ پر فکرمندی سے بولی۔

''یار کچھ عجیب سے ہیں اُن کی نظریں بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ بار بار اپنے آفس بلانا اور ایسے دیکھنا بس مجھ سے نہیں ہو گی اب یہ جاب......'' گل روہانسی ہو کر بولی۔

''اچھا تم پریشان نہ ہو میں تمہارے لیے دوسری کسی اچھی جاب کا انتظام کرتی ہوں۔'' عائشہ کی بات پر گل ممنون نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تھینک یو عاشی، تم بہت اچھی ہو مجھے لگتا ہے اگر میری کوئی بہن ہوتی نہ وہ تمہارے جیسی ہی

ہوتی۔'' گل محبت سے عائشہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''یہ تھینک یو کس خوشی میں ہو رہا ہے۔'' عاشی مصنوعی خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اور لگتا ہے کیا مراد ہے میں تمہاری بہن ہی ہوں میں تو تمہیں اپنی بہن مانتی ہوں اپنے دل کی سب بات کہہ دیتی ہوں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' گل شرارت سے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولی۔

''اچھا جب میں نہیں ہوں گی نہ تو پھر دیکھنا کیسے ترسو گی۔'' عائشہ شریر لہجے میں بولی۔

''اللہ نہ کرے عاشی کیا اول فول بکتی ہو۔'' گل دہل کے بولی۔

''یار مذاق کر رہی ہوں۔'' گل کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اسے اپنی جان پر بنتی محسوس ہوئی۔

''مجھ میں اب کچھ بھی کھونے کی سکت نہیں ہے۔ مت کیا کرو عاشی ایسا مذاق جانتی بھی ہو نہ میرا اور تمہارا مشترکہ دکھ کیا ہے کہ ہم دونوں کا کوئی بھی نہیں ہے اور اک ہی تو خوشی ہے دونوں کے پاس کہ جو کچھ بھی ہے اب ہم ہی اک دوسرے کے ہیں۔''

''سوری گل مجھے معاف کر دو۔ آئندہ میں ایسا مذاق بھی نہیں کروں گی۔'' عاشی اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

''چلو جلدی سے کان پکڑو اور مرغا بنو۔'' گل شرارت سے بولی۔

''او کے جی کان پکڑ لیے پر ایک مسئلہ ہے میڈم جی...... '' عائشہ دونوں کان پکڑے چہرے پر مظلومیت طاری کرتے ہوئے بولی۔

''میں مرغا نہیں بن سکتی آپ بولو تو مرغی بن جاؤں۔'' عائشہ شریر لہجے میں بولی۔ اس کی بات پر گل زور سے ہنس دی۔

''چلو اب کھڑی ہو تم نے جانا نہیں ہے سائرہ کے ساتھ مارکیٹ دوپہر کا ایک بج رہا ہے۔'' گل گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں دیکھوں میں جا کر میڈم تیار ہوئی بھی یا نہیں مارکیٹ میں بھی ایسے تیار ہو کر جائے گی جیسے کسی شادی میں شرکت کے لیے جا رہی ہے۔'' عائشہ منہ بنا کر برابر روم میں رہائش پذیر سائرہ کا ذکر کرتے ہوئے بولی۔

''اچھا تم نے کچھ منگوانا ہے تو بتا دو۔'' عائشہ دروازے سے نکلتے نکلتے رُک کر پوچھنے لگی۔

''نہیں کچھ نہیں منگوانا بس جلدی آنا وارڈن کا پتہ ہے نا......''

''ہاں جلدی آ دوں گی۔'' عائشہ کے جانے کے بعد گل کسلمندی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ آج دونوں ہی جاب پر نہیں گئی تھیں۔

''کیا کروں اب۔'' عائشہ کے جاتے ہی وہ بوریت کا شکار ہونے لگی۔ اچھا خاصا کل سے عائشہ بول رہی تھی ساتھ چلنے کا میں چلی ہی جاتی۔ گل کو افسوس ہونے لگا۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے چلو نماز ہی پڑھ لوں۔ گل نماز کا وقت دیکھ کے کھڑی ہو گئی۔

''اور ہم شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔'' قرآن پاک پڑھتے ہوئے گل کی نگاہیں آیت پر ٹھہری گئیں۔ اس کے دل کو ڈھارس سی ملی یہ آیت ہمیشہ اس کے بے چین دل کو سکون پہنچاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آیت اس کے لیے مرہم کی طرح تھی جو اس کے جلتے دل کو قرار بخشتی تھی۔

وہ اس آیت کو دھیرے دھیرے سے پڑھے جا رہی تھی۔ بار بار اس کو اپنے اندر توانائی بھرتی نئے سرے سے محسوس ہوئی نجانے وہ کتنی دیر تک

بیٹھی پڑھتی رہی۔ جب وہ اٹھی تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کی چھائی ہوئی بے چینی کا اب نام ونشان نہ تھا۔

☆......☆......☆

ڈینی بیڈ پر لیٹا میوزک انجوائے کر رہا تھا کہ سیل پر آتی مہرین کی کال کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''ڈینی مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے کیا آج شام تم مجھے مل سکتے ہو۔'' مہرین کال پر پوچھنے لگی۔

''چلو ٹھیک ہے ڈن ہے۔''

''اچھا سنو پلیز مانی کو نہ بولنا ملنے کا وہ آ جائے گا میں تم سے اکیلے ملنا چاہتی ہوں' اکیلے میں بات کرنی ہے۔'' مہرین کی بات پر ڈینی نے ہامی بھر لی۔ شام وہ کلب میں بیٹھی بے چینی سے ڈینی کا انتظار کر رہی تھی۔ اپنی طرف آتا دیکھ کے ڈینی کو مہرین دلکشی سے مسکرا دی۔

''اوہ بیوٹی فل گرل۔'' ہونٹ سکیڑے سیٹی کے اسٹائل میں اسے ستائشی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ جو بلیک اسکرٹ اور پنک بلاؤز میں گولڈن بالوں کی پونی بنائے ہلکے پنک میک اپ میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

''تھینک یو۔'' مہرین دلکشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں اب بولو کیا بات کرنی ہے۔'' ڈینی اسے توجہ سے دیکھتے ہوئے بولا

''یہاں نہیں کہیں لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔''

''اچھا چلو صحیح ہے۔'' اس کی بات پر وہ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

''اب بولو اتنا تجسس پھیلائے ہوا ہے۔'' ڈینی ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

''پاپا مجھے امریکہ بلانا چاہتے ہیں اپنے پاس، وہ چاہتے ہیں کہ میں ہائر اسٹڈی کے لیے امریکہ آ جاؤں۔''

''اوہ...... مہرین تو تم چلی جاؤ گی ہمیں چھوڑ کر یار...... نہیں یار......'' ڈینی اُداس ہو کر بولا۔

''تم چاہتے ہو کہ میں یہاں رُک جاؤں۔''

''ہاں یار میں تو بالکل چاہوں گا کہ تم نہ جاؤ آخر کو ہمارا گروپ ہے۔''

''تو تم مجھے روک لو نا ڈینی......'' مہرین آنکھوں میں حسرت لیے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ڈینی چونک کر اسے دیکھنے لگا یہ وہ مہرین تو نہ تھی اتنی بکھری ہوئی۔

''میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں ڈینی۔'' وہ اس کا مضبوط ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا مہرین......'' ڈینی سنجیدگی سے لب بھینچ کے بولا

''تو اب سوچ لو......''

''سوری مہرین تم میری چاہ نہیں بلکہ میری لائف میں کوئی بھی ایسی لڑکی نہیں ٹھیک ہے میری گرل فرینڈز ہیں پر میں نے کبھی کسی لڑکی کو مستقبل کے سنہری سپنے نہ دکھائے اور نہ کسی سے شادی کے وعدے کیے۔''

''تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔'' مہرین آنکھوں میں نمی لیے اس کی صاف گوئی پر بولی۔

''ہاں......'' وہ مہرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے جواب پر مہرین چپ سی ہو گئی۔ سارا راستہ دونوں خاموش رہے۔ مہرین خود پر ضبط کیے بیٹھی رہی۔ اپنی محبت کو خود سے دور ہوتا دیکھنا اس کے لیے تکلیف دہ ہی تھا۔ ڈینی نے گاڑی کلب کے پاس روک دی اترتے ہوئے مہرین نے اک

آخری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور اس کی صورت کو آنکھوں میں سموتے ہوئے اُتر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے بھی چلی گئی۔

''مہرین تم مجھے اپنی ماں کا عکس لگتی ہو بلکہ تم جیسی ہر عورت میں مجھے اپنی ماں کا عکس دکھائی دیتا ہے تم جیسی عورتیں میری چاہ کبھی نہیں رہیں میری چاہ پاکدامن عورت ہے۔'' ڈینی سوچنے لگا مگر وہ یہ بھول بیٹھا تھا کہ وہ خود کیا ہے۔

☆......☆......☆

''اتنے چپ چپ کیوں ہو؟'' جہاں آراء اسے صوفے پر خاموش بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''نہیں گرینی بس دل اداس ہے۔'' ڈینی اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا جہاں آراء اس کا سر دھیرے دھیرے سہلانے لگیں۔

''ماں سے بات کر لو ہو سکے دل کی اُداسی دور ہو جائے۔''

''آپ مجھ سے کوئی اور بات کریں۔'' جہاں آراء کے مشورے پر خفگی سے انہیں دیکھتا ہوا بولا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے مجھے کوئی درد نہیں میں نے بھی اپنا بیٹا کھویا ہے اور وجہ وہ عورت تھی۔ جتنی شدید نفرت مجھے مہوش سے تھی۔ اس کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہے اولاد کا غم انسان کو جیتے جی مار ڈالتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے میرا جوان بیٹا چلا گیا۔'' کہتے کہتے جہاں آراء ہچکیوں سے رونے لگیں۔ ان کے رونے پر ڈینی اُٹھ کے بیٹھ گیا۔

''مت روئیں گرینی ورنہ میں بھی رو دوں گا۔'' اُن کو سینے سے لگاتا ہوا بولا۔

''جب آپ کو خود ان سے نفرت ہے پھر کیوں اتنا اصرار کرتیں ہیں کہ میں اُن سے بات کروں۔''

''بیٹا مجھے اس سے نفرت تھی پر اب مجھے اس سے ہمدردی ہے رحم آتا ہے مجھے اس پر اپنے کیئے گئے گناہ کی سزا وہ بھگت چکی ہے کوئی دن ایسا نہیں اتنے برسوں میں جب وہ فون پر مجھ سے معافی نہ مانگتی ہو۔ بیٹا میں کون ہوتی ہوں پھر اسے کچھ کہنے والی۔ اللہ سے بڑا کوئی انصاف کرنے والا نہیں۔ جس کے لیے اس نے اپنا پیار کرنے والا شوہر اور اولاد کو چھوڑا اس شخص نے اسے اپنانے سے انکار کر دیا کیا یہ اذیت کم ہے اس کے لیے وہ تڑپتی ہے تم سے بات کرنے کو مجھے اس کی بے بسی پر ترس آتا ہے۔''

''پتہ نہیں گرینی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا میرا دل اندر سے ایسا ویران ہو جاتا ہے بعض اوقات کہ اتنے شور میں بھی میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں ایسا لگتا ہے کوئی تشنگی ہے میرے اندر۔ نماز پڑھا کرو بیٹا بہت سکون ہے رب کے ذکر میں کتنا میں تم کو بولتی ہوں کہ ڈینی بیٹا نماز پڑھا کرو اس کے آگے ہی سر جھکانے میں بھلائی ہے۔''

''میں جانتی ہوں جس ماحول میں تم نے آنکھ کھولی وہاں کے لوگ اس قدر دنیا کی چمک دمک میں کھوئے ہیں کہ ان کو رب بھی یاد نہیں۔'' جہاں آراء بیگم کا اشارہ اس کے ننھیال والوں کی طرف تھا۔

''پر بیٹا پرورش تو میں نے کی ہے نہ تمہاری دادی نے، میں تو تمہیں بولتی ہوں کہ پڑھا کرو نماز، قرآن پاک پڑھو پھر دیکھو کیسا اللہ تمہارے ویران دل کو شاد کرتا ہے۔'' ڈینی سر جھکائے خاموشی سے اُن کو بولتا سن رہا تھا۔

☆......☆......☆

''میرے اللہ مجھے معاف کردے میں اتنے برس تک امانت میں خیانت کرتی رہی تو میرے دل کو اس شخص کی جانب پھیر دے جس کی میں ہوں اور اس شخص کی محبت کو میرے دل سے نکال دے جو میرا ہے ہی نہیں جو مجھے جانتا تک نہیں میرے اللہ تو نے ڈالی ہے اس اجنبی شخص کی محبت میرے دل میں اب تو ہی نکال دے اس کی محبت کو میرے دل سے۔'' فرازین زار و قطار روتے ہوئے نماز کے بعد دونوں ہاتھ اٹھائے دعا کر رہی تھی۔ دعا مانگنے کے بعد وہ پُرسکون ہوگئی دونوں ہاتھ سے آنسو صاف کرتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

''فرازین چائے لے آؤ۔'' نعمان کی آواز پر وہ کمرے سے نکل گئی۔ فرازین چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ جو تخت پر عالیہ کے برابر لیٹا تھا۔

''آپ آفس سے کب آئے۔''

''ابھی آیا ہوں۔ دس منٹ پہلے ہی امی کو فرازین تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' نعمان برابر بیٹھی سبزی بناتی عالیہ کو دیکھتا بولا مگر اس کی آنکھوں میں شرارت صاف ناچ رہی تھی۔ اگلے ماہ میں تم دونوں کی رخصتی کر رہی ہوں تمہیں جو سامان لینا ہے۔ فرازین میرے ساتھ چلی چلنا۔'' عالیہ سبزی بناتے ہوئے بولیں۔

اگلے ماہ تائی جان' فرازین حیرت میں ڈوبی آواز میں بولی۔

''کیوں بی بی آپ کو کوئی اعتراض ہے اگلے ماہ آپ کی کوئی میٹنگ ہے تو بتادیں۔'' عالیہ طنزاً اس کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''نہیں تائی وہ بس میں تو پوچھ رہی تھی۔'' عالیہ کی بات پر فرازین گھبرا کر بولی۔

''امی نے سوچا لڑکی نے بی اے کرلیا تو اُس کا بیاہ بھی کردینا چاہیے۔ نعمان شوخی سے بولا۔ عالیہ نے اک تیز نگاہ برابر لیٹے نعمان پر ڈالی انہیں بیٹے کی اس قدر شوخی بھائی نہیں۔

''اچھا اک بات اور اگلے ہفتے میری بھانجی ماہم اسلام آباد سے رہنے آرہی ہے یہاں اس کا پورا خیال رکھا جائے۔''

خالہ نے تو کبھی ہم سے ملنا ملانا پسند نہیں کیا اب کیا ہوگیا۔ نعمان حیرت میں ڈوبی آواز میں بولا۔

''اچھا اب زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں سگے سگے ہوتے ہیں۔ وہ میری بہن ہے میں آئندہ نہ سنو تمہارے منہ سے ایسا کچھ عالیہ نعمان کو لتاڑتے ہوئے بولیں۔

انہیں فرازین کے سامنے نعمان کی صاف گوئی پر غصہ آگیا تھا۔

فرازین اس کو کوئی شکایت نہ ہو ہم سے ہر طرح سے اس کا خیال رکھنا ہے۔ جی تائی جان...... فرازین اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

☆......☆......☆

''یار عثمان تم سے جو کام کہا تھا وہ کیا۔'' وجدان اپنے کمرے میں آتے عثمان کو دیکھتا ہوا بولا۔

''ہاں یار میں نے ماریہ کو بولا تو ہے کہ کوئی گورنس ارینج کردے حریم کے لیے پر وہ بول رہی تھی وجدان سے بولو شادی کرلے۔''

''اپنی بیوی کو بولو اپنے مشورے اپنے پاس رکھے۔'' وجدان اس کی بات پر چڑتے ہوئے بولا۔

''یار ماریہ غلط نہیں بول رہی تم شادی کرلو دیکھو حریم ابھی بہت چھوٹی ہے اس کو ماں کی

ضرورت ہے۔''

''کیا پتہ جس سے میں شادی کروں وہ میری بیٹی کو اپنی بیٹی ہی نہ سمجھے اور اُلٹا میری بیٹی کو مجھ سے دور کر دے۔''

''وجدان ضروری نہیں جیسا تم سوچ رہے ہو ویسا ہی ہو۔''

''پھر تم کر رہے ہو گورنس کا بندوبست یا میں کسی اور کو بول دوں۔''

''اچھا اچھا ایک دو دن میں کچھ کرتے ہیں۔'' عثمان اُس کے تیور دیکھ کر جلدی سے بولا۔

''ویسے یار مجھے پتہ نہیں تھا ماریہ نے یہ کام بھی شروع کر دیا کون سا کام۔'' عثمان اس کی بات پر پوچھنے لگا رشتے کرانے کا ماریہ کے شادی کے مشورے پر وہ شرارت سے بولا۔''

اس کی بات پر عثمان نے پاس پڑا کشن اُسے اُٹھا کے مار دیا جس کو کیچ کر کے وجدان ہنس دیا۔

☆......☆......☆

''یہ لو گل یہاں چلی جانا۔'' عائشہ اس کی طرف کارڈ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ کیا ہے گل۔'' کارڈ ہاتھ میں لے کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''یار ان کو اپنی بیٹی کے لیے گورنس کی ضرورت ہے بے فکر رہو اچھی فیملی ہے تم یہاں جا کر دیکھو۔''

''ٹھیک ہے میں جاتی ہوں کل ہی۔'' اس کی بات پر گل ہامی بھرتے ہوئے بولی۔

''گل مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' عائشہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں بولو......''

''وہ گل میں روحان سے ملنے اس کے گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''کیا تمہارا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا۔'' اس کی بات پر گل تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

''میں بس اس سے ایک آخری بار ملنا چاہتی ہوں میں اس سے وجہ پوچھنا چاہتی ہوں ایسی کیا وجہ تھی کہ اس نے مجھے یوں چھوڑ دیا۔ صرف ایک آخری بار......'' وہ گل کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے جب تم نے فیصلہ کر ہی لیا تو بتا بھی کیوں رہی ہو۔'' گل سپاٹ لہجے میں کہتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

''تم ناراض ہو گئیں۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے روکتے ہوئے عائشہ بولی۔

''تم جب جانا ہی چاہ رہی ہو میں اب تم کو کیا کہہ سکتی ہوں۔'' گل ہاتھ چھڑا کر اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

وہ کارڈ ہاتھ میں لیے ہوئے غور سے ایڈریس دیکھ رہی تھی وہ ایک پوش علاقہ تھا۔ گل ایک خوبصورت سے بنگلے کے پاس آ کر رُک گئی۔

''یہ وجدان صاحب کا گھر ہے۔'' باہر بیٹھے گارڈ سے وہ تصدیق کرنے لگی۔

''جی یہ اُن کا ہی گھر ہے۔'' گارڈ کو وہ اپنے آنے کی وجہ بتانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ملازم کی ہمراہی میں ایک خوبصورت سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

''آپ بیٹھیے میں صاحب کو بلاتا ہوں۔'' ملازم کے جانے کے بعد وہ پُرشوق نگاہوں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی۔ وال ٹو وال بچھا خوبصورت سفید دبیز قالین سفید صوفے اُن پر رکھے کشن جس پر سنہری اسٹون لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر لگی پینٹنگز مالک کے اعلیٰ ذوق کا پتہ دے رہی تھی۔ کمرے میں رکھے جا بجا کرسٹل کے

بیش قیمت شوپیس کمرے کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کررہے تھے۔ محرابی بڑی بڑی کھڑکیوں سے باہر لان کا دلفریب نظارہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''سوری میری وجہ سے آپ کو ویٹ کرنا پڑا۔'' وجدان نے آتے ہی معذرت کی۔ گل بے ساختہ کھڑی ہوگئی دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر چونکے۔

''بیٹھیے پلیز......'' وجدان صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''دراصل مجھے اپنی بیٹی کے لیے ایک گورنس کی ضرورت ہے صبح سے شام تک کے لیے میں آفس سے شام تک آتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ کوئی ہو جو میرے پیچھے میری بیٹی کا خیال رکھ سکے۔''

''کتنی بڑی ہے آپ کی بیٹی۔'' گل نے دھیرے سے پوچھا۔

''وہ چار ماہ کی ہے۔ آپ کو کوئی مسئلہ تو نہیں......'' اس کو خاموش دیکھ کر وہ بولا۔

''نہیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں میں کل سے آجاؤں گی۔'' گل سر جھکائے جھکائے بولی۔ اس سارے عمل میں اس کے چہرے کی جانب نہیں دیکھا تھا۔

''آپ کی مسز کہاں ہیں؟''

''وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔'' اس کی بات پر وہ ساکت سی ہوگئی۔

☆......☆......☆

''تم کیا آنکھیں بند کر کے کام کرتی ہو' اتنا زیادہ نمک ڈال دیا کھانے میں۔'' عالیہ فرازین پر برس پڑیں۔

''دیکھو اس بے چاری سے کھایا تک نہیں جارہا۔'' وہ ماہم کو کھانے سے ہاتھ کھینچتا دیکھ کر افسوس سے بولیں۔ فرازین کا دل چاہا عالیہ سے بولے۔

''اس کو یہ کھانے کہاں اچھے لگیں گے۔''

''خالہ آپ کی بہو تو واقعی بہت نالائق ہے۔'' ماہم ہونٹوں پر دل جلا دینے والی مسکراہٹ سجائے فرازین کو دیکھ کے بولی۔

اس کی بات پر فرازین خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ شام نعمان جبھی آیا تو ماہم کے ساتھ باہر اس کو شاپنگ کرانے لے گیا جب سے ماہم آئی تھی اُس کی اور نعمان کی بہت دوستی ہوگئی تھی۔ فرازین حیران تھی کہ کہاں تو نعمان ماہم کے نام سے چڑ جاتا تھا اور اب کہاں اتنی دوستی فرازین کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

رات دونوں تھکے ہوئے گھر آئے فرازین نے کھانے کا پوچھا۔

''نہیں میں اور نومی تو باہر کھا کر آئے ہیں۔'' ماہم جتاتی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی بات پر وہ چپ سی ہوگئی۔

''امی فرازین کہاں ہے؟'' نعمان عالیہ کے کمرے میں آتا ہوا بولا۔

''ارے بیٹا کہاں ہوگی چھت پر ہوگی۔'' عالیہ لاپروائی سے بولیں۔

''چھت پر وہ بھی اس وقت......''

''ہاں تو اور کیا اس کا بس چلے تو ہر وقت چھت پر بیٹھی رہے۔ پہلے تو اتنے چکر نہیں لگتے تھے چھت کے پر اب تو بس موقع چاہیے۔'' ساجدہ بتا رہی تھی اس دن فرازین چھت پر کھڑی سامنے والے اکرم سے بات کر رہی تھی۔ میں نے بولا میں کچھ بولوں گی تو فوراً ہی آنکھوں میں بہو جان کے سیلاب امڈ آئے گا۔'' عالیہ نعمان کے

چہرے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ جو غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں نعمان کی شکی فطرت کو اس کے کمرے سے نکلتے ہی عالیہ کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ آگئی۔

☆......☆......☆

''مہرین کو اس طرح سے نہیں جانا چاہیے تھا۔'' پنکی اُداس لہجے میں بولی۔

''ہاں یار میں تو خود حیران ہو گیا کہ آناً فاناً کیسے امریکہ چلی گئی۔ مانی بولا۔

وہ تینوں ریسٹورنٹ میں بیٹھے لنچ کرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

''ہاں ہمارا گروپ اس کے جانے سے ادھورا ہو گیا۔'' ڈینی بولا۔

وہ خود بھی اپنی دوست کو مس کر رہا تھا مگر اس نے ان دونوں کو اس کے جانے کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ مگر وہ لوگ اس بات سے واقف تھے کہ مہرین ڈینی کو بہت پسند کرتی تھی۔

''میں کلب جا رہا ہوں وہاں صومی میرا انتظار کر رہی ہے۔'' وہ سیل پر صومی کے میسج دیکھتا ہوا بولا۔

''تم لوگ چل رہے ہو۔'' وہ پنکی مانی کو پوچھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''نہیں تم جاؤ مجھے تھوڑی دیر میں کہیں اور جانا ہے۔'' مانی کے کہنے پر وہ دونوں کو بائے بولتا ہوا ریسٹورنٹ سے نکل گیا اور گاڑی کلب کے راستے پر ڈال دی۔ کلب میں داخل ہوا تو صومی اپنی حشر سامانیوں سمیت اس کی منتظر تھی۔ خوبصورت سی دھن پر دونوں ڈانس فلور پر ڈانس کرنے لگے۔ ڈانس کرتے کرتے ڈینی نے اپنے پسندیدہ مشروب کی جانب ہاتھ بڑھایا اور گلاس لبوں سے لگا لیا کہ اچانک اس کے نتھنوں سے عجیب سی بو ٹکرائی۔ ابھی وہ اس بو کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ لوگوں کے شور کی آواز اٹھنے لگی حواس باختہ ہو کر اس نے پیچھے کی جانب دیکھا۔ آگ کے شعلے تھے جو آہستہ آہستہ سے پورے کلب کو گھیر رہے تھے۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے صومی کو دیکھا جو خوف کی شدت سے بری طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی نگاہ کلب کے دروازے پر گئی جہاں آگ کے بڑے شعلے اٹھ رہے تھے۔ وہ بدحواس سا ہو گیا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے کیا اور پھر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس کے لبوں پر ایک ہی پکار تھی۔ ''اللہ اللہ کی......''

☆......☆......☆

گل اپنی جاب سے بہت خوش تھی ایک معقول رقم تھی جو اس کو مل رہی تھی جب تک وہ جاتی وجدان آفس کے لیے نکل رہا ہوتا اور اس کی واپسی پر وہ بھی گھر آ جاتی دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ بس جو بات پہلے دن ہوئی تھی وہی ہوئی تھی۔ گل کو بھی حریم کے ساتھ بہت مزہ آتا تھا اسے یہ جاب کرتے ایک ماہ ہو گیا تھا اور اس ایک ماہ میں گل کو حریم سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ شام گل واپس ہاسٹل آئی تو عائشہ کو کمرے میں نا پا کر حیران ہوئی ورنہ تو ہمیشہ ہی عائشہ اس سے پہلے آ جاتی تھی گھڑی شام کے سات بجا رہی تھی۔ جبکہ عائشہ چھ تک آ جاتی تھی۔ موسم کے تیور بھی ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پر گل نے بے ساختہ جھرجھری لی اور اُٹھ کر کمرے کی کھڑکی بند کرنے لگی۔

''اللہ خیر...... بارش کے آثار لگ رہے ہیں۔ ویسے ہی اتنی ٹھنڈ ہے کہاں رہ گئی یہ عاشی۔'' گل کھڑکی بند کرتے ہوئے عائشہ کے لیے فکرمند ہونے لگی بیڈ پر بیٹھ کر اپنے بیگ سے سیل فون

نکال کر عائشہ کو کال کرنے لگی مگر دوسری جانب سے جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ عائشہ پلیز کال اٹھاؤ گل کا بے چینی کے مارے برا حال تھا۔ بار بھی شروع ہو چکی تھی۔ اس کو عجیب عجیب وسوسے آ رہے تھے۔ آہٹ پر سر اٹھایا تو کمرے کا دروازہ کھول کر عائشہ اندر داخل ہوئی۔

''کہاں تھی تم وقت دیکھا ہے نو بج رہے ہیں۔ اندازہ ہے تمہیں میں کس قدر پریشان تھی۔'' گل اس کو دیکھ کے غصے سے بولی۔ جو پوری بارش کے پانی سے گیلی ہو گئی تھی۔

''جاؤ جلدی چینج کرو بیمار پڑنا ہے کیا تم نے......'' اس کے کہنے پر وہ چپ چاپ واش روم میں گھس گئی۔ کپڑے بدل کر آ کر وہ خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گئی گل کو اس کی خاموشی کھٹک رہی تھی۔

''عاشی تم آج کیا روحان سے ملنے گئی تھی۔'' اس کے پاس آتے ہوئے وہ بولی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

''بتاؤ نہ عاشی تم وہیں گئی تھیں نہ......'' گل نے جھک کر اس کا کندھا ہلایا۔

''کیا تم مجھے اکیلا چھوڑ سکتی ہو۔'' عائشہ اُسے دیکھتے ہوئے درشتی سے بولی۔

''او کے......'' اس کے بولنے پر گل چپ سی ہو کر اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ بار بار وہ عائشہ کے بیڈ کی جانب دیکھتی وہ پوری رات اس ہی انتظار میں جاگتی رہی کہ عائشہ اُٹھ کر اس کے پاس آئے گی مگر عائشہ پوری رات ساکت لیٹی چھت کو تکتی رہی تھک ہار کر گل نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے آنکھیں بند کر لیں۔

صبح گل بہت اکھڑی اکھڑی سی تھی عائشہ جانتی تھی کہ وہ رات کے رویے پر اس سے ناراض ہے۔

''تم مجھ سے ناراض ہو گل؟''

''میں کیوں ناراض ہوں گی نہ مجھے کوئی ایسا حق ہے۔'' گل نے تڑخ کر جواب دیا۔ گل کے سخت لہجے پر عائشہ بکھر کر بولی۔

''تم کیا ہو میرے لیے یہ شاید تمہیں بھی اندازہ نہیں......''

''اوہ رئیلی میں کیا ہوں آپ کے لیے مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔''

''میں سوگ منا رہی تھی یار عائشہ......'' یہ کہہ کر زور سے ہنس دی۔

''کیسا سوگ......'' گل چونک کے پیچھے پلٹ کر عائشہ کو دیکھنے لگی۔

''ہاں یار میں اس دن روحان کی فاتحہ پڑھنے گئی تھی۔'' عائشہ اس کے برابر آ کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔

''موسم اچھا ہو رہا ہے آج بھی بارش کے آثار ہیں۔'' عائشہ باہر کا نظارہ کرتے ہوئے بولی۔

''روحان مر گیا کیا؟'' گل حیرت سے عائشہ سے پوچھنے لگی۔

''اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' عائشہ گل کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کے ہنس دی۔

''میں گئی تھی روحان کے گھر اس سے ملنے کاش میں نہ جاتی اس کے گھر کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی۔ گل اس سے اچھا ہوتا میں بے خبر رہتی یہ جو آگہی کا عذاب ہوتا ہے نہ یہ بھی بڑا تلخ ہوتا ہے۔ اس نے تھوڑا وقت پہلے ہی شادی کر لی تھی بہت مالدار ہے اس کی بیوی بہت فخر سے اس نے اپنی بیگم کا مجھ سے تعارف کرایا۔ میں تو پاگل تھی جو اس کے دروازے پر گئی تھی یہ کہنے کے لیے کہ روحان میں چاہ کر بھی تم کو بھلا

نہ سکی پر مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا اس کی چاہ کیا ہے بھلا بتاؤ دولت کا کیا مقابلہ محبت سے آنسو تو پیسوں کے نوٹوں سے پونچھے جاتے ہیں۔ نہ عائشہ اذیت سے ہنس دی۔

''اس نے اپنی بیوی سے کہا یہ میری دور کی رشتے دار ہے جو ملنے آئی ہے۔'' اور میں حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی کہ لوگ محبت کو کتنے آخری درجے پر رکھتے ہیں جاتے ہوئے روحان نے مجھ سے پتہ ہے اکیلے میں کیا کہا میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو پر محبت سے پیٹ نہیں بھرا جاتا۔ تم بھی کسی مالدار شخص کا ہاتھ تھام لو۔''

''روحان صاحب اپنا جملہ درست کر لو محبت کرتی تھی اب تو افسوس ہے بس یہ کس سے محبت کی۔'' اس کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے اتنے سالوں کی محبت پر لعنت بھیجی کہ جس کی وجہ سے میں اپنے رب سے ناراض رہی۔ اس کے دروازے سے نکلنے سے پہلے میں نے فاتحہ پڑھی اور دروازے سے نکل کے کہا مرحوم بہت ہی لالچی تھا۔

''میں اتنے برس تک اپنے رب سے دور رہی وہ بھی ایک گھٹیا انسان کی وجہ سے میں نے رب سے معافی مانگی ہے انسان کی محبت بندے کو رسوا کر دیتی ہے پر تیری محبت تو بس معتبر کرتی ہے اگر اتنے سال میں نے بس تجھ سے محبت کی ہوتی تو یوں آج رسوا نہیں ہوتی جانتی ہو گل اللہ پاک ہمارے لیے بہت بہتر کرتا ہے ہم انسان نہیں سمجھ پاتے پر وہ ہمیں ہر اس شر سے بچانا چاہتا ہے جو ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوتا۔ روحان بھی تو ایک شر ہی تھا جس کی محبت بس پیسہ ہی پیسہ تھا۔ بہت سے لوگ عاشی ہماری محبت کے قابل نہیں ہوتے ان کے لیے اعتبار و خلوص کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ان کے لیے سب کچھ پیسہ ہوتا ہے ایسے لوگ بڑے نچلے درجے کے ہوتے ہیں۔ گل عائشہ کو دیکھ کے بولی۔

''ہاں جیسے نعمان اور عالیہ وہ بھی تو فرازین گل کے قابل نہ تھے نہ...... عائشہ کی بات پر پاس کھڑی گل بالکل چپ سی ہو گئی اور خاموشی سے اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ عائشہ کہہ کر شرمندہ سی ہو گئی وہ گل کے پاس ہی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

''سوری گل۔''

''سوری کس بات کی۔'' گل حیرانگی سے اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے یوں اس طرح سے نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

''تم نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا عاشی بس اتنے برسوں بعد بھی اُن کا ذکر سن کر مجھے ناگوار ہی لگا میں ایسے لوگوں کا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔''

''اچھا چلو لیٹ جاؤ تم بھی مجھے نیند آ رہی ہے۔'' گل نے کہتے ہوئے آنکھیں موند لی۔

''اللہ سے دعا کرنا گل کہ وہ مجھے معاف کر دے اور تم بھی مجھے معاف کر دینا۔'' عائشہ کی بات پر گل آنکھیں کھول کے اسے دیکھنے لگی۔

''میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتی عاشی۔'' اس کی بات پر عائشہ نے محبت سے گل کا ہاتھ چوم لیا۔ گل نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لی آج کی رات دونوں کے لیے ہی بھاری تھی۔

☆......☆......☆

فرازین صحن دھو کر فارغ ہوئی تو کپڑے رسی پر پھیلانے لگی۔ فرازین یہ کپڑے چھت پر پھیلا دو۔'' عالیہ اس کے پاس آتے ہوئے بولیں۔

''تائی میں پھیلا دیتی ہوں نہ......''

''ابھی تم نے صحن دھویا ہے پھر پانی کپڑوں سے ٹپک کر صحن گیلا ہوگا۔ جاؤ جلدی سے جا کر چھت پر پھیلا دو مغرب بھی ہونے والی ہے۔''

عالیہ کی بات پر وہ خاموشی سے کپڑوں کی بالٹی اُٹھا کر چھت پر چلی آئی۔

''تائی کی منطق بھی سمجھ سے باہر ہے۔''

کپڑے جھٹک کے وہ رسی پر پھیلا رہی تھی کہ کوئی چیز اس کے پیروں پر آ کر گری۔

''امی فرازین کہاں ہے؟'' نعمان آفس سے آیا تو فرازین نظر نہیں آئی تو اس کا پوچھنے لگا۔

''وہ چھت پر ہے نومی۔'' ماہم اسے چائے دیتے ہوئے بولی۔

''چھت پر اس وقت......؟'' اس کے ماتھے پر بل آ گئے۔

''ہاں کافی دیر سے ہے وہ تو چھت پر۔'' ماہم لاپروائی سے بولی۔ اس کی بات پر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''کہاں جا رہے ہو نومی......''

''آ رہا ہوں......'' چھت کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا بولا۔ ماہم معنی خیزی سے پلٹ کے کچن میں کھڑی عالیہ کو دیکھ کے مسکرا دی۔

وہ کوئی کاغذ تھا جو پتھر میں لپٹا ہوا تھا فرازین جھک کر اُسے اُٹھا کر پڑھنے لگی۔

''پیاری فرو آج رات ایک بجے چھت پر آ جانا میں تمہارا انتظار کروں گا، تمہارا اکرم۔''

فرازین کا پڑھ کے غصے سے برا حال ہو گیا۔ سامنے ہی چھت پر اکرم فرازین کو دیکھ کے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اپنے پیچھے نعمان کو کھڑا دیکھ کے فرازین نے کاغذ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''دیکھیے نومی اس کو اس نے مجھے کیا بھیجا ہے۔'' سامنے چھت پر کھڑے اکرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ نعمان نے کاغذ پڑھ کے ایک تیز نگاہ فرازین پر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں اُتر گیا۔ فرازین بھی گھبرا کر اس کے پیچھے آئی۔

نعمان نے کاغذ عالیہ کو تھما دیا۔ پڑھ کر عالیہ نے اپنا سینہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ لیا۔

''یا اللہ فرازین تجھے شرم نہ آئی بے غیرت......'' ماہم نے آگے بڑھ کر کاغذ عالیہ کے ہاتھ سے لے لیا اور پڑھ کر کانوں کو ہاتھ لگا کر فرازین کو دیکھنے لگی۔

''توبہ توبہ میں کئی دنوں سے اس کی حرکتوں کو دیکھ رہی تھی نعمان۔'' ماہم نے آنکھیں نچا کر نعمان کو مخاطب کیا۔ یہ افتاد فرازین کے لیے بالکل نئی تھی وہ ہونق بنی کھڑی سب کے کڑوے کسیلے جملے سن رہی تھی اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

''تائی اماں آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''ہاں تو میں جھوٹ بول رہی ہوں بلاؤ اس اکرم کو ابھی پتہ چل جائے گا۔'' اور تھوڑی دیر بعد اکرم ان کے صحن میں موجود تھا۔

''ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' اکرم کی بات پر فرازین پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''یہ تو ہے ہی بدکردار ماں بھی اس کی ایسی تھی اپنے حسن سے پھانس لیتی تھی۔'' عالیہ کی بات پر فرازین آپے سے باہر ہو گئی۔

''خبردار جو میری ماں کو اک لفظ بولا۔''

''دیکھ دیکھ کیسی زبان چل رہی ہے۔'' عالیہ خاموش کھڑے نعمان کو دیکھ کر بولیں۔

''دے اس کو طلاق بدکردار کہیں کی۔'' عالیہ نفرت سے فرازین کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''فرازین گل میں نعمان صدیق بقائم ہوش و حواس میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔'' وہ تین بار کہہ کر چپ سا ہوگیا۔ ماہم کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ آگئی۔

''تم جاسکتی ہو یہاں سے۔'' نعمان کی بات پر اس نے ایک سرد نگاہ وہاں کھڑے نفوس پر ڈالی اور اندر کمرے میں آکر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ اپنی ماں کے زیور اور وہ پیسے جو تایا اسے جیب خرچ کے لیے دیا کرتے تھے اور دادی کے دیے ہوئے پیسے جو اس کے پاس اچھے خاصے جمع ہوگئے تھے۔ اپنے ڈاکومنٹ اُٹھا کر وہ باہر چلی آئی۔

''ارے بی بی دکھا تو دو کیا لے کر جا رہی ہو؟'' عالیہ اس کے ہاتھ میں سامان دیکھ کے زور سے بولیں۔

''جو کچھ لے کر جا رہی ہوں اپنا لے کر جا رہی ہوں۔'' وہ بیگ سے سامان نکال کے سب کو دکھاتی کھڑی ہوگئی اور اس گھر کی دہلیز پار کرگئی ہمیشہ کے لیے..... گھر سے نکلنے کے بعد اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائے وہ اتنی دیر تک باہر سڑک پر بیٹھی رہی۔ آتی جاتی نظروں سے گھبرا کر وہ کھڑی ہوگئی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ وہ وہیں مجذوب کے پاس چلی آئی اور تھک کر وہیں بیٹھ گئی۔

''سب کچھ ختم ہوگیا بابا.....'' وہ بہت ٹوٹے لہجے میں بولی۔

''اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔''

''بابا میں در بدر ہوگئی ہوں اور اس سے زیادہ کیا برا ہوگا؟'' فرازین روتے ہوئے بولی۔

''تیرا وہاں سے نکلنا ہی تھا یہ در بدری نہیں ہے یہ بیچ کا وقت ہے جو کٹھن ہے پر منزل سے ملا دے گا۔''

''میں کہاں جاؤں بابا میرا کوئی بھی نہیں ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''کیوں غلط بات کرتی ہے بیٹا تیرا تو رب ہے اور جس کا وہ ہوتا ہے اس کے پاس سب ہوتا ہے۔''

''رب تو ہمارے گمانوں جیسا ہے اس سے جیسا گمان رکھو گے اسے ویسا پاؤ گے جیسا سوچو گے ویسا تم کو ملے گا اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس سے تم کیسا گمان رکھتے ہو اچھا یا برا اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں وہ تو عطا کرنے والا ہے۔ اس سے مانگ کے تو دیکھو اس سے کہہ کر تو دیکھو۔'' بابا کی بات پر فرازین کو لگا اس کو اندھیرے میں کسی نے روشنی کا جگنو تھما دیا وہ روشنی کا جگنو ہاتھ میں لے کر اس ہاسٹل میں آگئی جہاں پر اس کی ملاقات عائشہ سے ہوئی اور آج اتنے برسوں بعد عائشہ کے منہ سے وہ نام سن کر چونک گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح گل نیند سے بیدار ہوئی تو عجیب سے احساس سے وہ چونکی۔ اس نے گھبرا کر عائشہ کو ہلایا وہ بدحواس ہو کر نیچے بھاگی، وارڈن بھی اوپر چلی آئی تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر اس کے کمرے میں موجود تھا۔

''پتہ نہیں بے ہوش ہوگئی ہے شاید.....'' فرازین گھبرا کر ہاسٹل کی لڑکی سے بولنے لگی مگر ڈاکٹر کی بات پر اس کو لگا اس کی سماعت مفلوج ہوگئی ہے۔

''نروس بریک ڈاؤن کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا ہے۔'' ڈاکٹر کی بات پر وہ ایک دم سے چیخنے لگی۔

''آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ یہ

بالکل ٹھیک ہے رات ہم نے باتیں کی ہیں۔ رکو میں اٹھاتی ہوں۔ عاشی کھڑی ہو دیکھو یار یہ لوگ کیا باتیں کررہے ہیں، کھڑی ہونہ۔'' وہ اس کو زور سے ہلاتے ہوئے بولی۔ کمرے میں کھڑے لوگ فرازین کو ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ ان دونوں میں کس قدر محبت تھی۔ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے زبردستی پیچھے کیا وہ ایک کونے میں گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھی رہی فرازین کا بس نہیں چل رہا تھا کہیں جا کر چھپ جائے یا اس کی عقل سمجھنے قابل نہ رہے۔

''عائشہ جارہی ہے فرازین دیکھ لو اُسے......''

کسی نے اس کا کندھا پکڑ کے ہلایا وہ اُٹھ کے عائشہ کے پاس آگئی جھک کر اس کی سرد پیشانی چومنے لگی۔

''فرازین کو چھوڑ کر جارہی ہو عاشی۔'' اس کے کان میں وہ جھک کر سرگوشی کرنے لگی۔ مگر وہاں پر اب بس ایک طویل خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

''میرے اللہ میری عاشی سے راضی رہنا اسے وہاں وہ سب دینا جو وہ یہاں نہ پاسکی وہ وہاں بہت خوش رہے۔'' فرازین برستی آنکھوں سے جاتی عائشہ کو دیکھنے لگی۔ لرزتے قدموں سے وہ کھڑکی تک آکر نیچے کی جانب دیکھنے لگی۔ جہاں پر اس کی بہن چار کندھوں پر سوار اپنے آخری سفر کی طرف روانہ تھی۔

☆......☆......☆

''کیا تم میری موت پر روؤ گے اس کے سوال پر اسے سمجھ نہیں آیا کیا بولے گا اور خاموشی سے گاڑی میں اُسے اپنے گھر لے آیا۔ حریم گل کو دیکھ کر اس کے پاس آنے کے لیے اچھلنے لگی۔ وجدان نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا اور ملازمہ سے دودھ کا گلاس منگوا کر اس کو میڈیسن کے ساتھ زبردستی پلایا تھوڑی ہی دیر بعد وہ دوائی کے زیر اثر سو رہی تھی۔ وجدان حریم کو لے کر باہر آ گیا۔

شام وجدان آفس سے گھر آیا تو گل کمرے کا گیٹ کھول کے باہر آ رہی تھی۔ وجدان کو دیکھ کر رُک سی گئی۔

''میں چلتی ہوں، آپ کا شکریہ آپ نے اتنا خیال کیا۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔

''فرازین رُک جاؤ یہاں بیٹھو۔'' وہ لاؤنج میں رکھے صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ اس کی بات پر فرازین وہاں بیٹھ گئی۔

''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟'' وجدان اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ نڈھال لہجے میں بولی۔

''مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی تم؟'' وہ اس کی سوجھی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھ سے شادی کروگی فرازین۔'' وجدان کی بات پر وہ چونک کر سر اٹھا کے اُس کو دیکھنے لگی۔

''ٹھہرو پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں بتادوں پھر تم فیصلہ کرنا۔'' یہ کہہ کر وجدان نے اپنا گلا کھنکار کر صاف کیا۔

''میرا نام وجدان رضا ہے پیار سے سب ڈیبی بولتے ہیں۔ ماں باپ بچپن میں ہی چھوڑ گئے۔ ڈیڈی نے خودکشی کرلی کیونکہ وہ مما سے بہت محبت کرتے تھے وہ مما کی جدائی برداشت نہیں کرسکتے تھے اور مما ہمیں چھوڑ کے چلی گئیں مگر اس کی سزا وہ آج تک بھگت رہی ہیں۔ میری پرورش گرینی نے کی میری گرینی جہاں آراء ایک مذہبی خاتون تھیں پورے خاندان میں ایک گرینی ہی تھیں جن کو مذہب سے لگاؤ تھا۔

میں بھی اپنی کلاس کی طرح دنیا کی رنگینیوں میں بری طرح سے کھویا ہوا تھا۔ بہت سی لڑکیاں میری زندگی میں آئی مگر کوئی بھی ایسی نہ تھی جس سے مجھے محبت ہو مجھے ہر لڑکی میں اپنی ماں نظر آتی۔ ویسی ہی خودغرض...... پھر مجھے اک لڑکی راہ چلتی نظر آئی اب یہ اتفاق تھا کیا تھا کہ اس لڑکی سے میرا سامنا ہوتا تو اس لڑکی کو بے اختیار خود کو تکتے دیکھتا۔''

وجدان کی بات پر فرازین گل شرمندہ سی ہوگئی۔

''میرے لیے اس لڑکی کی بے خودی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بہت سی لڑکیوں کی نظروں میں، میں نے اس طرح سے ستائش دیکھی تھی مگر میں نے اس لڑکی کی نظروں میں ستائش کے علاوہ بھی کچھ دیکھا تھا جو مجھے چونکنے پر مجبور کردیتا تھا ایسا لگتا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ میں اس ہی طرح رب سے غافل جیتا رہا پھر کلب میں ہونے والے حادثے نے مجھے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ میں فرازین ان راہوں پر چلتا رہا جو گناہ کے تھے مجھے ہر اس چیز میں لذت سرور لگتا جس کا میرے مذہب میں منع تھا۔ جس رات کلب میں آگ لگی آگ کے شعلے مجھے ہر جانب سے خود کو نگلتے محسوس ہوئے۔ میں لاچار تھا اس وقت مجھے اپنا آپ بہت بے بس لگا پھر میرے دل نے شدت سے رب کو پکارا جیسے اذیت کے وقت بچہ اپنی ماں کو پکارتا ہے میرا دل بھی چھوٹے بچے کی طرح بلک بلک کر اللہ کررہا تھا کہ میں نہیں جانتا کہ کس طرح سے میرا راستہ بنتا گیا اور کچھ لمحوں بعد میں اس کلب سے باہر تھا۔ وہ رات میری پوری زندگی پر بھاری ہے اس رات مجھ پر ادراک ہوا کہ میں تو اندھیروں میں بھٹک رہا تھا گرینی ٹھیک کہا کرتی تھیں کہ رب کو پکار کے دیکھو...... میں نے کبھی اتنی شدت سے نہیں پکارا تھا اس رات اس نے میری پکار کی کس طرح لاج رکھی مجھے یہ بات بہت دیر میں سمجھ آئی کہ رب سب کی سنتا ہے بس آپ کی پکار میں شدت ہونی چاہیے، خلوص ہونا چاہیے۔

وہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو میں ایسے ہی غفلت میں جیتا رہتا۔ میں ان اندھیروں سے باہر آگیا تھا جسے لوگ روشنی کہتے ہیں وہ درحقیقت گمراہی کے اندھیرے ہوتے ہیں کچھ عرصے بعد گرینی نے اپنی دوست کی نواسی سے میری شادی کرادی اس کا نام حیا تھا مجھے حیا کی حیا سے محبت تھی۔ وہ بہت مختلف تھی وہ ہماری کلاس کی لڑکیوں جیسی نہ تھی مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مجھے حیا سے زیادہ اس کی حیا سے محبت تھی۔ میری طرح مانی میرا بیسٹ فرینڈ اور اس کی منگیتر پنکی وہ بھی ان برائی کے راستوں سے دور ہونے لگے۔ مجھے خوشی تھی کہ میرے دوست بھی بھلائی کے راستے پر گامزن ہوگئے۔ میری اور حیا کی شادی کے بعد گرینی حج پر گئیں مگر ان کی وہیں وفات ہوگئی۔ وہ وقت میرے لیے بہت کڑا تھا اس وقت حیا نے مجھے سنبھالا اور حریم کی پیدائش پر حیا نے زندگی سے ناطہ توڑ دیا اس کی موت کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کیا پتہ میں اس کے قابل نہ ہوں کیونکہ وہ ایک نیک عورت تھی۔ جب کہ میرا ماضی کوئی اچھا نہ تھا۔ حیا کی موت کے بعد ایک خواب تھا جو مستقل مجھے آتا تھا میں چل تو حیا کے ساتھ رہا ہوتا تھا خواب میں پر اچانک چلتے چلتے وہ مجھ سے دور ہوجاتی اور پھر جس کے پاس میں جاکر ٹھہرتا وہ کوئی اور نہیں تم ہوتی اور تمہاری آنکھوں میں وہی بات نظر آتی جو میں نے اصل زندگی میں تمہاری آنکھوں میں دیکھی یہ خواب بار بار نظر آنا ایک

اشارہ تھا کہ میں کہیں بھی چلا جاؤں میرا راستہ تم سے ملتا ہے یا تو تمہاری محبت میں اس قدر طاقت تھی کہ میں کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔'' وہ اس کی جھکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی بات پر وہ نظریں چرا گئی یہ محبت ہی تھی نہ۔ فرازین میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نہ...... '' کافی دیر سے چپ بیٹھی فرازین اس کو دیکھنے لگی۔ جیسے بولنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہی ہو۔ بعض اوقات حالات ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ آپ کو لگتا ہے جو خواب آپ نے اپنی آنکھوں میں سجائے ہوتے ہیں وہ دم توڑ گئے ہوں مجھے بھی ایسا ہی لگتا تھا اب، پر پتہ ہے وہ خواب مرتے نہیں ہیں وہ ان حالات کی وجہ سے ہم سے کہیں چھپ جاتے ہیں اور موقع دیکھتے ہی وہ پھر سے اپنی جگہ پر آ جاتے ہیں اور بولتے ہیں ہم اب بھی تعبیر کے انتظار میں بیٹھے ہیں اور پھر وہ اسے دھیرے دھیرے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

فرازین شاپنگ مال میں حریم کے لیے کپڑے خرید رہی تھی کہ سیل پر آتی وجدان کی کال دیکھ کے مسکرا کر اس نے سیل فون کان سے لگا لیا۔

''بیگم صاحبہ کہاں رہ گئی ہو؟''

''آ رہی ہوں جناب بس۔'' فرازین مسکرا کے بولی۔

''آپ کے دونوں بچوں نے قسم سے پاگل کر دیا۔''

''او کے میں آ رہی ہوں۔'' وہ شاپنگ مال سے نکل رہی تھی کہ کسی کی پکار پر چونک کر پیچھے مڑی تو نعمان کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل آ گئے وہ گاڑی میں شاپنگ بیگز رکھنے لگی۔

''پلیز فری میری بات سن لو۔'' نومی اس کے پاس آ کر التجا کرتے ہوئے بولا۔

''میرا نام فرازین وجدان ہے۔'' وہ سختی سے اس کو دیکھ کے بولی۔

''پلیز میری بات سن لو۔'' وہ لجاجت سے بولا۔

''اچھا کہو۔'' فرازین نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی غلطیوں اور زیادتیوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی جو میں نے یوں تمہیں اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا۔

''تمہارے جانے کے بعد ہماری بربادی کے دن شروع ہو گئے۔ میری ماہم سے شادی ہو گئی شادی کے کچھ عرصے بعد پتا چلا ماہم ٹھیک لڑکی نہیں تھی خالہ نے اس کی حرکتوں سے گھبرا کر اس کو یہاں بھیجا تھا اور اپنی خراب بیٹی کو ہمارے سر پر مسلط کیا۔ شادی کے کچھ دنوں بعد وہ اپنی اصلیت پر آ گئی اس نے میری ماں کا جینا حرام کر دیا اپنے بوائے فرینڈز سے آزادانہ میل جول تھا اس کا' دیکھو کیا سزا تھی میرے لیے کہ ایک پارسا عورت کو خود میں نے اپنے ہاتھوں سے دور کیا اور ایک ایسی عورت کو اپنایا جو خود ٹھیک نہ تھی مجھے پتا چل گیا تھا کہ بدکردار کیا ہوتا ہے کسی بات پر ہماری لڑائی ہوئی اور ماہم مجھ سے طلاق لے کر چلی گئی۔ امی ہر وقت تمہیں یاد کر کے روتی ہیں بس ایک بار تم اُن سے مل لو اُن کی حالت ٹھیک نہیں رہتی میں تم سے التجا کرتا ہوں۔'' وہ بہت امید سے فرازین کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں کل آ جاؤں گی۔'' کہہ کر وہ تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھ گئی اور پھر وجدان کی اجازت سے وہ ایک بار پھر اس چوکھٹ پر

کھڑی تھی جہاں سے کبھی نکالی گئی تھی۔

فرازین دروازے کے باہر کھڑی عجیب سی کیفیت کا شکار تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اندر داخل ہو یا نہیں۔

''اندر آ ؤ نہ فرازین۔'' نعمان اسے وہاں رُکا دیکھ کے بولا۔اس نے ایک نگاہ نعمان کو دیکھا جو جھکے سر کے ساتھ کھڑا تھا اس کے کہنے پر فرازین اندر داخل ہوگئی۔صحن میں قدم رکھتے ہی فرازین کو سب کچھ یاد آنے لگا۔دادی' تایا اور اپنا گزرا ہوا بچپن...... بدکردار کہیں کی ...... الفاظ تھے یا کوڑے اُسے چابک کی طرح اپنے جسم پر لگتے محسوس ہوئے اس ہی صحن میں اس پر تہمت لگا کے نکالا گیا تھا۔

''فرازین امی اندر ہیں کمرے میں۔'' نعمان اسے اس طرح کھڑے دیکھ کے بولا وہ جانتا تھا وہ کیا سوچ رہی ہے۔وہ اندر عالیہ کے کمرے میں داخل ہوگئی جہاں عالیہ بیڈ پر لیٹی تھیں وہ ان کو اس حالت میں دیکھ کے بری طرح سے چونکی۔آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نہایت کمزور لگ رہی تھیں۔فرازین کو دیکھ کر وہ لیٹے سے اُٹھ گئیں یہ وہ عالیہ تو نہ تھیں وہ سارا کروفر پتہ نہیں کہاں کھو گیا تھا۔

''آ گئی میری فرازین اِدھر آ میری بچی۔'' وہ پاس کھڑی فرازین کا ہاتھ پکڑ کے پاس بٹھاتے ہوئے بولیں۔عالیہ اس کے چہرے کو تکے جا رہی تھیں فرازین بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔عالیہ دونوں ہاتھ جوکر اس کے آگے کرتے ہوئے بری طرح سے رو دیں۔

''یہ کیا کر رہی ہیں تائی......'' فرازین ان کے بندھے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں بیٹا میں تمہاری گناہ گار ہوں میں نے تم پر جھوٹا بہتان باندھا یہ بھول گئی میں اس وقت کہ پارسا نیک عورت پر تہمت کی کیا سزا ہوتی ہے مجھے لالچ نے اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ میں بہت گر گئی میرے دل میں تمہاری ماں کے لیے نفرت تھی کیونکہ سب اُس کو چاہتے تھے۔پر آج میں بولتی ہوں فرازین تیری ماں تھی چاہے جانے کے قابل وہ اتنے اچھے اخلاق کی عورت تھی اور تمہارا نام اماں مرحومہ نے بالکل ٹھیک رکھا تھا فرازین یعنی اعلیٰ مرتبہ تم واقعی بہت بلند لگ رہی ہو مجھے اور میں نہایت پستی میں خود کو محسوس کر رہی ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد مجھے سکون نام کو نصیب نہ ہوسکا ماہم نے میری زندگی کو جہنم بنا ڈالا میں نے خود اپنے ہاتھوں سے تم کو گنوایا کیونکہ تم واقعی ہمارے قابل نہ تھی۔نعمان بتا رہا تھا۔بہت اچھی جگہ تمہاری شادی ہوئی ہے تمہارا شوہر بھی بہت اچھا ہے تو میں نے اس دن سوچا کہ عالیہ تو نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کو اس کے اصل مقام تک پہنچایا وہ جس کے لائق تھی وہاں پہنچ گئی تو نے خود قدر نہ کی۔ میں پوری پوری رات سو نہیں پاتی ڈاکٹر بولتا ہے کوئی تکلیف نہیں ہے پر میں اس کو کیا بتاؤں ضمیر کی چبھن جو ہوتی ہے نہ وہ ہر تکلیف پر حاوی ہوتی ہے۔بس تو معاف کر دے تاکہ میں آسانی سے مر سکوں۔عالیہ اس کو سینے سے لگا کر ہچکیوں سے رو دی۔ میں نے آپ کو معاف کیا اللہ کی رضا کے خاطر کہتے ہوئے وہ کھڑی ہوگئی اور اس کمرے سے باہر نکل آئی۔نعمان صحن میں ہی کھڑا تھا وہ اس کے پاس چلی آئی۔

''جانتے ہو نعمان جب تائی مجھے باتیں سناتی اور میری ماں کو بولتی تھیں نہ تو مجھے ان پر شدید غصہ آتا تھا میرا دل چاہتا تھا کہ میں بھی تائی کو کچھ ایسا بولوں پر میں بول نہیں پاتی تھی مجھے اپنی بزدلی پر

شدت سے رونا آتا تھا پر آج سمجھ میں آیا وہ میری بزدلی اور میری زبان کا اس وقت ساتھ نہ دینا درحقیقت میں وہ اللہ کی مجھ سے محبت تھی وہ میری بزدلی نہیں تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنی زبان کی وجہ سے بری بنوں یا میرے منہ سے کوئی ایسے الفاظ نکلیں جو میری پکڑ کا سبب بنیں۔ آج مجھے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ اللہ سے بڑا کوئی منصف ہے ہی نہیں تو کیا برا ہے ہم انسان اگر اذیتوں کے لمحوں میں صبر کرے۔''

گاڑی کا دروازہ کھول کے وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ نعمان اسے جاتا دیکھتا رہا اور شکستہ قدموں سے واپس گھر کی جانب چل دیا یہ شکست تو خود اس نے اپنے ہاتھوں سے پسند کی تھی اپنے لیے۔

☆......☆......☆

وہ چاروں گھومنے آئے ہوئے تھے۔

''فرازین گھوڑا دیکھو کس قدر خوبصورت ہے۔'' پنکی فرازین کا بازو ہلاتے ہوئے بولی۔ فرازین کو بے اختیار وجدان کی پینٹنگ یاد آ گئی۔ اس کا دل چاہا وہ اس گھوڑے پر سوار ہو اور آگے بڑھ کر وہ اس گھوڑے پر بیٹھ گئی۔

''رکو میں تمہاری تصویر لیتی ہوں۔'' پنکی کیمرا اٹھاتے ہوئے بولی۔

''ابھی نہیں......'' وجدان بھاگتا ہوا گھوڑے تک آیا اور جلدی سے فرازین کے پیچھے بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے بھئی......'' مانی زور سے بولا۔ فرازین جھینپ سی گئی۔

''پتہ ہے پینٹنگ میں لڑکا لڑکی کے کان میں کیا کہہ رہا تھا؟'' وجدان کی بات پر وہ ہلکا سا رخ موڑ کے اس کی جانب دیکھ کے بولی۔

''کیا بول رہا تھا؟''

''یہی کہ تم بہت خوبصورت ہو'' وجدان کی بات پر فرازین مسکرا دی۔ ویسے ہی دلکش انداز میں جس مسکراہٹ کے سحر میں وہ کئی سال پہلے کھوئی تھی اور یہ حسین منظر پنکی نے کیمرے میں محفوظ کر لیا۔

☆......☆......☆

فرازین اپنے بیڈروم میں لگی اس تصویر کو دیکھ کر مسکرا دی۔ جو اس نے کئی سال پہلے آرٹ گیلری میں دیکھی تھی۔

''پتہ نہیں وجدان آپ کی اس پینٹنگ میں کیا بات ہے کہ میں جب بھی دیکھتی ہوں لگتا ہے میں اس کے سحر میں کھو سی جاتی ہوں مجھے خود یہ پینٹنگ اس قدر پسند تھی کہ میرا دل ہی نہیں ہوا اس کو سیل کرنے کا...... اب یہ دیکھو اور بتاؤ پینٹنگ زیادہ دلکش ہے یا یہ تصویر وہ انلارج تصویر اس پینٹنگ کے برابر لگاتا شوخی سے بولا۔

''ارے واقعی ایسا لگ رہا ہے ہم دونوں نے تصویر میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔'' وہ اپنی اور وجدان کی گھوڑے پر بیٹھی تصویر کو دیکھ کر خوشگوار حیرت سے بولی۔

''ایک بات ہے میری بیگم کی مسکراہٹ اس پینٹنگ والی لڑکی سے زیادہ حسین ہے۔'' وجدان محبت سے اس کے کندھے پر بازو پھیلاتا ہوا بولا۔

''فرازین تم میرے لیے خدا کا دیا ہوا بہترین تحفہ ہو مجھے تم سے اور تمہاری ہر بات سے محبت ہے۔'' وجدان کے اظہار پر فرازین نے اس کے سینے سے سر لگا کر پُرسکون ہو کر آنکھیں موند لی۔

''چہار سو گھپ اندھیرے میں بس تیرے نام کی روشنی کافی ہے میرے رب کیونکہ تُو تو میرے گمانوں جیسا ہے۔'' وہ مسکرا دی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

محمد بلال فیاض

توازن

''میرے نزدیک تو وہ شخص 'مرد' ہی نہیں ہے جسے عورت میں کوئی خامی ہی نظر نہ آئے، ٹھیک ہے میاں تم نے اگر بیوی کی جی حضوری کا سوچ ہی لیا ہے تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہونا ہے۔'' انہوں نے گویا ہاتھ جھاڑے۔ ''میں تو تمہارا ہی بھلا چاہ رہا تھا...... ارے کچھ دن......

''ارے بھائی! پہلے دن سے ہی بیوی کی لگام کھینچ کر رکھنی چاہیے' میری تو کامیاب ازدواجی زندگی کا راز ہی یہی ہے۔'' بھیا نے چائے کا کپ میز پر رکھ کر اس کے قریب کھسک کر رازداری سے کہا۔

''بیوی کو پہلے دن سے ہی جوتے کی نوک پر رکھو تو یہ سیدھی رہتی ہے ورنہ تو شوہر کو پوری زندگی نچائے رکھتی ہے۔'' احمد پوری توجہ سے نصیر بھیا کی بات سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ بڑی فرمانبرداری سے اثبات میں سر بھی ہلاتا جا رہا تھا۔

''میری مثال تمہارے سامنے ہے اٹھارہ سال ہو گئے ہیں شادی کو' دیکھ لو اپنی بھابی کو کیسے تیر کی طرح سیدھا کر کے رکھا ہوا ہے میں نے، مجال ہے جو میری مرضی کے بغیر سانس بھی لے۔'' بھیا نے فخریہ انداز میں آنکھیں گھما کر احمد کو دیکھا اور چائے کا کپ اُٹھا کر بچی ہوئی چائے ایک ہی گھونٹ میں پی گئے۔

''صحیح کہتے ہیں آپ بھیا!''

''اچھا بھائی اب اجازت دو۔ یہ اتوار والے دن بچے چین نہیں لینے دیتے، خیر آسیہ کو تو میں نے کبھی اتنی ڈھیل ہی نہیں دی کہ وہ بگڑی ہوئی بیویوں کی طرح باہر گھومنے یا ہوٹلنگ کی فرمائش کرے مگر تمہیں معلوم ہے بچوں کی میں کوئی بات نہیں ٹالتا' صبح سے ایان اور نمرہ ضد کر رہے ہیں شاپنگ کے لیے سیزن کے کپڑے اور جوتے وغیرہ لینے ہیں۔'' بھیا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں میری باتوں پر ضرور عمل کرنا ورنہ تو باقی کی زندگی بیوی کی فرمائشیں پوری کرتے گزر جائے گی۔ یہی دن ہوتے ہیں بیوی کو قابو کرنے کے۔'' انہوں نے احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے رسان سے کہا۔

''یہ شادی کے ابتدائی ایام ہی ہوتے ہیں جو فیصلہ کر دیتے ہیں کہ شوہر بیوی پر حاوی ہوگا یا بیوی شوہر پر' بس جس کا پلڑا بھاری ہوتا ہے وہ حاوی ہو جاتا ہے اور جو حاوی ہو جاتا ہے پھر حکومت اُسی کی ہوتی ہے۔'' کمرے کی دہلیز پار کرتے ہوئے

بھیا احمد کے کان میں اپنے اقوال زریں انڈیل کر نیچے اپنے پورشن کی طرف چل دیے۔

احمد واپس آ کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچنے لگا۔

"باتیں تو بھیا کی سو فیصد درست تھیں اور ویسے بھی بھیا کی عمر اور تجربہ اتنا ہے کہ وہ غلط بات کر ہی نہیں سکتے۔"

☆......☆......☆

کچھ دن پہلے ہی اُس کی شادی ہوئی تھی اور شادی کے بعد بھیا نے اُسے اوپر والے پورشن میں شفٹ کر دیا تھا جو خاص طور سے اِسی مقصد کے لیے تیار کروایا گیا تھا۔

نصیر بھیا فطرتاً سخت مزاج اور غصیلے ہرگز نہیں تھے مگر شادی کے بعد وہ بھابی کے معاملے میں حقیقتاً ہٹلر واقع ہوئے تھے۔

احمد کو آج بھی یاد تھا نو بیاہتا آسیہ بھابی بڑی شوخ و شنگ اور کھلتے گلاب کی سی شگفتگی لیے ہوئے تھیں۔ ہر دم ہنستی مسکراتی، قہقہے لگاتیں، چوڑیاں اور پازیب چھنکاتیں، رنگ برنگ آنچل لہراتیں وہ بہار کے جھونکے کی مانند اس گھر میں اتری تھیں۔ مگر یہ بہار کچھ دن کی ہی ثابت ہوئی تھی۔

اُس کے بعد نصیر بھیا نے بھابی کو کچھ ایسا قابو کیا کہ اُن کی ساری شوخی اور رنگینی ہوا ہوگئی وہ ہمہ وقت چپ سادھے خوف اور سنجیدگی کا پیکر نظر آنے لگیں۔

بھیا کا خیال تھا کہ بیوی ایک ایسی مخلوق ہے جسے اگر شادی کے ابتدائی دنوں میں ڈھیل دے دی جائے تو شوہر کی باقی ماندہ زندگی عورت کی چاکری کرتے ہی گزرتی ہے۔ بھیا ایسے مردوں کے سخت خلاف تھے جنہیں بیویوں کے ناز نخرے اُٹھا کر اور ان کے فرمائشی پروگرام پورے کر کے روحانی خوشی ملتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ شادی کے ابتدائی ایام میں ہی بھیا نے احمد کو ہائی الرٹ کر دیا تھا کیونکہ وہ ہرگز احمد کو 'جورو کا غلام' نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

☆......☆......☆

''بھیا! مجھے تو اسمارہ میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی خامی نہیں ملتی...... آفرین ہے میری ساس پر جس نے اپنی بیٹی کی ایسی اعلیٰ تربیت کی ہے۔ ایسی مکمل اور متوازن شخصیت ہے اسمارہ کی کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی غلطی نہیں ملتی۔'' احمد کی اِن باتوں پر بھیا آنکھیں پھاڑے اُسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے۔ بیوی کی تعریف اُن کے نزدیک گناہ کبیرہ تھی اور احمد تو بیوی کے ساتھ ساتھ ساس کی تعریف کر کے ان کی نظر میں موجودہ دور کا سب سے بڑا مجرم ٹھہرا تھا۔

''اتنا بے وقوف تو میں تمہیں ہرگز نہیں سمجھتا تھا میاں! تم تو بیوی کے ساتھ ساتھ اپنی ساس پر بھی فدا ہو، لاحول ولاقوۃ، زن مریدی کا اگر کوئی ایوارڈ ہوتا تو سب سے پہلے تمہیں ہی ملتا۔'' وہ تو گویا بھڑک اٹھے۔

''میرے نزدیک تو وہ شخص 'مرد' ہی نہیں ہے جسے عورت میں کوئی خامی ہی نظر نہ آئے...... ٹھیک ہے میاں تم نے اگر بیوی کی جی حضوری کا سوچ ہی لیا ہے تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہونا ہے۔'' انہوں نے گویا ہاتھ جھاڑے۔

''میں تو تمہارا ہی بھلا چاہ رہا تھا...... ارے کچھ دن گزرنے دو اس کے بعد تم خود ہی اپنے بال نوچ نوچ کر رو گے...... جب بیوی قابو سے باہر ہوگی...... ہر وقت سسرالیوں کی آمد ورفت...... سالیوں کی فرمائشیں...... بیوی کی نازک مزاجیاں اور نخرے...... بچے الگ راگ الاپیں گے۔ سارا دن سرکار کی نوکری (گورنمنٹ جاب) کرو گے اور اس کے بعد بیوی بچوں اور سسرالیوں کی چاکری، نہ دن چین سے گزرے گا۔ نہ رات سکون سے۔'' بھیا نے مستقبل کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ احمد نے جھرجھری لی۔

''اللہ نہ کرے......'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''ہاں تو اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ ابھی سے کچھ کرو اس سے پہلے کہ بیوی تمہارے سر پر چڑھے تم بیوی پر حاوی ہو جاؤ اور باقی کی زندگی چین کی بانسری بجاؤ۔''

''مگر بھیا! یہی تو مسئلہ ہے کہ آخر میں کس بات پر اسمارہ پر رعب جماؤں، اس پر غصہ کروں اسے ڈانٹوں......؟ کھانا پکانا...... صفائی ستھرائی...... سلیقہ مندی...... اخلاقیات اور شائستگی تو جیسے اُس پر ختم ہے۔'' احمد کی شکل پر مظلومیت جھلکنے لگی۔

بھیا کو 'بیوی' کی تعریف کرنے پر پھر سے غصہ آنے لگا مگر وہ کنٹرول کر کے بولے۔

''ہمیشہ بدھو کے بدھو ہی رہنا تم...... عورت میں خامی ڈھونڈنا کون سا مشکل ہے۔'' بھیا اس کے مزید قریب کھسک آئے اور اس کے کان میں گھسے اُسے نئے مشوروں سے نوازنے لگے۔

ایسے میں وہ 'بڑے بھیا' کم اور 'فسادی عورت' زیادہ لگ رہے تھے۔

☆......☆......☆

آفس سے آکر وہ فریش ہوا اور صوفے پر ڈھے گیا۔

''کیا بہت تھک گئے ہیں؟'' اسمارہ نے کچن سے نکل کر اُسے دیکھا تو نرمی سے پوچھنے لگی۔

احمد آنکھیں موندیں پڑا رہا۔

''سر میں درد ہے؟'' جواب ندارد۔

''کوئی پریشانی ہے کیا؟'' اسمارہ کے چہرے پر تفکر کی لکیریں ابھریں۔

''پلیز اسمارہ...... میں ابھی آفس سے تھکا ہوا آیا ہوں اور تم نے دماغ کھانا شروع کر دیا ہے۔ جاؤ جا کر چائے بناؤ میرے لیے۔'' احمد دھاڑ کر بولا۔ اسمارہ حق دق رہ گئی۔ کچھ ثانیے وہ مجسم حیرت بنی اُسے دیکھتی رہی۔ شادی کے بعد پہلی بار اس نے احمد کا یہ روپ دیکھا تھا۔ یہ احمد تو ہرگز نہیں تھا۔

وہ تیزی سے کچن میں گئی اور بوتل کے جن کی طرح چائے بنا کر حاضر ہوگئی۔ احمد نے دل ہی دل میں خود کو داد دی۔

اسمارہ چائے لیے اس کے پاس کھڑی رہی۔ احمد ہر روز کی طرح آج خوش دلی سے آگے بڑھ کر چائے نہیں پکڑی تھی۔

''اب میرے سر پر کیوں سوار ہو...... ٹیبل پر رکھ دو چائے۔'' وہ بھنا کر بولا۔

اسمارہ کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

''یہ لہجہ احمد کا تو ہرگز نہیں تھا'' وہ روہانسی ہوگئی۔

ایک مہینہ احمد کے ساتھ رہنے کے بعد اسمارہ کو اتنا تو اچھی طرح سے اندازہ ہوگیا تھا کہ احمد نصیر بھیا اور اُن جیسے دیگر مردوں جیسا اکھڑ مزاج اور بیوی کو ہر وقت ذلیل کرنے کی کوشش میں رہنے والا مرد ہرگز نہیں ہے۔ مگر آج احمد کا یہ روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ کچھ دیر حیران و پریشان کھڑی احمد کو بے نیازی سے چینل سرچنگ کرتے دیکھتی رہی پھر منہ موڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے۔'' احمد نے چائے کا کپ میز سے اٹھاتے ہوئے سوچا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے پریشانی نے گھیر لیا مگر اگلے ہی لمحے وہ بھیا کی باتوں کو سوچ کر مطمئن انداز میں چائے پینے لگا۔

☆......☆......☆

اسمارہ کو نیچے بھابی کے پاس گئے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے ہوں گے جب نصیر بھیا اوپر چلے آئے۔

بھیا اکثر اُسی وقت اوپر آتے تھے جب اسمارہ نیچے بھابی کے پاس کسی کام سے یا وقت گزاری کے لیے جاتی تھی۔ کیونکہ اسمارہ کی موجودگی میں بھیا کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔

''یہ لو...... منہ میٹھا کرو۔'' بھیا نے مٹھائی میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''کس خوشی میں...... پروموشن ہوگئی ہے کیا؟'' احمد نے مٹھائی کا ڈبہ کھولتے ہوئے دریافت کیا۔

''ارے پروموشن ابھی کہاں ہوئی ہے۔ یہ تو تمہارے بھتیجے کے رزلٹ کی خوشی میں ہے۔ ماشاء اللہ سے ایان نے اپنے اسکول میں فرسٹ اور شہر بھر میں چوتھی پوزیشن لی ہے میٹرک میں۔'' اُن کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ بھیا ایان اور نمرہ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ بچوں کے معاملے میں بھیا ایک بہت آئیڈیل باپ ثابت ہوئے تھے۔ بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھرپور انداز میں

سیلیبریٹ کرتے تھے اور شاید ہی کبھی انہوں نے ایان اور نمرہ کی کوئی خواہش پوری کرنے سے انکار کیا ہو۔

''بہت بہت مبارک ہو...... ماشاء اللہ بہت ذہین بچہ ہے ایان۔'' اُس نے گلاب جامن سے انصاف کرتے ہوئے خوش دلی سے بھیا کو مبارکباد دی۔

☆......☆......☆

''اسمارہ......!'' احمد کی جھنجلائی آواز پر کچن میں ناشتہ بناتی اسمارہ پلٹ کر کمرے میں آئی۔

''یہ بلیو شرٹ پریس کر دو جلدی۔ مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔'' احمد نے شرٹ کا گولا بنا کر اس کی طرف اچھالا۔

''وہ وائٹ شرٹ پہن لیں...... وہ پریس ہے۔ الماری میں ہینگ ہے۔'' اسمارہ نے عجلت میں کہا، ذہن چولہے پر چڑھی چائے کی طرف تھا۔

''اب تم مجھے بتاؤ گی کہ مجھے کون سی شرٹ پہن کر آفس جانا چاہیے؟'' احمد اس پر چڑھ دوڑا۔ اسمارہ اس کے پل پل بدلتے رنگ پر حیران تھی۔ آج کل وہ بلاوجہ ہی اس پر غصہ کرنے لگا تھا۔

''مگر آپ نے رات کو خود ہی کہا تھا کہ میری وائٹ شرٹ پریس کر دو، مجھے صبح آفس پہن کر جانی ہے۔'' اسمارہ نے نرم لہجے میں یاد دھیانی کروائی۔

''ہاں......! اور اب میں ہی یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ شرٹ پریس کرو...... مجھے یہی پہن کر جانا ہے۔'' احمد چبا چبا کر بولا۔ اسمارہ نے شرٹ پکڑی اور پہلے کچن کی طرف بھاگی، چائے سوکھ کر کیتلی کے پیندے میں جمی تھی اور جلنے کے قریب تھی اس کا جی چاہا ہاتھ میں پکڑی شرٹ کو چولہے میں جھونک دے۔ احمد کے رویے پر اسے شدید غصہ آرہا تھا۔

''پتا نہیں احمد کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔'' شرٹ پریس کرتے ہوئے وہ روہانسی ہوگئی۔ غصہ، غم میں بدل گیا تھا۔

شرٹ پریس ہونے کے چکر میں ناشتہ لیٹ ہوگیا اور احمد بکتا جھکتا ناشتہ کیے بنا ہی سیڑھیاں اُتر گیا۔ اسمارہ سر پکڑ کر ٹیبل پر پڑے ادھورے ناشتے کو دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد اسمارہ نے یہ کیا کہ کپڑے دھونے کے بعد احمد کی ساری شرٹس پریس کر کے الماری میں ہینگ کر دیں تاکہ اُسے شکایت کا موقع ہی نہ ملے مگر وہ پھر بھی اُس کے کسی نہ کسی کام میں غلطی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال کر خوب لڑتا، چیختا چلاتا، اور اس کو نیچے دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اسمارہ اب پہلے کی نسبت خاموش ہی رہتی تھی۔ ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ احمد پھر کوئی بات پکڑ کر چیخنا چلانا نہ شروع کر دے۔ وہ احمد کو لڑنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

یہ سب دیکھ کر احمد نے دل ہی دل میں خود کو ڈھیروں داد دی کہ وہ اسمارہ کو بھیا کے بتائے گئے ٹریک پر لانے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

دونوں کے تعلقات اب پہلے جیسے خوشگوار نہیں رہے تھے۔ ایسے میں احمد خود کو تسلی دیتا۔

''کوئی بات نہیں کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی تو پڑتا ہے۔'' اسمارہ یا تو سارا دن خود کو کام میں مصروف کیے رکھتی یا فارغ وقت میں نیچے جیٹھانی کے پاس چلی جاتی۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ اسمارہ کئی دفعہ کمرے کا چکر لگا چکی تھی۔ مگر ہر دفعہ احمد کو بے خبر سویا دیکھ کر وہ مایوس لوٹ آتی۔

آج اس نے صبح ہی صبح سارے کام نمٹا لیے تھے۔ تیار ہو کر احمد کا انتظار کرتے کرتے اب اسے شدید کوفت ہونے لگی تھی۔ احمد کو نیند سے جگانا تو اُسے جنگ کی دعوت دینے کے مترادف تھا اور صبح ہی صبح وہ کوئی بدمزگی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے احمد بیدار ہوا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''آپ فریش ہو کر ناشتہ کرلیں پھر مجھے امی کے گھر چھوڑ آئیں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا مگر احمد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور تلخ لہجے میں بولا۔

''کیوں؟'' بھنویں تن گئیں۔

''کیوں کا کیا مطلب ہے احمد...... کافی دن ہوگئے ہیں امی سے ملے ہوئے۔''

''ماں سے اتنا ہی پیار تھا تو شادی ہی نہ کرتیں۔'' اس نے طنز کا تیر چھوڑا۔

''شادی کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ لڑکی ماں سے ملنا ہی چھوڑ دے یا میکے ہی نہ جائے۔'' اسمارہ نے احتجاج کیا۔

''اچھا اچھا بس......! مجھے زیادہ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش کروا دیا۔

''آج سنڈے ہے اور میرا شام تک بستر چھوڑنے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔ ایک ہی دن ہوتا ہے آرام کا وہ بھی تم جیسی بیویاں سکون سے نہیں گزارنے دیتیں۔'' اس نے بے رخی سے کہا اور رخ موڑ کر لیٹ گیا۔

اسمارہ غصے سے جلنے لگی۔

وہ جو دن رات اس کے آرام آسائش اس

سب کچھ

انہی لوگوں کا اب زمانہ ہے
جو زباں سے اپنی پھر جاتے ہیں
یہاں دلوں کی کب سنتا ہے کوئی
یہاں حکم چلائے جاتے ہیں
یہاں پھولوں کی تو قدر نہیں
پر ڈال سجائے جاتے ہیں
یہ سوداگروں کی بستی ہے
اور مول لگائے جاتے ہیں
یہاں زندوں کی تو قدر نہیں
یہاں مرقد لوگ سجاتے ہیں
میں سب کچھ دیکھتی رہتی ہوں
میں سب کچھ دیکھتی رہتی ہوں

شاعرہ: بشریٰ سعید احمد۔ لاہور

کے کھانے پینے سونے جاگنے غرض ہر چیز کا اتنا خیال رکھتی تھی ایسے کمنٹس سن کر جب غصے میں بولنا شروع ہوئی تو گویا پھٹ پڑی احمد کچھ دیر حیرت سے اُسے دیکھتا رہا آج اسمارہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ بہت دن کا جمع شدہ غبار آج نکل رہا تھا۔

نتیجتاً دونوں کی خوب لڑائی ہوئی...... احمد طیش کے مارے دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتا گھر سے باہر نکل گیا۔

گھنٹے بعد غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو گھر واپس آیا۔ اسمارہ موجود نہیں تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر پرفیوم کی

بوتل کے نیچے ڈائری کا ایک ورق پڑا تھا۔
''میں امی کے گھر جا رہی ہوں...... جب آپ کا دماغ ٹھکانے آ جائے تو آ کر لے جایئے گا۔'' پڑھنے کے بعد اس نے کاغذ کا گولا بنایا اور بدمزہ ہو کر دیوار پر دے مارا۔

☆......☆......☆

ٹی وی دیکھ دیکھ کر وہ بے زار ہو گیا تو ٹی وی بند کیا اور ریموٹ بیڈ پر اچھال دیا۔ چند ہی گھنٹوں میں اُسے اسمارہ کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔
''کہیں میں یہ سب غلط تو نہیں کر رہا؟'' ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال آیا جسے اس نے فوراً جھٹک دیا اور دھیان بٹانے کی غرض سے موبائل اٹھا کر بڑی آپا کا نمبر ملانے لگا۔ کافی دن سے اُن سے بات نہیں ہوئی تھی۔
آپا اسے اماں کی طرح عزیز تھیں وہ چودہ سال کا تھا جب ماں کا انتقال ہوا تھا اور اس کے چھ ماہ بعد ابا جان بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نصیر بھیا اور بڑی آپا نے کبھی اُسے اماں اور ابا جان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ نصیر بھیا گھر میں سب سے بڑے تھے۔ آپا دوسرے نمبر پر تھیں اس کے بعد شائستہ باجی کا نمبر تھا جو شادی کے بعد اپنے میاں کے ساتھ ڈنمارک چلی گئی تھیں۔ احمد سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بہنوں اور بھیا کا لاڈلا تھا۔ دونوں بہنوں کی شادی کے بعد نصیر بھیا نے پڑھائی سے لے کر جاب تک اور جاب سے شادی تک ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس کا خیال رکھا تھا اور اس نے بھی بھیا کو ہمیشہ باپ کی سی عزت دی تھی۔ آپا کو خدا حافظ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور نیچے کی راہ لی۔
بھیا بستر پر نیم دراز تھے اُسے دیکھ کر اُٹھ بیٹھے اور خوش دلی سے گویا ہوئے۔
''آؤ...... احمد میاں بیٹھو۔'' وہ بھیا کے پاس ہی بیٹھ گیا اور آج ہونے والا معرکہ اُن کے گوش گزار کیا۔
''اتنی چھوٹی سی بات پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کب تک ناراض رہے گی وہ...... ارے تم بالکل فکر نہ کرو یہ بیویوں کا بہت پرانا ہتھیار ہے، ناراض ہو کر میکے بیٹھ جانا، ایک دفعہ شادی کے ابتدائی ایام میں آسیہ نے بھی یہی ڈھونگ رچایا تھا مگر میں اپنی جگہ جما رہا پورے چھ مہینے پلٹ کر خبر نہیں لی تھی میں نے...... پھر ایک دن خود ہی اپنے بھائی کے ساتھ سر کے بل چلتی ہوئی گھر واپس آ گئی۔'' انہوں نے فخریہ انداز میں بتایا۔
''ہوں......'' احمد سر جھکائے سنتا رہا۔
''تمہیں ہرگز ضرورت نہیں ہے بیوی کو منانے کی اور پریشان ہونے کی، ارے یہ تو عورتوں کا دردِ سر ہے، گھر بسانا، گھر بچانا، اور کون عورت اپنا گھر خراب کرتی ہے۔ مرد بنو مرد...... مرد ایسی باتوں سے پریشان نہیں ہوتے۔'' بھیا کی باتوں سے اُسے ہمیشہ کی طرح بڑی تسلی ملی تھی۔
احمد کچھ دیر بعد اوپر جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا تو بھیا نے روک لیا۔
''کھانا کھا کر جانا۔'' اسمارہ تو تھی نہیں سو وہ دوبارہ اطمینان سے وہیں بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

مغرب کا وقت قریب تھا جب اُس کی آنکھ شور سے کھلی۔ نیچے سے کھانا کھا کر اوپر آنے کے بعد وہ سو گیا تھا۔
اَدھ کھلی آنکھوں سے گھڑی کی طرف نظر دوڑائی چھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ بھیا کے

چلانے کی آواز اوپر تک آرہی تھی۔ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی وہ کسی نہ کسی بات پر آسیہ بھابی پر چیختے چلاتے رہتے تھے۔ بے زاری سے اس نے کروٹ بدلی مگر پھراذان کی آواز سن کر اُٹھ بیٹھا۔ بھیا مسلسل دھاڑ رہے تھے وہ کسلمندی سے اُٹھا اور نماز پڑھنے کی غرض سے مسجد جانے کے لیے سیڑھیاں اترنے لگا۔

''تم نے کس کی اجازت سے اپنی بہن کو کھانے کی دعوت دی ہے۔''

''وہ...... وہ میں آپ کو بتانے ہی والی تھی۔''

''کب......؟ دعوت دینے کے بعد۔'' بھیا حسب معمول غضب ناک تھے اور بھابی آنسوؤں کے ساتھ صفائیاں دینے کی کوشش کررہی تھیں۔

بات معمولی سی تھی مگر نصیر بھیا نے حسب معمول اچھا خاصا طوفان اُٹھا رکھا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھابی کو کھڑے کھڑے زمین میں زندہ گاڑھ دیں۔

''تمہاری اتنی ہمت کیسے ہوئی؟''

''میری اجازت کے بغیر......''

''تم......''

''تمہاری اوقات کیا ہے؟''

''بابا پلیز بس کریں۔'' یہ ایان تھا جو اُسی لمحے کمرے سے برآمد ہوا تھا نمرہ بھی غصے سے سرخ چہرہ لیے اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

''ماما نے اتنا بڑا بھی کوئی جرم نہیں کیا جو آپ اس طرح انہیں ذلیل کررہے ہیں۔''

بھیا کی انگارے اُگلتی زبان یک دم رک گئی انہوں نے جیسے حیران نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر غصہ اور بیزاری نمایاں تھی۔ آسیہ بھابی بھی ایک لمحے کے لیے حیران ہوئیں مگر پھر اگلے ہی لمحے ان کے چہرے پر طمانیت کے گہرے سائے لہرانے لگے جیسے کسی کو تیز کڑکتی دھوپ میں ٹھنڈی چھاؤں میسر آگئی ہو۔

''مت بھولیں بابا کہ یہ آپ کی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری ماں بھی ہیں۔'' ایان نے 'ماں' پر خاصا زور دے کر کہا۔ بھیا ششدر تھے۔

وہ سیڑھیوں کے بیچوں بیچ حیرت کا بت بنا کھڑا ایان کو غور سے دیکھ رہا تھا جو نصیر بھیا کو آئینہ دکھا رہا تھا۔

کیا ایان کو یہ زبان بھیا کے بھابی کے ساتھ ناروا سلوک نے دی تھی؟ اس نے سوچا۔ سب کچھ بہت غیر متوقع تھا۔ بھیا کے کندھے جھکتے جارہے تھے۔ جوان ہوتی اولاد کے سامنے مزید کچھ بولنا اپنی بچی کچی عزت گنوانے کے مترادف تھا۔ بھیا ہونٹ سیے، کندھے جھکائے شکستہ قدموں سے اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

احمد اکٹھی دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آیا تاکہ اسمارہ کو منا سکے کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے بھی ایک دن اپنے بچوں کے سامنے اسی طرح شرمندہ ہونا پڑے جیسے آج بھیا ہوئے تھے۔

وہ غلط ٹریک تھا جس پر بھیا خود بھی ساری زندگی چلتے رہے تھے اور اُسے بھی چلانا چاہتے تھے۔

''شوہر بیوی پر حاوی ہو یا بیوی شوہر پر دونوں صورتوں میں ازدواجی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے میاں بیوی کا رشتہ پیار اور احساس کا رشتہ ہوتا ہے۔ جس میں عزت و احترام برابری کی سطح پر ہوتا ہے۔'' اسمارہ کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے احمد نے سوچا تھا۔

آج اُسے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ شاید یہ بات نصیر بھیا نہیں جانتے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

نفیسہ سعید

تیری، میری پریم کہانی

دراصل میں یہاں اپنی بیٹی سے ملنے آیا ہوں۔'' ''آپ کی بیٹی۔'' صوفیہ اور صمد نے بے اختیار ہی چونک کر ان کی جانب تکتے ہوئے ایک ساتھ سوال کیا سامنے بیٹھے شخص کے ایک ہی جملے نے انہیں خاصا اُلجھا دیا تھا۔ ''جی میری بیٹی اُگل جو آپ کے گھر پر......

میری سمجھ میں نہیں آتا امی آخر اس میں حرج کیا ہے؟'' شایان نے خاصی بیزاری سے صوفیہ کے چہرے پر ایک اکتائی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ اُس کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اپنے دلائل پیش کرتے کرتے بالآخر تھک سا گیا ہے۔

''اس میں سب سے بڑا حرج تو ذات برادری کا ہے۔ اس کے بعد زبان اور پھر تعلیم۔ یہ ہیں وہ تمام وجوہات جن کی بنا پر میں کبھی بھی تمہارا رشتہ اُس لڑکی کے لیے نہیں لے جاسکتی لہٰذا بہتر ہوگا کہ اب تم مجھ سے مزید بحث ترک کر کے اپنی توجہ کسی دوسری جانب مبذول کرنے کی کوشش کرو۔''

''دوسری جانب!'' اُس نے اچنبھے سے اپنی ماں کے الفاظ کو دہرایا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ میں کسی دوسری لڑکی میں دلچسپی لینے کی کوشش کروں، جس کی نہ صرف ذات برادری اور زبان ہم جیسی ہو بلکہ تعلیمی معیار میں بھی میری ہم سر ہو یعنی محبت کرنے سے پہلے ہر بات کو جانچنے کے بعد قدم اٹھایا جائے۔''

''افوہ شایان مجھ سے بلاوجہ مت اُلجھو، میرا وہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔'' صوفیہ سمجھ نہ پائیں کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کس طرح کریں۔ انہیں اس وقت اپنے اس لاڈلے بیٹے پر بے تحاشہ غصہ بھی آیا جو ایک عام سی لڑکی کے لیے ان کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔

انہوں نے ساری زندگی تعلیم کو بہت اہمیت دی، یہی وجہ تھی جو آج اُن کی ساری اولادیں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اس کے بعد اُن کی دوسری ترجیح ہمیشہ سے ہی ذات برادری تھی۔ وہ تو غیروں کے رشتے ناتے طے کرتے ہوئے بھی اس بات کو فوقیت دیا کرتی تھیں کہ رشتہ ہمیشہ اپنے ہی لوگوں میں طے ہو یہاں تو کوئی بھی بات نہ تھی۔ لڑکی کا تعلق نہ جانے کس خاندان سے تھا۔ زبان اور قومیت بھی مختلف تھی اور تعلیم صرف میٹرک...... مگر جانے شایان کو اُس میں ایسا کیا نظر آیا تھا جو وہ صرف ایک لڑکی کی خاطر آج کئی دنوں سے اُن

کے مدمقابل تھا۔ شاید خوبصورتی وہ واحد ہتھیار تھا جس کے سبب اُس لڑکی نے ان کی چھبیس سالہ محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔

''امی میں آپ سے اُلجھ نہیں رہا صرف سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ذات برادری کا فرق ہم مسلمانوں کے لیے نہیں ہے مسلمان صرف مسلمان ہے۔ امی پلیز آپ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور زبان بھی کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں وہ بہت صاف اردو بولتی اور سمجھتی ہے۔

جہاں تک تعلق اُس کی تعلیم کا ہے تو یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں وہ اپنی تعلیم شادی کے بعد بھی مکمل کرسکتی ہے ابھی تو اُس کی عمر بھی نہایت کم ہے پچھلے سال تو اُس نے میٹرک کیا ہے۔'' وہ ایک بار پھر انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''واہ بیٹا واہ پہلے تو ساری زندگی پائی پائی جوڑ کر تم چاروں بہن بھائیوں کو پڑھایا اب کسی کی بچی گھر لاکر اُس پر بھی روپیہ پانی کی طرح بہاؤں۔''

وہ کسی بھی طور شایان کی بات سننے کو تیار نہ تھیں۔ اور یہ بھی اب شایان کے پاس کچھ کہنے کو باقی بچا تھا یہ ہی سبب تھا جو وہ خاموشی سے اُٹھا کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ صوفیہ غصے سے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اُسے دور تک جاتا دیکھتی رہیں۔

☆......☆......☆

امی کی طبیعت آج صبح سے پھر خراب تھی وہ اُن کے ساتھ اسپتال میں ہی تھی۔ آج ایک ماہ سے بھی زیادہ ہوگیا تھا اُسے اپنا گھر بار چھوڑ کر اس شہر میں ماں کے علاج کے لیے رہتے ہوئے لیکن اُن کی طبیعت سنبھلنے میں ہی نہ آرہی تھی اور پھر جانے کیوں کل سے شایان نے بھی اُس سے بات نہ کی' نہ کوئی میسج اور نہ ہی فون۔

یہ ہی سبب تھا جو باہر بینچ پر بیٹھے بیٹھے اُس کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں خود بخود آنسو چلے آئے جنہیں وہ ٹشو سے صاف کررہی تھی جب اچانک دوائیوں کا تھیلا لیے ابراہیم لالہ اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''ارے گل کیوں رو رہی ہو بچہ کچھ نہیں ہوتا اماں کو انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔'' بہن کو آنسو بہاتا دیکھ کر وہ جلدی سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا جانتا تھا کہ ماں کی بیماری اور گھر سے دوری نے گل کو پریشان کردیا ہے۔

''چلو اٹھو کینٹین چلیں تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔'' وہ دوائیوں کا تھیلا وارڈ میں موجود نرس کو دے کر واپس آ گیا تھا۔

''نہیں لالہ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ آہستہ سے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''چلو جتنی بھوک ہے اتنا ہی کھالینا۔'' ابراہیم نے اُسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کردیا۔ تب ہی یک دم اُس کے ہاتھ میں موجود اُس کا موبائل بج اٹھا جس پر شایان کا نمبر دیکھتے ہی وہ کپکپا سی گئی۔

''کس کا فون ہے۔'' دو قدم آگے بڑھتا ابراہیم رُک گیا۔ اتنی دیر میں وہ بٹن دبا کر فون بند کرچکی تھی۔

''اللہ کرے وہ اِس وقت دوبارہ فون نہ کرے۔'' اُس کے دل سے نکلنے والی دعا اُس وقت شرفِ قبولیت پا گئی اور فون کی بیل دوبارہ نہ بجی۔

''فون کس کا تھا؟'' اُس کے جواب نہ دینے پر ابراہیم نے اپنا سوال پھر سے دہرایا۔

''پتہ نہیں لالہ کوئی انجان نمبر تھا' میرے اٹھانے سے پہلے ہی بند ہوگیا۔''

''اچھا اب اگر دوبارہ آئے تو مجھے دینا۔'' ابراہیم ہدایت دیتا ہوا کینٹین جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا جبکہ اُس نے خوف کے سبب جلدی سے موبائل آف کردیا مبادا دوبارہ نہ بج اٹھے۔

☆......☆......☆

شایان کئی بار بنا کسی سبب ٹیرس کے چکر کاٹ چکا تھا ہر بار جب وہ واپس پلٹتا تو مایوسی اُس کے چہرے پر سوا ہو جاتی کیونکہ شام سے ہی سامنے نظر آنے والے گھر کی تمام لائٹس بند تھیں اور گیلری میں طاری مکمل اندھیرا اِس بات کا ثبوت تھا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے' جس کے دو ہی سبب ہو سکتے تھے یا تو گل کی امی کی طبیعت زیادہ خراب تھی اور وہ ہاسپٹل میں تھیں یا شاید وہ لوگ اپنے گاؤں واپس چلے گئے تھے۔

ہر بار سوچنے پر اُسے احساس ہوا کہ پہلی بات ہی درست ہو سکتی ہے کیونکہ اُسے پورا یقین تھا کہ گاؤں جانے سے قبل گل اُسے اپنا مکمل ایڈریس ضرور دے کر جائے گی اور پھر اس طرح بنا بتائے وہ کبھی بھی واپس نہیں جاسکتی۔ شایان کی بے چینی کا ایک بڑا سبب صبح سے آف گل کا سیل بھی تھا جس پر جانے وہ کتنی بار فون کرچکا تھا مگر ہر بار کمپیوٹر کی سنائی دینے والی ریکارڈنگ اُسے پھر سے مایوس کردیتی۔

''شاید اُس کے سیل کی بیٹری آف ہوچکی ہو

اور ہاسپٹل میں وہ چارج نہ کرسکتی ہو۔'' دل میں آئے اِس خیال نے اُسے تھوڑا سا مطمئن کردیا اور وہ گیلری سے نکل کر اپنے کمرے کی جانب آ گیا جہاں جانے کے لیے اُسے لاؤنج سے گزر کر جانا تھا اور لاؤنج میں بیٹھی صوفیہ بظاہر تو ٹی وی دیکھ رہی تھیں مگر کافی دیر سے اپنے بیٹے کی بے چینی ان سے چھپی ہوئی نہ تھی انہیں رہ رہ کر حیرت ہو رہی تھی۔

اُن کا اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹا جو ایک بڑی کمپنی میں انجینئر ہونے کے ساتھ ساتھ شروع سے ہی اپنی ماں کا فرمانبردار بھی رہا تھا۔ آج صرف اور صرف ایک لڑکی کی چار دن کی محبت میں سب کچھ پس پشت ڈالے ہوئے تھا ماں کی وہ خواہش، خواب جو وہ اپنے قابل بیٹے کی شادی کے حوالے سے دیکھتی رہی تھیں، کرچی کرچی ہو چکے تھے جس کا احساس اُس کے بیٹے کو رتی برابر بھی نہیں تھا۔ شایان کی اس بے حسی نے ان کے دل میں موجود گل کے خلاف غصے کو مزید ہوا دی تھی ابھی بھی شایان کے کمرے میں جاتے ہی انہوں نے غصے سے ٹی وی بند کر کے ریموٹ صوفے پر پھینک دیا۔

''کیا بات ہے صوفیہ بیگم مزاج کیوں اس قدر برہم ہے؟'' قریب ہی بیٹھے صاحب نے اخبار سے نظریں اُٹھا کر اُن کی جانب تکا۔

''آپ تو ایسے سوال کر رہے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔'' وہ تھوڑا سا چڑ کر بولیں۔

''ہاں جو میں جانتا ہوں وہ تو خاصی پرانی بات ہوگئی مگر آپ اس وقت اتنے غصے میں کیوں ہیں وہ دریافت کر رہا ہوں۔'' صوفیہ نے یک دم غصے میں ٹی وی بند کر کے ریموٹ پھینکا اُن کی سمجھ میں نہ آیا وہ اس اچانک آنے والے غصے کا سبب جاننا چاہتے تھے۔

''کمال ہے آپ سامنے بیٹھے ہیں اور نظر نہیں آیا صاحبزادے کتنی بے چینی سے سامنے گھر میں نظر آنے والی اس پری کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گیلری کے چکر کاٹ رہے ہیں۔'' وہ قدرے جل کر بولیں۔

''اچھا تو یہ بار بار ٹیرس سے کمرے تک کے سفر کی وجہ وہ لڑکی ہے؟'' وہ تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے بولے۔

''میرا بہترین مشورہ تمہیں یہ ہے کہ اب تم اُس کی شادی کردو تھوڑے سے سمجھوتے کے سبب اگر اُس لڑکی سے کرسکتی ہو تو بہت اچھا ہے ورنہ شایان کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی اور لڑکی دیکھ لو۔ بہرحال جو بھی کرو یہ سوچ کر کرنا کہ زندگی اُس نے گزارنی ہے سو اُس کی بہتری کو دیکھتے ہوئے ہر قدم اٹھایا جائے۔'' انہوں نے بیٹے کی حالت دیکھتے ہوئے اپنی بیوی کو مشورہ سے نوازا۔

''ہاں میں بھی یہ ہی سوچ رہی ہوں کل سے یہاں وہاں نظر دوڑائی ہوں۔ ایک دو اچھی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں تو سہی میری نظر میں اب شایان کو دکھا کر پوچھتی ہوں جس پر وہ راضی ہو۔'' اس مسئلے کا اب یہی حل تھا یہ بات تو وہ بھی جانتی تھیں۔

☆......☆......☆

''یہ اتنے دنوں سے تمہارا فون کیوں آف تھا؟'' گل کے فون اٹھاتے ہی وہ تیز آواز میں بولا۔

''میں ہاسپٹل میں تھی امی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔'' وہ دھیمے سے بولی۔

''اوہ تو اب آنٹی کیسی ہیں؟''

''اب پہلے سے تو کافی بہتر ہیں آج ہی صبح

انہیں لے کر گھر آئے ہیں اور شاید اسی ہفتہ ہم گاؤں بھی واپس چلے جائیں۔'' اُداسی اُس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

''تم گاؤں واپس جارہی ہو؟'' اس خبر نے شایان کو پریشان کردیا۔

''ظاہری بات ہے واپس تو جانا ہی ہے۔ یہاں تو میں اور لالہ صرف امی کے علاج کے لیے رہ رہے تھے۔ اب وہ پہلے سے کافی بہتر ہیں تو واپس تو جانا ہوگا۔ اب تو بابا بھی روز فون کررہے ہیں گھر بھی اکیلا ہے اور زرینہ بھابی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ ہر بات تفصیل سے بتاتی چلی گئی۔

''اچھا تم مجھے اپنے گاؤں کے گھر کا ایڈریس بھیج دو میں انشاء اللہ جلد ہی امی کے ساتھ آؤں گا۔'' وہ اُسے اطمینان دلاتا ہوا بولا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے شایان' ہمارے یہاں خاندان سے باہر شادی نہیں ہوتی۔''

''چلو جی یہاں بھی وہ ہی مسئلہ تھا خاندان' ذات برادری ہمیں ہندوؤں سے آزادی حاصل کیے کئی زمانہ گزر گیا مگر آج بھی ہمارا ذہن ویسا ہی تھا ان کی طرح انسان کو ذات برادری میں بانٹے ہوئے شایان کی مایوسی میں مزید اضافہ ہوگیا محاذ صرف ایک جانب نہ تھا وہ دونوں طرف ایک محاذ پر کھڑا تھا۔

''مگر گل اگر تمہارے گھر والے نہ مانے تو پھر کیا ہوگا۔ میری امی تو پہلے ہی تیار نہیں ہیں ایسے میں اگر میں زبردستی انہیں لے بھی آجاؤں گا تو سمجھو تمہاری طرف سے انکار ہوجائے گا معاملہ تو پھر وہیں کا وہیں ہے۔'' شایان کی سمجھ میں نہ آیا یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا۔

''دیکھو شایان ہمیں جو بھی کچھ کرنا ہے خود کرنا ہے ورنہ ہمارے بڑے ہمیں کبھی ایک نہ ہونے دیں گے۔'' گل جب بولی تو ایک عجیب سی سختی اُس کے لہجہ میں تھی۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں تمہیں سمجھا دوں گی اور ایڈریس ابھی سینڈ کردیتی ہوں جو میری خالہ کے گھر کا ہے۔ وہ گاؤں سے قریب ہی شہر میں رہتی ہیں اگر تم وہاں آئے تو مجھے میسج کردینا میں خالہ کے گھر شہر آجاؤں گی تم سے ملنے۔''

اور پھر کچھ دیر باتوں کے بعد اُس نے فون بند کردیا گل سے گفتگو کے بعد شایان کو اتنا یقین تو ہوگیا تھا کہ اگر وہ گل کے بغیر نہیں رہ سکتا تو گل بھی اُس کے بنا ادھوری ہے مگر اُس کے باوجود ان دونوں کے راستے میں کئی دیواریں کھڑی تھیں۔ وہ دیواریں کس طرح ہٹائی جاسکتی ہیں' یہ بھی گل نے اُسے بہت جلد سمجھا دیا۔ شروع شروع میں تو اس ضمن میں دیا جانے والا گل کا ہر مشورہ اُسے نری بیوقوفی لگتا مگر پھر گزرتے وقت کے ہر دن نے اُسے احساس دلایا کہ بنا گل کی بات مانے وہ کبھی ایک نہیں ہوسکتے اور آخر کار اُس نے اپنے ذہن کو آمادہ کرلیا کہ اب وہ وہی کرے گا جو جس طرح اُس سے گل چاہتی ہے۔

☆......☆......☆

''تم نے مجھے اعظم بھائی کی بیٹی کے بارے میں کچھ جواب نہیں دیا۔'' صوفیہ نے شایان کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا جو بڑی خاموشی سے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ میں مصروف تھا۔

''امی میں نے آپ سے کہا تھا آپ کا جو دل چاہے کریں اگر گل نہیں تو پھر دنیا کی کوئی بھی لڑکی ہو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' بیزاری سے جواب

دینے کے ساتھ ہی وہ لیپ ٹاپ آف کر کے اُٹھ کھڑا ہوا صاف ظاہر تھا اب وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔

''تو پھر میں تمہاری طرف سے ہاں سمجھوں۔'' صوفیہ نے اُس کی تمام باتوں کو یکسر نظر انداز کر کے اپنے مطلب کی بات کی۔

''پتہ نہیں۔'' اُس کا دل ہی نہ چاہا مزید کوئی بات کرنے کو۔

''امی میرے دو سوٹ نکال کر بیگ میں ڈال دیں آج شام کو شاید مجھے حیدر آباد جاؤں میرے دوست کے بھائی کی شادی ہے۔ بارات کے ساتھ مجھے بھی جانا ہوگا۔''

''کون سے دوست کے بھائی کی؟'' وہ تقریباً اُس کے تمام دوستوں سے واقف تھیں۔

''آپ اُسے نہیں جانتیں' میرے ساتھ آفس میں ہوتا ہے۔'' وہ اپنی بات ختم کرتے ہوئے باہر کی جانب نکل گیا اور صوفیہ فوراً سے فون کی جانب لپکیں تاکہ اپنی بڑی بیٹی کو اطلاع کر سکیں کہ شایان شادی پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یہ آج کے دن اُن کے لیے سب سے بڑی خوشی تھی۔

☆......☆......☆

وہ کچن میں کام کر رہی تھیں جب اچانک کسی نے باہر کا دروازہ زور زور سے بجایا اور ساتھ ہی ڈور بیل بھی اتنی ہی شدت سے بج اٹھی۔

''اِس وقت اتنی جلدی میں کون آ گیا۔'' انہوں نے سامنے لگی گھڑی پر ایک نظر ڈالی ابھی دن کے گیارہ ہی بجے تھے۔ شایان آفس جا چکا تھا۔ گھر میں صرف وہ اور چھوٹی بیٹی مائرہ تھیں جس کے کالج کی آج چھٹی تھی۔ وہ جلدی سے ہاتھ صاف کر کے باہر کی جانب لپکیں جبکہ مائرہ ان سے پہلے ہی دروازے پر پہنچ چکی تھی۔

''کون ہے؟'' اُس نے دروازے پر لگے ہول سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

باہر دو اونچے لمبے آدمی کھڑے تھے جن میں سے ایک یقیناً گل کا بھائی تھا جو کافی عرصہ تک ان کے محلے میں بالکل سامنے والے گھر میں ہی رہ کر گیا تھا اور اکثر کالج سے واپسی پر وہ اُسے گل کے ساتھ ہاسپٹل آتا جاتا دیکھتی تھی بنا کوئی جواب دیے دروازہ پھر سے بجایا گیا۔

''کون ہے باہر......'' صوفیہ نے بیٹی کے تشویش زدہ چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے گل کا بھائی ہے۔'' مائرہ دروازے سے تھوڑا پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔'' صوفیہ بھی تھوڑا سا پریشان ہو گئیں اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اتنی دیر میں وہ اپنے سر کو اچھی طرح دوپٹے سے ڈھانپ چکی تھیں دروازہ کھولتے ہی وہ اندر کی جانب ہو گئیں۔

''کس سے ملنا ہے آپ کو۔'' اپنے لہجے کو تھوڑا سا سخت کرتے ہوئے انہوں نے سامنے موجود شخصیات سے سوال کیا۔

''یہ شایان کا ہی گھر ہے نا۔'' باہر موجود دو افراد میں سے ایک تو گل کا بھائی تھا جبکہ دوسرے کو انہوں نے آج پہلی بار دیکھا تھا وہ تھوڑا سا عمر رسیدہ شخص تھا جس نے صوفیہ سے یہ سوال کیا۔

''جی ہاں مگر آپ کون ہیں؟''

''بہن اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دیر کے لیے آپ کے گھر میں بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ گل کو تو شاید آپ جانتی ہوں بدقسمتی سے میں اُس کا باپ ہوں۔''

باہر کھڑے شخص کی آواز تھوڑی سی بھرا گئی۔

وہ اتنا پریشان کیوں تھا یہ بات صوفیہ کی سمجھ میں نہ آئی خدانخواستہ کہیں گل کو تو نہیں کچھ ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اُن کی نگاہوں کے سامنے اٹھارہ بیس سالہ خوبصورت سی گل کا چہرہ آ گیا اب وہ گھبرا سی گئیں کہ باہر کھڑے شخص کو کیا جواب دیں۔ وہ اُن کے لیے بالکل انجان تھا ایسے میں وہ کس طرح بھروسہ کرتے ہوئے اُسے اندر آنے کی اجازت دیتیں۔ انہیں کچھ سمجھ ہی نہ آیا۔

''کون ہے باہر۔'' صمد صاحب نماز پڑھ کر واک پر جاتے اور پھر واپس آ کر سو جایا کرتے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سے اُن کی یہ ہی روٹین تھی' یہ وقت ان کے دوبارہ جاگنے کا ہی ہوتا اور حسب عادت وہ جاگ کر دروازہ تک آ کھڑے ہوئے۔

''میں نے آپ کو گل کا بتایا تھا نہ' یہ اُس کے والد ہیں۔'' صوفیہ جلدی سے بتا کر دروازے سے ہٹ گئیں۔

''گل کے والد.....'' صمد کی حیرانی بجا تھی انہوں نے صرف گل کا نام ہی سنا تھا دیکھا تو اُسے بھی آج تک نہ تھا اور پھر اس طرح اُس کے باپ اور بھائی کا ان کے دروازے پر آنا جبکہ ان کے خیال کے مطابق گل کو تو اس محلے سے واپس گئے ہوئے بھی تقریباً دو تین ماہ ہو چلے تھے اب ایسا کیا ہوا جو اس باپ بیٹے کو اُن کے دروازے تک آنا پڑا ان کی چھٹی حس نے انہیں کسی خطرے کی نشاندہی کر دی۔

''آپ پلیز اندر آ جائیں۔'' یقیناً بات جو بھی تھی دروازے پر کھڑے ہو کر کرنے والی نہ تھی اس کا اندازہ تو وہ باہر کھڑے افراد کے چہروں کو دیکھ کر لگا سکتے تھے صمد صاحب کی رہنمائی میں وہ دونوں افراد ڈرائنگ روم تک آ گئے۔

''پلیز تشریف رکھیں میں ذرا چائے کا کہہ آؤں۔'' وہ دروازے سے ہی واپس پلٹنے لگے جب انہیں ابراہیم نے آواز دے کر روک دیا۔

''پلیز انکل ہم چائے وغیرہ کچھ نہیں پئیں گے آپ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر ہماری بات سن لیں۔'' وہ خاصا پریشان تھا۔ صمد صاحب واپس پلٹ آئے۔

''ہمیں شایان سے ملنا ہے صرف اس سے ملنے کے لیے میں نے اور بابا نے آپ کو زحمت دی ہے۔''

''وہ تو آفس چلا گیا مگر یہ تو بتاؤ کہ سب خیریت تو ہے تم کیوں شایان سے ملنا چاہتے ہو۔'' وہ تھوڑا سا گھبرا کر تیز تیز بولتے چلے گئے۔

''دیکھیں بھائی صاحب آپ بھی یقیناً بیٹیوں والے ہوں گے اور اس حوالے سے میری تکلیف اور پریشانی کو با آسانی سمجھ سکیں گے۔'' اس دفعہ بات گل کے والد نے شروع کی۔

''تو بات گل اور شایان کے حوالے سے ہی تھی باہر کھڑی صوفیہ نے سوچا وہ سمجھ رہی تھیں کہ سب ٹھیک ہوگیا ہے غلط تھا شایان آج بھی اُس لڑکی کی محبت کے چنگل سے باہر نہیں نکلا۔ یہاں تک کہ اُس کا باپ اور بھائی یہاں تک آن پہنچے۔ انہیں ایک بار پھر شایان پر شدت سے غصہ آیا۔

''میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' ان کی تمہید نے صمد صاحب کو بھی پریشان کر دیا۔

''اصل میں بات کچھ ایسی ہے کہ......'' بات کرتے کرتے جھجک کر انہوں نے درمیان میں ہی ادھوری چھوڑ دی۔

''جی جی بالکل آپ اپنی بات مکمل کریں اور پریشان مت ہوں آپ کی بیٹی یقیناً ہماری بھی بیٹی

ہی ہے بلکہ ایسا کریں آپ ہر بات میری بیگم کے سامنے کریں تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ میں تو کچھ زیادہ نہیں جانتا ہوسکتا ہے کسی بھی سلسلے میں صوفیہ کی مدد آپ کے کام آسکے۔''

اپنے سامنے بیٹھے چھ فٹ کے شخص کی شرمندگی دیکھ کر انہیں کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا ایسی شخصیات کا تصور تو ہمیشہ اُن کے نزدیک رعب ودبدبہ، فخر سے تنا سینہ ہی رہا تھا جبکہ یہ شخص تو ان کے تصور سے قدرے مختلف تھا یا شاید بیٹی کی محبت نے ہر چیز کو ختم کر دیا تھا۔ اپنی بات ختم کرتے ہی انہوں نے صوفیہ کو بھی باہر سے آواز دے کر اندر بلا لیا جس کا مقصد محض اُس شخص کے اعتماد کو بحال کرنا تھا۔ گھر کی عورت کا ایسے شخص کے سامنے انا جہاں پردے پر خاص توجہ دی جاتی ہو محض یہ ثابت کرنا تھا کہ ہم آپ کو خود سے الگ نہیں سمجھتے' آپ ہمارے لیے غیر نہیں ہیں۔ اسی طرح ہی شاید وہ ابراہیم اور اس کے بابا کا اعتماد بحال کرسکتے تھے۔ جس میں انہیں کافی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوگئی۔

دراصل میں یہاں اپنی بیٹی سے ملنے آیا ہوں۔''

''آپ کی بیٹی۔'' صوفیہ اور صمد نے بے اختیار ہی چونک کر ان کی جانب تکتے ہوئے ایک ساتھ سوال کیا سامنے بیٹھے شخص کے ایک ہی جملے نے انہیں خاصا اُلجھا دیا تھا۔

''جی میری بیٹی! گل جو آپ کے گھر پر موجود ہے۔''

اب پریشان ہونے کی باری صمد صاحب کی تھی شاید اپنے قبیلے کی روایات کے تحت ان لوگوں نے اپنی بیٹی کو قتل کر دیا ہے اور اب اُس کے قتل یا اغواء کا پرچہ شایان کے خلاف کٹنے کا ایک ہی پل میں کئی وسوسے اُن کے ذہن میں آکر انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر گئے انہیں شایان کی موت اپنے بالکل سامنے بیٹھی دکھائی دی اور وہ اس وقت کو پچھتاتے جب انہوں نے ان لوگوں کو اپنے گھر آنے دیا یقیناً ان کے پاس اسلحہ بھی موجود ہوگا۔

''آپ ہوش میں تو ہیں۔'' صوفیہ یک دم غصہ میں آگئیں۔

''دیکھیں بہن میں اسی لیے آپ سے اندر آکر بات کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے امید تھی کہ میری اِس بات کا کوئی بھی ردِعمل ہوسکتا ہے۔''

''ایک منٹ بابا مجھے بات کرنے دیں۔'' ابراہیم نے اپنے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش کروا دیا۔

''دراصل آنٹی مجھے یہ کہتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ گل پچھلے پندرہ دن سے گھر نہیں ہے وہ خالہ کے گھر رہنے کے لیے گئی تھی' جہاں سے کہیں غائب ہوگئی۔ اس کا موبائل اف ہے اور جب میں نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے اس کے فون کال کی لسٹ چیک کروائی تو پتہ چلا وہ آخری وقت تک صرف شایان سے رابطے میں تھی' جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ شایان کے ساتھ ہے۔ جبکہ آپ کا کہنا ہے کہ شایان آفس ہے اور گھر پر گل نہیں ہے تو پھر وہ کہاں گئی۔ یقیناً اگر وہ شایان کے ساتھ ہے تو اس وقت اُسے یہاں ہونا چاہیے۔'' ابراہیم جو کچھ کہہ رہا ہے اگر وہ سچ تھا تو پھر اس کا آخر میں کیا جانے والا سوال خاصا خطرناک تھا۔ واقعی میں یہ سوچنے والی بات تھی کہ پچھلے پورے پندرہ دن سے گل کہاں تھی؟ جبکہ شایان تو مسلسل گھر پر تھا اس دوران اُس کی کوئی بھی ایسی سرگرمی نہ تھی جو انہیں مشکوک کرتی' گل کا غائب ہونا اور موبائل نمبروں

کی لسٹ سے شایان کا نمبر ملنا درحقیقت خود ایک تشویش کی بات تھی وہ پریشان ہو اٹھیں۔

میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ہم بھی اتنے ہی لاعلم ہیں جتنے آپ اس لیے بہتر ہوگا کہ شایان سے رابطہ کر کے معلوم کیا جائے کہ گل کہاں ہے؟ اور اگر گل اُس کے ساتھ نہیں ہے تو پھر وہ کہاں ہے؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ گل ہمارے پاس اس گھر میں نہیں ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آپ میرے پورے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔''

''نہیں انکل ہمیں آپ پر پورا یقین ہے اور یقیناً اس بات کا جواب شایان ہی بہتر دے سکے گا کہ اس وقت گل کہاں ہے؟ تو یہ اب آپ اس سے معلوم کریں میں اور بابا یہاں قریب ہی ایک ہوٹل میں مقیم ہیں اور ہوسکتا ہے شام تک ایک چکر پھر سے لگائیں کیونکہ میں شایان سے مل کر خود بھی بات کرنا چاہوں گا۔

''جو بھی ہے بھائی صاحب یہ خیال رکھیے گا میری عزت اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔'' باہر نکلتے نکلتے گل کے والد ایک دم صمد صاحب کے پاس رکتے ہوئے بولے۔

''اگر میرے اختیار میں ہوا تو انشاء اللہ آپ کی عزت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' انہوں نے تسلی دی۔

''معاملہ کیا ہے؟ یہ اُن کی سمجھ میں اُس وقت تک نہیں آسکتا تھا جب تک وہ شایان سے مل کر ہر بات نہ پوچھ لیتے اور شایان نے ابھی آٹھ بجے سے پہلے گھر نہ آنا تھا۔ اور وہ آٹھ بجے کا انتظار انہیں کس طرح کرنا تھا یہ صرف وہ اور صوفیہ ہی جان سکتے تھے مگر جانے کیوں ان کا دل شایان سے بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا کہ اگر گل شایان کے ساتھ نہ ہوئی تو...... اور

پھر اُن کا خدشہ درست ثابت ہوا۔

''امی آپ ہوش میں تو ہیں۔ مجھے کیا پتہ گل کہاں ہے؟'' صوفیہ کی بات سنتے ہی شایان کے ماتھے پر بل آگئے۔

''دیکھو بیٹا اس کے گھر والے بہت پریشان ہیں۔ انہیں پورا یقین ہے کہ لڑکی تمہارے ساتھ ہے۔ اب تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ان کی لڑکی عزت اور شرافت سے انہیں واپس کر دو۔'' صمد صاحب نے آگے بڑھ کر شایان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''پلیز پاپا آپ تو اس طرح بات نہ کریں۔ مجھے تو ہنسی آرہی ہے یہ سوچ کر کہ میں دوسرے شہر جا کر ایک لڑکی بھگا لایا اور پھر وہ پندرہ دنوں سے میرے پاس ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔'' وہ طنزیہ انداز میں کچھ اس طرح بولا کہ صمد صاحب بھی لاجواب ہو کر خاموش ہو گئے۔

''تو پھر وہ لڑکی کہاں گئی؟ ابھی اس کا باپ اور بھائی دوبارہ آنے والے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں انہیں کیا جواب دوں۔'' صوفیہ پریشانی سے بولیں۔

''وہی جواب دیں جو آپ کو دینا چاہیے۔ جب لڑکی آپ کے گھر میں نہیں ہے۔ میرے پاس نہیں ہے تو یقیناً اس کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں۔ تو آپ کیوں ڈر رہی ہیں جب وہ آئیں تو جو سچ ہوا نہیں بتا دیجیے گا۔''

صوفیہ کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس کی بات پر یقین کریں۔ اپنے بیٹے کی یا گل کے گھر والوں کی۔ دونوں میں سے کوئی ایک جھوٹ بول رہا تھا مگر کون؟ یہ فیصلہ کرنا ان کے لیے قطعی مشکل ہو گیا۔

''گل شایان کے ساتھ نہیں ہے۔'' یہ سن کر جو پریشانی ابراہیم اور خلیل صاحب کے چہرے پر

آئی وہ بھی صوفیہ کو قدرتی ہی محسوس ہوئی یا شاید وہ بیٹی کی ماں تھیں اسی لیے ان کے درد کو دل سے محسوس کر رہی تھیں۔

''دیکھیں میں پھر بھی کوشش کروں گی یہ دیکھنے کی کہ گل کہاں ہے؟ اگر وہ یہاں ہوئی اور مجھے ذرا بھی اُس کا پتہ چلا تو یقین جانیے میں اُسے آپ کو ضرور واپس کروں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

دونوں باپ بیٹا بنا کوئی بات کیے واپس پلٹ گئے مگر جاتے جاتے ابراہیم انہیں اپنا کارڈ ضرور دے گیا۔ وہ کوئٹہ کے آڑھتی تھے' کارڈ میں دکان اور گھر کے ساتھ موبائل نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ صوفیہ نے اسی پل دل سے دعا کی کہ ان کی بیٹی انہیں بحفاظت جلد از جلد واپس مل جائے تاکہ یہ شریف لوگ مزید کسی پریشانی اور متوقع بدنامی سے بچ سکیں کیونکہ ابھی تک تو یہ بات صرف گل کی خالہ جانتی ہیں کہ گل غائب ہے اور وہ بھی اسی ڈر سے خاموش تھی کہ لڑکی اُس کے گھر سے غائب ہوئی تھی ورنہ تو شاید اب تک سب کو پتہ چل گیا ہوتا۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم بھابی کیسی ہیں؟'' اتنی صبح صبح آنے والے رابعہ کے فون نے انہیں تھوڑا سا پریشان کر دیا۔ رابعہ اُن کی رشتے کی نند تھی جو گلستان جوہر رہتی تھی اور بہت کم ہی ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ البتہ ان کا بیٹا شایان کا بہت اچھا دوست تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ تعلیم مکمل کی تھی اور اب جاب بھی ایک ساتھ ہی کر رہے تھے کبھی کبھی ہونے والی یہ ملاقات بھی شایان اور زوہیب کی دوستی کا ہی نتیجہ تھی مگر رابعہ نے کبھی انہیں اس طرح فون نہ کیا تھا' یہ بات خاصی حیرت کی تھی۔ وہ جب سے گل والے مسئلے سے پریشان ہوئی تھیں۔ ہر چھوٹی چھوٹی بات انہیں اس طرح ہی ڈرایا کرتی تھی۔ گل تا حال غائب تھی اور شایان بڑے مزے اور سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔ صرف اس مسئلے کی بنا پر اس کے رشتہ کا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ چکا تھا۔ جس کی کم از کم شایان کو کوئی پرواہ نہ تھی اس کی بے پرواہی دیکھ کر بھی وہ دل ہی دل میں کلستی رہتی تھیں اکثر وہ سوچتیں اگر شایان گل کے بارے میں نہیں جانتا تو پھر وہ کیسے اتنا مطمئن نظر آ رہا ہے جبکہ وہ تو گل کی محبت کا دعویدار تھا کیا محبت حالات دیکھ کر ختم ہو گئی یا کوئی اور کہانی ہے انہیں کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا اس لیے فجر کے بعد سے وہ یہی تانے بانے بن رہی تھیں کہ اچانک ہی سات بجے کے قریب آنے والی رابعہ کی فون کال نے انہیں ڈسٹرب کر دیا اور پھر پتہ نہیں کیوں رابعہ کا خیریت دریافت کرنے کا انداز بھی انہیں کچھ الگ سا لگا شاید اِس لمحے رابعہ کی آواز اور لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں تم سناؤ آج اتنی صبح صبح میں کیسے یاد آ گئی۔''

''آپ سے تھوڑا کام ہے۔'' اس کی سرگوشیانہ آواز رازداری میں ڈھل گئی۔

''ہاں بولو کیا کام ہے؟'' صوفیہ کا دل دھڑکنے لگا۔

''آپ کسی بھی طرح آج بارہ بجے تک میرے گھر آ جائیں مگر خیال رکھیے گا اس کا علم شایان یا زوہیب میں سے کسی کو نہ ہو۔''

''ایسی کیا بات ہو سکتی تھی جس کے لیے رابعہ اس قدر رازداری کی متقاضی تھی وہ سمجھ نہ پائی۔

''چلیں میں اب فون رکھتی ہوں مگر آپ

جیسے بھی ہو آج آیئے گا ضرور اللہ حافظ۔''

ان کا جواب سنے بغیر ہی رابعہ نے فون بند کر دیا اور پھر سات بجے سے لے کر گیارہ بجے تک کا وقت انہوں نے سولی پر گزارا' گیارہ بجے شایان کے آفس جاتے ہی وہ تیار ہو کر صمد صاحب کے ساتھ رابعہ کے گھر جانے کو نکلیں اور 12:15 پر وہ اس کے گھر کے سامنے تھیں۔ رابعہ کی ہدایت کے مطابق انہوں نے کال بیل کے بجائے اُسے موبائل پر ایک مس کال دے دی اگلے ہی پل رابعہ کی چھوٹی بیٹی نے دروازہ کھول دیا اور اس کی رہنمائی میں چلتے ہوئے دونوں میاں بیوی لاؤنج تک آ گئے اور پھر وہاں سے رابعہ انہیں خاموش سے لئے ہوئے زوہیب کے کمرے کے دروازے پر آن کھڑی ہوئیں۔ اُن کی سمجھ میں ابھی تک نہ آیا کہ کون سی بلی تھیلے سے باہر نکلنے والی ہے۔ رابعہ کے دروازے کا ہینڈل گھماتے ہی دروازہ کھل گیا اور اس کی سنگت میں وہ دونوں میاں بیوی اندر داخل ہو گئے عین سامنے بیڈ پر سبز دوپٹے میں ایک لڑکی موجود تھی جو انہیں دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یقیناً گل تھی یہ جھٹکا جتنا صوفیہ کے لیے حیران کن تھا اتنا ہی صمد صاحب کو بھی لگا۔

''یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟'' بے ساختہ ہی ان کے منہ سے نکلا جبکہ گل انہیں دیکھتے ہی گھبرا کے رونے لگی۔

''تم گل ہو نا۔'' صوفیہ نے آگے بڑھ کر اُسے کندھوں سے جھنجھوڑ ڈالا جبکہ وہ بنا کوئی جواب دیے وہیں بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگی۔ وہ بری طرح کپکپا بھی رہی تھی شاید وہ خوف زدہ تھی۔ صوفیہ کی سمجھ میں نہ آیا اصل معاملہ کیا ہے۔

''پھوپو پھوپو...... '' اگلے ہی پل آواز دیتا ہوا شایان کمرے میں داخل ہوا اور سامنے موجود اپنے ماں باپ کو دیکھ کر حق دق رہ گیا۔

''تم اتنے بے غیرت نکلو گے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔'' اُسے دیکھتے ہی صوفیہ تیزی سے اُس کی جانب بڑھیں اور ایک زور کا تھپڑ اُس کے منہ پر مارتے ہوئے بولیں۔

''اس لڑکی کا خاندان اس وقت کتنی مشکل میں ہے تمہیں اس بات کا کوئی احساس نہیں ہے۔ تم اس قدر بے حس ہو مجھے تو شرم آ رہی ہے تمہیں اپنی اولاد کہتے ہوئے۔'' وہ اُسے مارتے ہوئے روتی بھی جا رہی تھی۔

''امی پلیز میری بات تو سنیں۔'' شایان نے انہیں روکنے کی کوشش ضرور کی۔ مگر مار کھاتے ہوئے بچنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی اُن کے ہاتھ تھام کر انہیں روکا۔

تھک کر وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگیں جبکہ صمد صاحب بالکل خاموش اور ساکت کھڑے تھے۔ صورتِ حال ایسی بھی ہو سکتی ہے انہیں بالکل امید نہ تھی۔

''امی پلیز اس طرح روئیں مت۔ آپ جو کہیں گی میں کروں گا بے شک آپ گل کے گھر والوں کو فون کر دیں۔ وہ اِسے آ کر لے جائیں۔ سچ ہے ماں اور باپ کو ناراض کر کے ہم اپنے لیے خوشیاں حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کا اندازہ ہمیں اچھی طرح ہو چکا ہے۔ اگر ہمارے نصیب میں صرف اس لیے دوری لکھی ہے کہ ہمارا تعلق الگ الگ زبان اور قوم سے ہے تو ٹھیک ہے یہ دوری مجھے منظور ہے۔ آپ خلیل انکل کو فون کریں گل کو آ کر لے جائیں۔'' اور پھر صوفیہ کے فون کرنے کے کچھ گھنٹوں بعد ہی دونوں باپ بیٹا وہاں پہنچ گئے گل کو اپنے سامنے صحیح سلامت دیکھ کر اُس کے

باپ کے پژمردہ چہرے پر رونق سی آ گئی۔

''یہ رہی آپ کی بیٹی! اسے آپ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ میرے بیٹے نے صرف اس سے نکاح کیا ہے اس کے علاوہ دونوں کے درمیان کوئی تعلق ابھی تک نہیں ہے۔ جس کی گواہ میری یہ نند ہے کیونکہ گل پہلے دن سے ہی اس کے ہاں ہے۔''

وہ نہایت شرمندگی سے ہر بات کی وضاحت دے رہی تھیں جیسے سارا قصور صرف ان کے بیٹے کا ہی ہو۔ دوسری جانب خلیل صاحب بھی بے حد شرمندہ تھے۔ جانتے تھے ہر عمل میں ان کی بیٹی برابر کی شریک ہے۔

''بھائی صاحب اس سب کے باوجود آپ سے ایک درخواست ضرور کروں گی اگر مناسب ہو تو ہر بات بھلا کر میرے بیٹے کو اپنا لیں کیونکہ اسی میں اب ہم سب کی بھلائی ہے اور آپ کی ہماری عزت بھی اسی عمل میں ہے۔ ورنہ سوائے بدنامی کے کچھ نہ ملے گا۔'' اپنے دل کی بات وہ زبان تک لے آئیں۔

جواب میں خلیل صاحب بالکل خاموش تھے اور سر جھکائے بیٹھے تھے گل ان کے پاؤں کے پاس بیٹھی رو رہی تھی ابراہیم چہرے پر سختی لیے اپنے باپ کے کندھے تھامے ان کے عین پیچھے کھڑا تھا۔ پورے کمرے میں عجیب سا ماحول طاری تھا۔

اگر اِن لوگوں نے رشتہ سے انکار کر دیا اور گل کو یہاں سے لے جاکر مار دیا تو میں ساری زندگی اپنے بیٹے کا سامنا نہ کرسکوں گی، یہ سوچ رہ رہ کر ان کے ذہن میں ابھر رہی تھی اور وہ ہر گزرتے لمحے میں اپنے بیٹے کی خوشیوں کی دعا گو تھیں۔ آج انہیں احساس ہوا کہ وہ بھی غلط تھیں کسی بھی معاملے میں اس قدر شدت پسندی اچھی نہ تھی اگر شایان نے اپنی پسند کا اظہار کیا ہی تھا تو دونوں گھروں کو اس بارے میں ایک دفعہ مل بیٹھ کر ضرور سوچنا چاہیے تھا مگر اس وقت تو ضد نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور اب وہ اُس لمحے کو پچھتا رہی تھیں۔

''میں گل کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ میری پوری برادری کو پتہ ہے کہ یہ اپنی خالہ کے گھر ہے آپ لوگ اگلے ہفتے آجائیں باقاعدہ رشتہ لے کر، میں اِسے اپنے گھر سے سب کے سامنے رخصت کروں گا تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ خلیل خان کی بیٹی نے گھر سے بھاگ کر شادی کر لی۔''

گل کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ آہستہ آہستہ بولتے چلے گئے۔ ان کے الفاظ نے کمرے کے ماحول کو یکسر تبدیل کر دیا ہر شخص کے چہرے کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے معاملہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا یہ تو گل اور شایان نے سوچا بھی نہ تھا۔ دونوں کو اپنی زندگی کا ایک ایک پل موت کی طرف بڑھتا دکھ رہا تھا کہ ایک دم ہی حالات بدل گئے۔ خزاں کا موسم بہار میں تبدیل ہو گیا خدا پر دونوں کا یقین سوا ہو گیا۔ صوفیہ نے آگے بڑھ کر گل کو سینے سے لگا لیا۔ خلیل صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے گل ان کے ساتھ چلی گئی واپس آنے کے لیے مگر یقیناً اُس کی یہ واپسی پہلے سے بہت مختلف اور خوبصورت ہونے والی تھی اور اب شایان کو اُسی دن کا انتظار تھا جب اُسے اپنی گل کو پوری عزت کے ساتھ واپس لے کر آنا تھا اور اب وہ دن دور نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ بنا عزت کے کی جانے والی محبت بے کار ہے۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

زینب اصغر مغل

محبت کی دھنک

"سانول...... تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے۔" اس میں احساسِ کمتری نام کو نہیں تھا اس لیے فراخدلی سے تعریف کی۔ "تمہیں پسند آیا؟" سانول نے پوچھا تو اس نے بے نیازی سے کندھے اُچکا دیے۔ "میں ہر چیز اپنی حیثیت کے مطابق......

تم تو انسان ہو آؤ گے کیوں نہ قابو میں
ہم تو پریوں کو بھی باتوں میں اُلجھا لیتے ہیں

"سانول مجھے لگتا ہے کہ تم بھی اس سے محبت کرنے لگے ہو؟" عمر نے کہا تو اس کا دل بلیوں اُچھلا۔

"اُف...... یہ دوست بھی نہ پتہ نہیں کیسے دل کے راز جان لیتے ہیں۔" اُس نے دل ہی دل میں کہا عمر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیوں...... ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے وہ بلاشبہ اچھی لڑکی ہے لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ میں دل ہی ہار بیٹھا ہوں۔" بدبخت اس انکار پر دل احتجاجاً زور سے دھڑکا تھا۔

"سانول...... میں تیرا یار ہوں تو مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔ میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں اور پھر اس کے نام پر تیری آنکھوں میں دھنک رنگ اُتر آتے ہیں۔" عمر نے تفصیل سے کہا۔

"عمر یار تم تو ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ میں تم سے کیوں کوئی بات چھپانے لگا بھلا؟ اگر میرے دل کے ساتھ دماغ نے بھی اس بات کو تسلیم کرلیا تو تم اس محبت کے سب سے پہلے راز دار ہو گے۔" اس نے اپنے طور پر اپنا دفاع کرنا چاہا تھا۔

"ہوں...... یعنی دماغ نہیں تو دل ضرور تسلیم کرتا ہے تمہارا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"دل کی کیا بات کریں دل تو ہے نادان جاناں!" سانول گنگنایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ لائن پر آ رہے ہو؟" عمر ہنسا۔

سانول اور عمر دونوں کا تعلق دولت مند گھرانے سے تھا یونیورسٹی میں عمر، شینا اور عاشر بھی اس کے گروپ کا حصہ تھے۔ عمر خود بھی ماروی کی محبت میں گوڈے گوڈے ڈوب چکا تھا مگر ماروی کا رجحان سانول کی طرف پا کر کشمکش میں تھا وہ چار بہنوں کا اکلوتا لاڈلہ بھائی بے حد دولت

مند' ہینڈسم اور ذہین تھا۔ شینا اور عاشر کا تعلق بھی ہائی کلاس سے تھا اور ماروی مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھی۔ البتہ قدرت نے اسے دولت حسن سے مالا مال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کہ دیکھنے والے کو ٹھٹک کے رُکنا پڑتا۔ پھر اس کا انداز گفتگو رکھ رکھاؤ اسے بہت سی لڑکیوں میں ممتاز کرتا تھا اور یہی اس کی شخصیت کا سحر تھا کہ سانول اور عمر کی طرح کئی لڑکوں کے دلوں کی دھڑکنیں اس کے نام کی مالا جپتی تھی شائستگی اور شگفتہ مزاجی اس کی شخصیت کا خاص وصف تھی۔

☆......☆......☆

''ماروی'' نام لینے سے دل وجد کرنے لگتا ہے۔'' وہ خود سے کہہ کر ہنسا۔ کبھی کبھی مجھے اپنی بے اختیاریوں سے خود خوف آنے لگتا ہے تم میرے لیے بہت خاص اور قابلِ احترام ہو...... اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم پر انگلی اٹھے۔ تمہیں دل کے اس خوبصورت راز سے آشنا کرنے کے لیے مجھے مناسب وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔

لیکن اس سے پہلے کوئی تو ہو جو میرے دل ناداں کی بے قراریوں کی داستان سن سکے۔ تو پھر وہ ایک ہی شخص ہے میرا پیارا یار عمر۔''

خود سے باتیں کرتے اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ چاروں بنا بتائے اس کے گھر آن دھمکے...... وہ شام زندگی کی سب سے حسین شام تھی، مجھے ایسی شیشوں والی روش پر چلنے کی عادت نہیں ہے ایسا لگتا ہے ابھی پھسل جاؤں گی۔'' ماروی نے سبک روی سے قدم اٹھاتے اور رکھتے ہوئے کہا۔

''دھیان سے یہاں پھسلنے کو اور بھی بہت کچھ ہے۔'' شینا نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اس چوٹ سے سنبھل گئی تو اور چوٹیں بھی سہہ لوں گی۔'' اس نے گویا شینا کی بات کا خوب حظ اٹھایا تھا۔

''سانول...... تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے۔'' اس میں احساسِ کمتری نام کو نہیں تھا' اس لیے فراخدلی سے تعریف کی۔

''تمہیں پسند آیا؟'' سانول نے پوچھا تو اس نے بے نیازی سے کندھے اُچکا دیے۔

''میں ہر چیز اپنی حیثیت کے مطابق پسند کرتی ہوں۔ یہ گھر یقیناً بہت خوبصورت ہے لیکن اس کی خوبصورتی شاید اس شخص کو زیادہ اٹریکٹ کرے گی جس کے اسٹینس کے مطابق ہوگا میرے لیے تو یہ گھر سے زیادہ عجائب گھر ہے۔'' وہ بھی ذرا جو متاثر ہوئی ہو یا مرعوب ہوئی ہو۔

''اور تمہارا اپنا گھر کیسا ہے؟'' سانول نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میرا گھر بظاہر دیکھنے میں جیسا بھی ہے مگر میں خود اپنی ذات میں بہت دولت مند ہوں میرے پاس محبت کے بیش بہا خزانے ہیں۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولی۔

''کس خوش نصیب کی محبت کے خزانے ہیں؟'' سانول کے علاوہ باقی تینوں نے شور مچا دیا۔

''مجھے بناتے وقت رب سوہنا میرے اندر نفرت کا مادہ رکھنا تو سمجھو بھول ہی گیا تھا۔ میرے اندر اتنی محبت ہے اتنی محبت ہے' اتنی محبت ہے کہ کبھی کم نہیں پڑ سکتی۔'' وہ بڑے خواب ناک انداز میں کہہ رہی تھی۔

''ارے...... کس کی محبت؟'' شینا نے اس خوابیدہ لڑکی کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''گول گپوں کی محبت' چاکلیٹ اور آئس کریم کی محبت' جلیبی اور سوہن حلوے کی محبت' پیزا اور شوارمے کی محبت......'' وہ سنجیدگی سے کہتی جا رہی تھی عمر اور شینا ہنس ہنس کر پاگل ہو رہے تھے اس کی داستانِ محبت سن کر۔

''ایک دم بکواس۔'' عاشر نے اُکتا کر کہا۔

''تم جیلس ہو رہے ہو؟'' ماروی نے پوچھا۔

''کس سے؟'' وہ حیران ہوا۔

''میری محبتوں سے۔'' وہ ہنسی۔

''جی نہیں...... میرا اسٹینڈرڈ اتنا بھی لو نہیں ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولا تو سانول سمیت سب ہنس دیے۔

☆......☆......☆

'' سانول صاحب...... چائے۔'' خان بابا کی آواز اسے کھینچ کر حال میں لے آئی۔

''صاحب...... چپکے چپکے کیوں مسکرایا جا رہا ہے؟'' خان بابا نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔

''کچھ نہیں خان بابا بس یونہی۔'' کہہ کر اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆......☆......☆

شینا کہتی ہے کہ اسے دولت کی ہوس رکھنے والوں سے نفرت ہے۔ اسی نے بتایا تھا کہ سانول نے کہا تھا کہ لڑکیوں کو اس کی طرف اس کی دولت کی کشش کھینچ کر لے آتی ہے لیکن میں شادی اس لڑکی سے کروں گا جو میری دولت سے نہیں صرف مجھ سے محبت کرے گی۔'' ماروی کو شینا کے بتائے ہوئے جملے اکثر یاد آتے رہتے تھے۔

''کیا میں ثابت کر پاؤں گی کہ میری محبت ہر غرض اور طمع سے بے نیاز ہے۔ نہیں...... میں کبھی بھی اس پر یہ ظاہر نہیں کروں گی کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں ورنہ وہ مجھے بھی عام سی لڑکی سمجھے گا۔ ہاں البتہ اگر لگن سچی ہے تو پروانہ ضرور شمع تک کے پاس آئے گا۔''

اسے وہ دن یاد آیا جب اس نے سینئرز کے نرغے میں پھنس کر اسے مدد کے لیے پکارا تھا۔

''ہیلپ پلیز۔''

''واٹ ہیپنڈ؟'' وہ اس کی مدد کے لیے آیا تو خود بھی پھنس گیا۔ لڑکے لڑکیوں نے ان کے گرد گول دائرہ بنا لیا اور اب وہ ماروی سے گانے کی فرمائش کر رہے تھے۔

سانول کے آنے پر اسے بھی گھیر لیا گیا تو سب کی فرمائش پر اس نے 'جانے کیوں لوگ محبت کیا کرتے ہیں؟' کے چند بول گائے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

سانول سمیت سب نے اس کی آواز کی بہت تعریف کی اور وہ یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔

شینا تو اس کی بچپن کی دوست تھی عمر اور عاشر سے دوستی ہوئی تو وہ فائیو اسٹارز کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

چند ہی روز میں اُس کی دھڑکنیں سانول کے نام کا ورد کرنے لگیں تو سوچ کے اس نئے انداز نے اسے پریشان کر ڈالا۔ شینا کو اس کا کھویا کھویا انداز مطلب سمجھانے لگا تھا مگر ماروی نے بھی مان کے نہ دیا اور سانول خود تو اتنا لیے دیے رہنے والا تھا کہ اس سے کوئی توقع ہی بیکار تھی۔ ایک روز عمر نے اسے کچھ سنانے کی فرمائش کر دی تو سب نے خوب اصرار کیا اس کی آواز بہت خوبصورت تھی اور سب کے اصرار پر وہ گنگنانے لگی۔

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو

میرا مجلسی تبسم میرا راز داں نہیں ہے

کوئی نفس نہیں ہے کوئی ہمنوا نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو وہ مہربان نہیں
ہے
انہی پتھروں پر چل کے اگر آ سکو تو آؤ......
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں
ہے

''واہ......واہ......زبردست......'' سب نے جی بھر کے داد دی اس کی نظر سانول کی طرف اٹھی اور لمحہ بھر کے لیے اس کی نظر سے نظر ملی تو اس نے فوراً پلکیں جھکالی۔ عمر اور شینا نے خاص طور پر ان کی اس مختصری نظر کو بھی بڑی باریک بینی سے نوٹ کیا تھا۔ ان کی نظروں اور دل کا ملنا عمر اور شینا دونوں کے دلوں کی بربادی کا موجب تھا۔ عمر کو اپنی دولت پر زعم تھا اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ دولت کے بل بوتے پر ماروی کو حاصل کر لینا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں اور دوسری طرف شینا سانول کو دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔ عاشر لاابالی تھا نہ نظروں کی حقیقت سے واقف تھا نہ دلوں کے حال سے

چندروز بعد جب شینا کو یقین ہو گیا کہ ماروی سانول سے محبت کرنے لگی ہے تو اس کے کتنے ہی دن اس سوچ میں گزر گئے کہ کیا کرنا چاہیے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔
''عمر......'' دل نے فوراً اصلاح دی۔
''عمر کو سیڑھی بنانا چاہیے۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں عمر کا نمبر ملایا۔
''ہیلو شینا...... کیسے یاد کیا؟'' عمر کی شوخ آواز ابھری۔
''عمر میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' شینا نے مبہم سے انداز میں کہا۔
''آر یو آل رائٹ۔'' عمر کے لہجے میں قدر تفکر در آیا۔
''آف کورس۔'' شینا بولی۔
''کل کیمپس میں بات کریں گے۔'' عمر نے کہا۔
''نہیں۔'' شینا نے فوراً تردید کی۔
''ریزن......'' وہ حیران ہوا۔
''میں ماروی اور سانول کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتی۔''
''کوئی خاص بات ہے؟'' اس نے اُلجھ کر پوچھا۔
''ہوں......بہت خاص۔'' وہ پُرزور انداز میں بولی۔
''اچھا پھر کہاں ملو گی؟'' عمر نے دریافت کیا۔
''شاہی فوڈ پیلس پر......شام پانچ بجے رائٹ؟''
''رائٹ۔'' طے شدہ وقت اور مقام پر دونوں موجود تھے۔
''جی جناب فرمائیے......'' عمر نے کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا۔
''عمر میں تم سے بہت خاص بات کرنے آئی ہوں۔''
''تو کرو ناں......اتنی اپ سیٹ کیوں ہو؟''
''تم سانول کے دوست ہو ناں؟'' سوال کے ساتھ اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی وہاں موجود ہر شخص اپنے حال میں مست و مگن تھا۔
''اس میں کیا شک ہے؟'' عمر نے کندھے اُچکائے۔
''کوئی شک نہیں......لیکن کیا تم اس کے دل کا حال جانتے ہو؟''
''پہیلیاں بجھوانی چھوڑو...... سیدھی اور

صاف بات کرو۔''
''کیا تم جانتے ہو؟ سانول میرے بارے میں کیا سوچتا ہے؟'' آخر کار اس نے پوچھ ہی ڈالا۔
''تمہارے بارے میں؟'' وہ حیران ہوا۔
''ہاں...... میرے بارے میں؟''
''تمہارے بارے میں کیا سوچتا ہے یہ تو مجھے نہیں پتہ البتہ......'' وہ لمحہ بھر کو رُکا۔
''بتاؤ ناں...... ہم دوست ہیں۔'' وہ بے قراری سے بولی۔
''کیا میں اعتبار کرسکتا ہوں۔'' اس نے لمحہ بھر کو سوچا پھر پوچھا۔
''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' اور پھر ان دونوں کے درمیان طے ہوگیا کہ عمر کو ماروی کو حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا اور شینا سانول تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔
☆......☆......☆
''ابھی تک ناراض ہو کیا؟'' سانول نے پوچھا۔
''تمہیں بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' ماروی نے نروٹھے پن سے کہا۔
''بہت فرق پڑتا ہے۔'' سانول نے کہا تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔
''اب ہرجانے کے طور پر تم مجھے ایک قلفی کھلاؤ گے تب ہی یہ ناراضگی ختم ہوسکتی ہے۔'' ماروی نے گویا دھمکایا۔
''ایک قلفی۔'' وہ حیرت سے چلایا۔
''بھئی...... میں اپنی اوقات نہیں بھول سکتی۔''
''بھائی مت کہو۔'' وہ تڑپ کے بولا تو ماروی زور سے ہنس دی۔
''اور اوقات کا کیا مطلب ہے بھلا...... یہی مطلب ہوا ناں کہ ابھی تک خفا ہو۔''
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''سنو...... ہم دونوں...... یعنی میں اور تم الگ الگ نہیں ہیں۔'' اُس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

''او کے اللہ حافظ۔'' اس نے فوراً کہہ کر کال ڈس کنیکٹ کر دی وہ چند لمحے حیرت سے سوچتا رہا پھر سر جھٹک کے مسکرا دیا۔

☆......☆......☆

اگلے روز وہ بالکل نارمل انداز میں ملی۔

''یار...... سنا ہے کل یونیورسٹی میں کسی کی لڑائی ہوئی تھی۔'' عاشر نے کہا تو ماروی اور سانول کو حیرت ہوئی شینا اور عمر نے پوچھ ہی لیا۔

''کس کی لڑائی؟''

''وہی کریلوں کا جوڑا...... نبیلہ اور رافع۔''

''یہ خبر صرف عاشر کے پاس تھی باقی سب بے خبر تھے دل میں چور تھا اس لیے بچ جانے پر دونوں نے گہرا سانس لیا ورنہ یہ لوگ وہ حشر کرتے کہ الامان......

''مگر لڑائی ہوئی کیوں؟'' شینا نے پوچھا۔

''جب نزدیکیاں حد سے بڑھنے لگیں تو یہی انجام ہوتا ہے۔'' عمر نے کہا۔

''کچھ دور دور سے بھی وار کر لیتے ہیں۔'' شینا ہنس کر بولی۔

''ہاں نظروں کے تیروں سے...... یہ تو میں نے بھی سنا ہے پر گھائل ہونے والوں کی تعداد معلوم نہیں۔'' عاشر نے کہا۔

''شینا' عمر اور عاشر تینوں ہنس رہے تھے مگر سانول کسی گہری سوچ میں گم تھا کیونکہ ماروی اُسے نظر انداز کر رہی تھی مسلسل......

☆......☆......☆

سانول تک رسائی کا ہر رستہ دھند میں لپٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا سانول کی محبت کا حصول ناممکن سا لگ رہا تھا زندگی بے رنگ سی لگنے لگی تھی۔ دل کو کسی پل قرار نہیں تھا۔

''مجھے شینا سے بات کرنی چاہیے۔ وہی تو ہے جس کے کندھے پر سر رکھ کے رو سکتی ہوں دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہوں۔'' اس نے دلگرفتگی سے سوچا لیکن اگلے دن سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا۔

''مجھے تم سے کچھ شیئر کرنا ہے ماروی۔'' شینا نے کھنکتی ہوئی آواز میں کہا۔

''پتہ ہے سانول...... مجھے پسند کرتا ہے میں نے کئی بار محسوس کیا ہے وہ سب سے چوری چوری مجھے تکتا ہے۔'' وہ اپنے آپ میں مست تھی۔ ماروی کے دل پر ایک قیامت آ کے گزر گئی اور شینا کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔

''اُس نے ایک دفعہ کہا تھا...... شینا تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو اور عمر نے بھی مجھے بتایا ہے کہ وہ اکثر عمر سے میری باتیں کرتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوا ناں...... کہ وہ مجھے لائک کرتا ہے۔''

☆......☆......☆

''سانول...... یار آج میں بہت خوش ہوں۔'' عمر نے کہا۔

''اچھا جی...... خوش ہونے کی وجہ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔'' سانول مسکرایا۔

''ہاں تو کیوں نہیں...... تُو تو میرا جگری یار ہے تجھے نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا۔'' عمر نے جذباتی پن کا مظاہرہ کیا۔

''وہ ماروی ہے ناں یار...... وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔'' عمر نے کن انکھیوں سے سانول کی طرف دیکھ کر کہا۔

سانول کا دل دھک سے رہ گیا مگر اُس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو قابو میں رکھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

"اچھا......اس نے خود تم سے کہا؟"

"ہاں تو اور کیا؟" عمر وثوق سے بولا۔

"تب میں نے اُسے کہا کہ تم اسے پسند کرتے ہو اور شادی بھی کرنا چاہتے ہو لیکن وہ کہتی ہے کہ میں تو تم کو پسند کرتی ہوں۔ اس لیے تم سے ہی شادی کرنا چاہتی ہوں میں نے تو اسے بہت سمجھایا ہے لیکن وہ نہیں مانی۔" عمر نے کہا۔

"ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے...... اگر ایسا کچھ ہوتا تو میں کب کا تم سے شیئر کر چکا ہوتا بلکہ شاید ماروی کو بھی پرپوز کر چکا ہوتا۔"

اس نے اپنے لہو ہوتے دل کو سنبھالا اور عمر کو تسلیاں دینے لگا۔

"تم صرف میری خاطر ایسا کہہ رہے ہو ناں۔" عمر نے جذباتی پن سے کہا۔ وہ ڈرامہ بازی کرنے میں خاصا ماہر تھا۔

"دیکھو...... میں اسے ایک بار پھر تمہاری خاطر سمجھانے کی کوشش کروں گا۔" عمر نے دلگیر انداز میں کہا۔

"چھوڑو یار...... یہ سب تو نصیب کی باتیں ہوتی ہیں کوئی کسی کے نصیب کے لکھے کو نا تو مٹا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کسی سے اس کا نصیب چھین سکتا ہے اور پھر میرا تو ایک مائنڈ ہے کہ میں اسی لڑکی سے شادی کروں گا جو مجھے دل و جان سے چاہے گی۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور یقیناً تم بھی...... خدا کرے، تم دونوں ہمیشہ خوش رہو۔" سانول نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور اُٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

"واہ...... میرے یار تم تو بہت ہی بھولے ہو...... اتنی آسانی سے تم نے رستہ بدل لیا اور اپنا نصیب میرے حوالے کر دیا۔ واہ شینا صاحبہ...... تم نے تو کمال ہی کر دیا۔" عمر اس کے جاتے ہی قہقہہ لگا کے ہنسا۔

☆......☆......☆

جانے کیوں لوگ محبت کیا کرتے ہیں
دل کے بدلے درد دل دیا کرتے ہیں

آج کل یہ گانا وہ کچھ زیادہ ہی مستقل مزاجی سے سننے لگی تھی۔

"شینا نے سچ کہا تھا کہ وہ کلاس کانشس ہے اُسے بھلا مجھ جیسی غریب لڑکی سے محبت کر کے اپنی کلاس میں سر نیچا کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر مجھے اس سے ایک بار پوچھ لینا چاہیے۔" اُس نے سوچا۔

"سانول...... میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"جی جناب عالیہ ضرور پوچھیے۔" وہ آج فل موڈ میں لگ رہا تھا۔

"سانول...... تم نے کبھی میرے بارے میں سوچا؟"

"تمہارے بارے میں...... مثلاً کیا؟" وہ انجان بن کر بولا۔

اور دل ہی دل میں کہا۔ (تمہاری سوچوں سے فرصت ملے تو میں کسی اور کے بارے میں سوچوں ناں۔)

"اچھا یہ بتاؤ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"تم بہت اچھی ہو اور بہت اچھی دوست ہو۔" سانول نے رسان سے کہا۔

اس کی آنکھوں میں اس وقت عمر کا پریشان چہرہ گھوم رہا تھا جو اس کی خاطر ماروی کو سانول کی طرف ملتفت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"صرف دوست ہوں؟" اس نے اپنی آواز

کی نمی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
''سوری یار...... اگر تم نے مجھ سے کوئی توقع وابستہ کر لی ہو تو...... میں نے تمہارے بارے میں کبھی اس انداز سے نہیں سوچا۔ کیونکہ یہ اختیار میں نے اپنے پیرنٹس کو دے رکھا ہے۔'' اُس نے بڑی سہولت سے اس کے جذبات کا خون کر ڈالا۔
وہ اس قدر بدلا ہوا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی اجنبی ہو محبت بھری نظروں سے دیکھنا اور کبھی شوخ اور ذو معنی باتیں کرنا سب کچھ گویا بے معنی تھا محض دل لگی کی حد تک......
''سوری اگر میری باتیں تمہیں بری لگی ہوں تو؟'' ماروی نے قدرے سنبھل کر کہا۔
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' سانول نے بالکل نارمل انداز میں کہا۔
''عمر میں انٹرسٹڈ ہے تو مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہی ہے کہ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں۔'' دل کی دنیا تہہ و بالا ہو رہی تھی جذبات اپنی ناقدری پر طوفان اٹھا رہے تھے مگر بظاہر وہ چہرے پر سکون طاری کیے بیٹھا رہا۔
دلوں کے بھید تو خدا ہی بہتر جانتا ہے طوفان اپنی تباہی مچانے کے بعد خاموشی کی زبان بولنے لگا تھا وہ اب بھی فائیو اسٹارز کے نام سے ساتھ ہی تھے لیکن اب رسمی سلام دعا اور لکھائی پڑھائی کے سوا کوئی بات نہ ہوتی تھی۔
عمر، شینا اور عاشر تینوں ہی ان دونوں کو انوالو کرنے کی کوشش کرتے سانول خلاف عادت بہت بولنے لگا تھا مگر ماروی اب پہلے والی ماروی نہ رہی تھی۔
''تم نے بے کار میں ماروی کو ڈسٹرب کیا ہوا ہے۔'' سانول کئی بار کہہ چکا تھا۔
''ہاں ویسے تو میں تم دونوں میں سے کسی کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا مگر وہ مجھے فورس کر رہی ہے۔'' عمر نے کمال اداکاری کی۔
''خیر...... تم اسے پروپوز کر کیوں نہیں دیتے۔ ویسے یار میں بھی تو شینا کو پروپوز کرنے والا ہوں۔'' سانول نے کہا۔
عمر خوشی سے اچھل پڑا یعنی اُس کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔
''ویری گڈ یار...... شینا بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم دونوں کا کپل بہت زبردست ہوگا۔''

☆......☆......☆

آج سانول اپنے پیرنٹس کو شینا کے گھر بھیجنے والا تھا۔
''یہی تو کشش ہے دولت کی...... بھلا مجھ جیسی غریب لڑکی میں سانول جیسے رئیس زادے کے لیے کیا اہمیت ہو سکتی ہے یہ دنیا صرف دولت والوں کی ہے۔'' وہ بہت دل گرفتگی سے سوچ رہی ہے۔

تیری اس ادا سے میں ہوں آشنا
اتنا جس پہ تجھے غرور ہے
میں جیوں گی تیرے بغیر بھی
مجھے زندگی کا شعور ہے

وہ جو زندگی سے مایوس ہو رہی تھی آخر کار بہت سوچنے کے بعد اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کیا کہ وہ سانول کے بغیر بھی اسے جی کر دکھائے گی اور پھر وہ اپنی پرانی جون میں واپس آ گئی۔
''یا اللہ تیرا شکر...... ماروی قسم سے تم نے تو بور کر کے رکھ دیا تھا۔'' عاشر بھی آج کل اپنی منگنی کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔
''جی ہاں جناب...... ہم تو ایسے ہی ہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔

ماہنامہ دوشیزہ کراچی ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟
......پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ پینتالیس برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔
......اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
......اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
......پوری دنیا میں پھیلے، اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
......اِس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
......جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
......اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
......آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
......جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔
شعبہ اشتہارات: ماہنامہ دوشیزہ
C-88 II۔ فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

''خیر تم جیسی بھی ہو۔ اگلے جمعہ کے روز تم سب لوگ میرے گھر میں انوائیٹ ہو۔''

''خیریت؟'' سب نے ایک ساتھ دریافت کیا۔

''ارے چھپے رستم...... کیا کرنے والے ہو؟'' عمر نے پوچھا۔

''جناب ہم بھی منگنی شدہ ہونے والے ہیں۔'' وہ کالر اکڑا کر بولا۔

''ارے چھپے رستم......'' عمر اور سانول نے اُس کی گردن پکڑلی۔

ماروی نے بازار کے بازار چھان مارے تھے وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ وہ عاشر کے لیے کیا تحفہ خریدے کہ اسے تینوں کے سامنے شرمندگی نہ ہو۔ وہ اچھا تحفہ خرید سکتی تھی لیکن اتنا قیمتی نہیں جتنا ان تینوں کا ہوسکتا تھا۔

اس کا ایک ہی حل ہے کہ میں اسے گفٹ ایڈوانس میں دے دوں اور فنکشن میں شمولیت سے معذرت کرلوں اس نے بیسٹ وشز کا خوبصورت ڈیکوریشن پیس خرید کر پیک کروایا اور عاشر کے گھر کی راہ لی۔

''واٹ ونڈرفل سرپرائز۔'' وہ خوشگوار انداز میں حیران ہوا۔ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ساتھ ہی ملازمہ کو اس کی خاطر مدارت کا آرڈر دیا۔

''تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔'' عاشر نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔

''نہیں تو۔'' وہ اس کے اس طرح دیکھنے سے اور بھی پزل ہوگئی۔

''تم بدل گئی ہو ماروی۔'' عاشر نے کہا۔

''اچھا؟'' وہ حیران ہوگئی۔

''وہ کیسے بھلا؟''

''ہاں...... اب نہ تو تمہاری ہنسی میں پہلے جیسی کھنک ہے نہ چہرے پر رونق اور نہ ہی آنکھوں میں چمک۔''

''ہم جیسے مڈل کلاس لوگوں کا زندگی پر کوئی حق جو نہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''تم اتنی ڈس اپائنٹ کیوں ہورہی ہو؟''

''ہاں کیونکہ قد سے اونچی اڑان بھرنے کا سوچ لیا تھا مگر......'' خیر اس نے سر جھٹکا۔

''ماروی...... تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے تم میرے ساتھ شیئر کرو شاید میں تمہیں کچھ گائیڈ کرسکوں۔''

''اگر تم میرا اعتبار قائم رکھوتو......'' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں وہ تو پہلے ہی اسی تلاش میں تھی کہ کوئی ہمدرد ملے اور وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکے۔

''ارے یار کہانا...... ٹرسٹ می۔'' عاشر نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

''مجھے تم لوگوں کے گروپ میں شامل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تم چاروں ہائی کلاس سے بلونگ کرتے ہو...... تو مجھے اس کا ہمیشہ کمپلیکس رہتا ہے۔''

''کیا بکواس ہے یار؟'' عاشر نے اسے ملامت کیا۔

''ضرور کسی کی بات نے تمہیں ہرٹ کیا ہے ورنہ تم اور احساسِ کمتری...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' عاشر نے زور زور سے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''کسی اور نے نہیں بلکہ میں نے خود ہی خود کو ہرٹ کیا ہے۔''

''پہیلیاں بجھوانا چھوڑو اور سیدھی طرح بتاؤ آخر ہوا کیا ہے؟'' عاشر نے اصرار کیا۔

''چھوڑو فضول باتیں...... میں دراصل تمہیں

یہ گفٹ دینے آئی تھی۔'' وہ ٹال گئی۔

'' کیوں کیا تم فنکشن میں نہیں آؤ گی۔'' عاشر نے جھٹ پوچھا۔

'' ہاں...... مشکل ہے۔'' ماروی بولی۔

'' ماروی آخر تمہیں ہوا کیا ہے کیوں اس طرح بی ہیو کررہی ہو اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں محبت ہوگئی ہے۔'' اس نے وثوق سے کہا۔

'' کیا مطلب؟'' وہ سٹپٹائی۔

'' ہاں...... تم سانول سے محبت کرنے لگی ہو۔'' عاشر نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

'' اور وہ بھی تمہیں چاہتا ہے میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے چاہت کے رنگ دیکھے ہیں۔''

'' میں نے بھی اس کی پُرشوق نگاہوں سے دھوکہ کھایا ہے مگر وہ شینا کو پرپوز کرنے والا ہے۔'' ماروی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

'' شینا کو؟'' عاشر نے حیرت سے دریافت کیا۔

'' تم سے کس نے کہا؟''

'' خود شینا نے۔'' ماروی نے کہا۔

'' اور سانول۔'' عاشر نے پوچھا۔

'' چھوڑو عاشر تم بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔'' وہ اُکتا کر بولی۔

'' دیکھ لو...... کیسے میدان مارا میں نے...... کیسی لگی میری اداکاری......'' عمر کا وہ جملہ جو اس نے شینا سے کہا تھا عاشر کو کبھی کبھی سوچ میں ڈال دیتا تھا اب بھی اسے سب کچھ غلط ہوجانے کا یقین ہوگیا تھا۔

سانول اور ماروی کے درمیان غلط فہمی کسی کی ارادی کوشش سے پیدا ہوئی تھی اور اسی غلط فہمی نے ان کے مابین صدیوں کا فاصلہ پیدا کردیا تھا اگلے روز وہ سانول کے گھر چلا آیا۔

'' خیر سے کیسے رستہ بھول گئے تم؟'' سانول نے خیر مقدمی انداز میں کہا۔

'' ہاں بس یار بھولنا پڑا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

'' ویسے تو آج تک میں نے کسی کے پرسنل میٹرز میں کبھی انٹرفیئر نہیں کیا لیکن تم اور ماروی چونکے میرے دوست ہو...... دوست تو خیر عمر اور شینا بھی ہیں لیکن......''

'' لیکن کیا؟'' سانول نے سوال اٹھایا۔

'' ویسے تو تمہاری طرح میں بھی کم گو ہوں لیکن ماروی کو تم جانتے ہو وہ روتے ہوئے لوگوں کو ہنسا دیتی تھی لیکن اب وہ پہلے والی ماروی نہیں رہی...... پتہ ہے کیوں؟'' عاشر نے کہا۔

'' نہیں۔'' سانول نے لاعلمی سے کندھے اُچکائے۔

'' افسوس ہے یار...... تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے۔ محبت کے لیے محبوب کی بے اعتنائی کسی طرح موت سے کم نہیں ہوتی۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔

'' یہ فلسفہ کہاں سے سیکھ کے آئے ہو؟'' سانول نے مسکرا کر کہا۔

'' بی سیریس یار۔'' وہ چڑ گیا۔

'' اچھا اچھا...... ٹھیک ہے۔''

'' تمہیں پتہ ہے ماروی کو محبت ہوگئی ہے۔'' عاشر نے اپنی طرف سے بم بلاسٹ کیا تھا سانول کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کے گزر گیا۔

'' ہاں...... جانتا ہوں ماروی کو عمر سے محبت ہوگئی۔'' سانول نے گہرا سانس لے کر کہا۔

'' کیا؟'' عاشر کو جھٹکا سا لگا۔

"تم سے کس نے کہا ماروی کو عمر سے محبت ہوگئی ہے؟"

"مجھے عمر نے بتایا ہے۔" چہرے پر تھکن زدہ مسافت کے آثار لیے اس نے تھکے تھکے انداز میں صوفے کی بیک سے ٹیک لگالیا۔

"اور تم...... تم کس سے محبت کرتے ہو؟" عاشر نے کریدا۔

"چھوڑو یار...... سب بے کار کی باتیں۔" سانول اُکتا کر بولا۔

"کچھ بے کار نہیں ہے...... میرے دوست ہونا؟" عاشر نے پوچھا۔

"تو؟" سانول نے سوال کیا۔

"مجھے اپنا دوست کہتے ہو ناں تو پھر اچھے بچوں کی طرح بتا دو۔" عاشر نے نرمی سے اس کے کندھے پر بازو ڈال کر کہا۔

"دیکھو یار ماروی اور عمر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن عمر کا جگر دیکھو اس نے ماروی کو میرے حق میں قائل کرنے کی کوشش کی مگر میں کیا کوئی کسی سے اس کا حق یا نصیب نہیں چھین سکتا اور محبت بھیک میں نہیں بانٹی جاتی یہ تو اعزاز ہوتا ہے جس کو بھی عطا کر دے۔" سانول نے لمبا چوڑا جواب دیا۔

"خیر...... تم یہ بتاؤ...... تم کیا چاہتے ہو؟" عاشر نے گویا بحث کو سمیٹنا چاہا۔

"میں؟" سانول سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں...... تم......" عاشر نے کہا۔

"میں ان دونوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" سانول نے کہا۔

"اور ہاں تم بھی ان کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے ہماری دوستی پر آنچ آئے...... پلیز عاشر۔" سانول نے منت کی۔

"(اوہ تو یہ تم نے میدان مارا ہے عمر...... یہ ڈرامہ رچایا ہے شینا کے ساتھ مل کر، تم سانول سے اس کا نصیب چھیننا چاہتے تھے اور وہ اسی میں دھوکہ کھا گیا)"

"اور پتہ ہے شینا مجھ سے محبت کرتی ہے اور جلد ہی میں اس کو پروپوز کرنے والا ہوں کیونکہ میرا ایک مائنڈ ہے کہ شادی میں اسی لڑکی سے کروں گا جو مجھے دل و جان سے چاہے۔" وہ بظاہر جوشیلے انداز میں اسے بتانے لگا مگر انداز کا مصنوعی پن عاشر کی آنکھوں سے چھپا نہ رہ سکا وہ خاموشی سے اس کے پاس سے اُٹھ گیا اور ریشم کی اُلجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"السلام علیکم خالہ......" عاشر نے واپسی پر چند لمحے سوچا اور عمر کے گھر کی راہ لی۔

"وعلیکم السلام...... بیٹا کیسے ہو؟" عمر کی والدہ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

"ٹھیک ٹھاک...... خالہ...... وہ عمر کہاں ہے؟" اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔

"وہ ڈرائنگ روم میں ہے شینا بھی آئی ہوئی ہے تم بھی وہیں چلے جاؤ۔" انہوں نے کہا۔

"عمر تم ماروی کے گھر پروپوزل بھیج دو ناں یار۔" شینا کہہ رہی تھی۔

"ہاں ہاں بس اسی ہفتے بھیجوں گا امی کو انشاء اللہ...... لیکن اس سے پہلے سانول کو تو بھیج دوں تمہارے گھر۔" وہ ہنسا۔

"سو تو ہے۔" شینا بھی ہنس پڑی۔

وہ وہیں رُک کر ان کے راز و نیاز سننے لگا یہ اگرچہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن اتنی گری ہوئی حرکت نہیں تھی جتنی عمر اور شینا نے مل کر کی تھی وہ دونوں اتنے خود غرض تھے کہ اپنے اپنے مطلب کے لیے انہوں نے دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے

سے چھین لیا تھا اس تو اچھا تھا وہ دونوں ایک دوسرے سے انہیں مانگ لیتے اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً ماروی اور سانول اتنے اعلیٰ ظرف ضرور تھے کہ دوستی کی خاطر کسی بھی حد سے گزر جاتے مگر عمر اور شینا نے بے حسی کی انتہا کر دی تھی وہ دونوں ہی دوستی اور محبت کے معنی سے نابلد تھے۔

ان دونوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ اپنے مطلب کے لیے کسی کے زخموں سے خون تک نچوڑ سکتے تھے وہ الٹے قدموں اس کے گھر سے نکل آیا اور سانول اور ماروی دونوں کو اپنے گھر بلایا۔

''ابھی اور اسی وقت میرے گھر آؤ۔'' اس نے گویا حکم دیا۔ سانول حواس باختہ پہنچا۔

''سانول تم ایک انتہائی نامعقول اور نالائق انسان ہو تمہاری اوقات ایک کوے سے زیادہ نہیں ہے جس سے اس کا ٹکڑا کوئی بھی لومڑی اس کے گن گا کر چھین سکتی ہے تم ایک بے وقوف اور احمق انسان ہو ایک کمزور اور لاچار انسان جو کچھ نہیں کر سکتا لوگ تمہاری ناک کے نیچے کچھ بھی کر جائیں تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔'' عاشر اسے دیکھتے ہی شروع ہو گیا تھا۔

''میری ناک کے نیچے۔'' اس نے اپنی ناک کو چھوا وہ جو عاشر کے لیکچر پر حیران ہو رہا تھا کہ گھر بلا کر انسلٹ کرنے کا کیا مقصد ہے، بھول کر ہنسنے لگا۔

''چپ...... ایک دم چپ۔'' اُس نے انگلی اُٹھا کر تنبیہ کی۔

''اور ماروی تم؟'' وہ ایک دم اس کی طرف مڑا۔

''یہ تمہارے منہ پر ہر وقت بارہ کیوں بجے رہتے ہیں خبردار اگر میں نے تمہیں آئندہ اس طرح منہ بناتے ہوئے دیکھا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' اس نے گویا دھمکی دی اس کا چہرہ غضب سے سرخ

غزل

گردش کے بعد ذات کا محور ملا مجھے
جس سے نکل گیا تھا' وہی گھر ملا مجھے

ذرے کے ایک جز سے کھلا رازِ کائنات
قطرے کی وسعتوں میں سمندر ملا مجھے

کتنی عجیب بات ہے جو چاہتا تھا میں
قسمت سے اس طرح کا مقدر ملا مجھے

میں تھا کہ کیفیات کے پردوں میں قید تھا
وہ تھا کہ ہر لحاظ سے کھل کر ملا مجھے

دنیا کی وسعتوں میں تجھے ڈھونڈتا رہا
لیکن تو میری ذات کے اندر ملا مجھے

شاعر: عمران شمشاد نرمی

ہو رہا تھا اور وہ حیران ہو رہے تھے گھر بلا کر اس طرح بے عزت کرنے کے پیچھے آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

''ہاں وہ تو ویسے بھی کوئی نہیں ہے۔'' بدحواسی میں وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

''کیا نہیں ہے؟'' وہ غرایا۔

''تت...... تم سے برا کوئی نہیں ہے؟'' وہ سہم کے دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔

''اچھا......؟'' وہ ہنس پڑا۔

''اچھا نہیں برا۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''اور تم نے ہمیں اپنے گھر میں بے عزت کرنے کے لیے بلایا ہے۔'' وہ رو دینے کو تیار تھی۔

''برا ہی لیکن...... تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔''

اور پھر اس نے ان دونوں کو ساری کہانی کہہ سنائی اور وہ دونوں منہ کھولے اُسے دیکھتے رہے۔

"تم لوگ بیٹھو میں چائے لے کر آتا ہوں۔" وہ انہیں بات کرنے کا موقع دینے کے لیے اُٹھ کر چلا گیا۔ چند لمحے توقف کے بعد سانول اس کے پاس آیا۔

"ماروی میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن میں مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔"

"سیم ٹو یو...... سانول...... لیکن شینا نے بتایا تھا کہ تمہیں دولت کی ہوس رکھنے والوں سے نفرت ہے اس لیے میں نے سوچا تھا کہ کبھی بھی اپنی محبت تم پر ظاہر نہ ہونے دوں گی کہ تم یہ نہ سمجھو کہ مجھے تم سے نہیں تمہاری دولت سے دلچسپی ہے۔" ماروی سر جھکا کر بولی۔

"اور وہ عمر۔" سانول نے کریدا۔

"بات اب کھل کر سامنے آ گئی ہے اس لیے ان کا ذکر چھوڑو۔ سچ کہوں تو سانول میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر میری لگن سچی ہوگی تو تم ضرور مجھے مل جاؤ گے۔"

"محترمہ...... دھیرج رکھیے۔ ابھی تمہارے اور میرے گھر والوں سے بات تو کر لینے دو۔"

"تم ان کی فکر نہ کرو...... انہیں اور کیا چاہیے میرے گھر والوں کو اتنا امیر کبیر شخص داماد کی شکل میں مل جائے گا ان کی بیٹی عیش کرے گی۔" وہ آنکھ دبا کر بولی۔ وہ اسے گھورنے لگا۔

"اور تمہارے گھر والوں کو چاند سی ہر فن مولا بہو مل جائے گی۔" وہ گردن تان کر بولی۔

"بڑی خوش فہمی ہے۔" وہ ہنسا۔

"اِسے خوش فہمی نہیں خود آگاہی کہتے ہیں۔" وہ گردن اکڑا کر بولی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"میں مذاق کر رہی ہوں سانول...... مجھے تمہارا ساتھ چاہیے' چاہے تم مجھے سر چھپانے کے لیے ایک کٹیا ہی کیوں نہ دے دو تن چھپانے کے لیے تین کپڑے اور دو وقت کی روٹی عزت سے کھلا دو تمہاری خاطر ہر حال میں ایڈجسٹ کر سکتی ہوں کیونکہ تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

" ٹھیک ایک ہفتے بعد سانول نے اپنے اور ماروی کے والدین کی دعاؤں اور گھر والوں کی نیک تمناؤں کے سائے میں ماروی کو اپنے نام کی رنگ پہنا کر اس کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کر لیے اس مختصر اور خوبصورت تقریب میں عاشر بھی شامل تھا۔

"اب یہی ہنستے مسکراتے چہرے لے کر کل میری منگنی میں شامل ہونا ہے تم دونوں نے۔" عاشر نے یاددہانی کرائی۔

"اور......" سانول نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

"ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔" عاشر نے ہاتھ اٹھا کر قدرے سختی سے کہا۔

"اوکے......" دونوں بیک آواز بولے۔

" اگلے روز عاشر کی منگنی پر سانول اور ماوری شینا اور عمر سے پہلے موجود تھے اور ان کی منگنی کی خبر بھی عاشر' شینا اور عمر تک پہنچا چکا تھا۔ عاشر کی درخواست پر سانول اور ماروی نے تہہ دل سے انہیں معاف کر دیا۔

شینا اور عمر نے ندامت سے جھکے سر کے ساتھ ماروی اور سانول سے تجدید دوستی کے ہاتھ بڑھائے۔

جنہیں ماروی اور سانول نے خوش دلی سے تھام لیا اور محبت کی دھنک سے سارا ماحول جگمگانے لگا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

حاجرہ ریحان

کہکشاں کھو گئی ہے

"تمہیں معلوم ہے یہ فلکیات کی تعلیم کیا کہتی ہے؟ یہ بتاتی ہے کے رات کے اندھیرے میں اکثر ٹمٹماتے، چمکتے، لچکتے، اپنی شان دکھاتے بہت سے ستارے...... جب تک اپنی آب وتاب لیے ہماری نظروں سے چار ہوتے ہیں۔ دراصل وہ......

"وہ دیکھو...... دیکھو ناں...... وہ...... رہا......

ارے یار......!"

میں اُس کے توجہ دلانے پر کتاب بند کر کے جب تک آسمان پر نظریں گاڑنے میں کامیاب ہوئی تھی ہمیشہ کی طرح وہ بھاگتا دوڑتا...... ایک سے دوسرے کونے کی طرف سفر کرتا ستارہ...... نظروں سے غائب ہو چکا تھا

......اور میرا اُس ستارے کو ایک بار پھر بروقت نہ دیکھ پانا...... اُسے غصہ دلا گیا تھا۔ اُس نے جھنجھلا کر ہاتھ جھاڑے اور کھڑا ہو گیا۔

آج یہ تیسری اور آخری رات تھی۔ گو کے اس ریسٹ ہاؤس میں اب تک دس دن رات گزارے تھے مگر دیر سے بے تکلفی ہونے کے باعث...... بچ رہنے والی ان تین راتوں میں ہم ریسٹ ہاؤس کی دہلیز نما چند لکڑی کی سیڑھیوں پر براجمان ستاروں کو ادھر اُدھر بھاگتے دیکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے...... اور ہر رات یہی ہوتا کے جب تک میری نظر کتاب سے الگ ہو کر اُس کے اشاروں پر چلتے آسمان تک پہنچتی...... ستارہ کہیں غائب ہو چکا ہوتا۔

'تم سے ایک ستارہ تک نہ دیکھا گیا...... کس قدر نا اہل ہو......؟'

اُس نے جھنجھلا کر باقاعدہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے شرم دلائی اور مجھے ہنسی آ گئی...... میں اُسے بہلانے اور اس بیکار کے مشغلے کو برخاست کرنے کی کوشش میں گویا ہوئی۔

'تمہیں معلوم ہے یہ فلکیات کی تعلیم کیا کہتی ہے؟ یہ بتاتی ہے کے رات کے اندھیرے میں اکثر ٹمٹماتے چمکتے...... لچکتے...... اپنی شان دکھاتے بہت سے ستارے...... جب تک اپنی آب و تاب لیے ہماری نظروں سے چار ہوتے ہیں۔ دراصل وہ صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہوتے ہیں۔ اُن کی روشنی کئی صدیوں کا سفر کرتی جس رات زمین پر جلوا گر ہوتی ہے بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ ہماری نظر پلٹ کر اُن کو ڈھونڈنے کی تگ و دو کرتی۔ اُن تک اگر پہنچ بھی گئی تو چمکتے دمکتے ستارے کے بجائے۔ بیابان......ان دیکھی......اندھیری خلا...... پا کر بھٹکتی رہ جائے گی۔ اسی طرح کچھ ہم میں موجود چمکتے دمکتے ستاروں جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ جو بظاہر بڑے پُر رونق اور ہشاش بشاش نظر آتے ہیں مگر دراصل کئی صدیوں پہلے ہی سے یہ مردہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان سانس لیتے...... جھلملاتے خوبصورت...... رکھ رکھاؤ والے...... تحمل مزاج لوگوں کو کریدنے کی کوشش کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ کچھ بعید نہیں کے صرف اور صرف اندھیرا ہی ہاتھ لگے۔ خاک ہو جائیں گے تم کو خبر ہونے تک۔ ہاں...... خاک ہو چکے ہیں اب اس خبر کو ہماری خاک ہی کی طرح ہوا میں اُڑا دو۔ اب ہم صرف اندھیری...... بیابان خلا ہیں...... لہٰذا ایک دوسرے کو ٹٹولنے کے بجائے اپنا اپنا رستہ پکڑ لینے میں عافیت ہے۔'

میں کچھ اور بھی کہتی مگر وہ جھنجھلاتا۔ غصے سے بل کھاتا...... ایک ہی جست میں تین سیڑھیوں کو پھلانگ کر ریسٹ ہاؤس میں داخل ہو چکا تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح اکیلی رہ گئی تھی...... کہ اچانک بجلی چلی گئی اور پورا ریسٹ ہاؤس اندھیرے میں ڈوب گیا جبکہ میں آنکھیں پٹ پٹا کر خود کو اندھیرے کا عادی کرنے میں لگ گئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر گھپ اندھیرے میں داخلی دروازہ ٹٹول کر اگر اندر چلی بھی جاؤں تو اندر کون سی روشنی میری منتظر ہو گی۔ اس وقت تک تمام ملازمین سو چکے ہوتے ہیں لہٰذا ایمرجنسی لائٹ یا ٹارچ کے جلائے جانے کی کوئی اُمید ہی نہیں تھی۔ بہتر تو یہی تھا کے بجلی کے آنے تک ہلکے ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھتی رہوں۔ مجھے ایک دم خود پر غصہ آ گیا۔ آخر یہی کام میں پہلے بھی تو کر سکتی تھی۔ کتاب بند کر کے بس آسمان کو تکتی رہتی تو بلا آخر اُس کے بجھائے گئے ستارے کو دیکھ ہی لیتی۔ آخری رات کا اختتام یوں برہمی میں نہ ہوتا۔ دل بھی بوجھل نہ ہوتا...... دوستی کا کچھ تو بھرم رکھنا چاہیے تھا۔ خود پر...... اپنے اکیلے پن پر مجھے گھمنڈ کی حد تک مان سہی...... پھر بھی راہ چلتے۔ ملتے...... کبھی کبھار دل میں جگہ لیتے لوگوں کو اس طرح خود سے بدظن کرنا بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔ مجھے نئے سرے سے خود پر حیرت ہونے لگی۔ ایسا کیوں ہے کے میں اپنی ہی ذات میں اس قدر الجھ سی گئی ہوں کہ خود اپنا سرا بھی پکڑ نہیں پاتی۔ خود کو سمجھ نہیں پاتی۔ اچانک سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے اور دوسرے لمحے عجیب سی اداسی دل پر راج کرنے لگتی ہے۔ راز کیا ہے؟ یہ کس طرح کی

زندگی گزارتی رہی ہوں۔ گزار رہی ہوں اور آگے بھی ایسے ہی کچھ کرتے رہنے پر بضد ہوں۔۔؟ زندگی سے تو کوئی گلہ نہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کے جب تک محبوب سامنے نہیں آ جاتا یہ معلوم نہیں چلتا کے تلاش۔ بے قراری...... بے چینی کس بات کی ہے؟ اسی طرح شاید اب تک میں جس تلاش میں ہوں۔ بے قرار...... بے چین ہوں میں خود بھی نہیں جانتی کے وہ کیا ہے؟ اور اب تو عمر کے اُس حصے میں ہوں کہ اُمید بھی نہیں کے کبھی اپنی تلاش میں کامیاب ہوسکوں گی۔ ناممکن...... میں ابد تک یونہی بے قرار رہوں گی...... اور غصہ مجھے اپنی بے اعتنائی کا ہے...... کہ اس سے پہلے کبھی میں نے ایک بار بھی ٹھہر کر...... سکون سے لمبی سانس بھر کر...... بہت گہرائی میں جا کر خود کو جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ میری بیقراری...... بے چینی...... ہر وقت کی نادیدہ جستجو...... میں خود بھی نہیں جانتی کے کب اس سے پالا پڑا اور کب یہ بے نام سی جستجو میری ذات کا واضح حصہ بن گئی۔ یہ سوچتے سوچتے مجھے شرم آ گئی۔ جانے نہ جانے آپ ہی نہ جانے۔ حد ہوگئی...... اور ان تمام الجھنوں اندھیروں...... بند راستوں کے باوجود کتنی سہولت سے وہ مجھے آئینہ دکھا چکا تھا۔ اب کیا ہے جواز...... حیلہ بہانہ کے اپنی صورت دیکھ کر میں خود کو پہچان نہیں سکی...... مگر کیوں؟

جیسے کسی پنجرے میں قید جانور کو...... چڑیا گھر میں ملاحظہ کیا جاتا ہے...... دور سے بھی اُس جانور کی پسندیدہ غذا تھوڑی سی مقدار میں اُس پر اندھا دھند پھینک دی جاتی ہے۔ تمام تر حفاظتی پہلوؤں پر سختی سے عمل پیرا تماش بین۔ جانور کو جس حد تک پسند کرتا ہو۔ اُس کے قریب ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہم جیسوں کی زندگی میں آنے والے۔ بھاتے...... دل بہلاتے...... خوش کرتے یہ چند خاص لوگ...... جو ہمیں محض اپنی قید کا احساس دلاتے ہیں...... آئینہ دکھاتے ہیں...... اور اس کے علاوہ یہ کرتے بھی کیا ہیں۔ اور یہ...... وہ بھی بس یہی کر چکا تھا۔ خاموش جھیل میں پتھر پھینک گیا تھا اور لہروں کی مانند دائرے میں پھیلتی میری سوچ میرے قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

آخر کہاں سے شروع کروں؟ میں نے تھک ہار کر اپنے آپ کو سمیٹا...... کہانی کی شروعات کہیں نہ کہیں سے تو ہونی ہی ہے۔ اس کہانی کی ابتدا قیاس سے شروع ہوئی اور پھر یقین کی حدود میں جا پہنچی...... اور میں بہت ہمت سے مقابلہ کرتے ہوئے بھی آخر کار ہار گئی۔

میں تو اُسے کئی سالوں سے جانتی تھی مگر شاید...... جانا میں نے اُسے...... بس چند دنوں پہلے ہی تھا۔ امی تو اُس کی تعریف کرتی ہی تھیں۔ اُن کے دل میں اُس کے لیے ہمیشہ سے ایک نرم گوشہ تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کے بچپن میں کس طرح جب اُس نے نئی نئی دو پہیوں کی سائیکل چلانی شروع کی تھی تو ایک دن مجھے جو صرف چند سال کی تھی امی سے ضد کر کے سائیکل پر سیر کرانے لے گیا تھا۔ مگر پھر وہ مجھے گرا بیٹھا تھا اور میرے رونے کے خوف سے اپنی نئی سائیکل راستے میں چھوڑ...... مجھے گود میں لیے۔ بھاگم بھاگ واپس آ گیا تھا اور پھر جیسے ہی وہ امی تک پہنچا۔

خود بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا...... اور کہتا جاتا۔

'میں کتنا گندا ہوں...... میں کتنا خراب ہوں...... میں بہت گندا ہوں...... ہے ناں آنٹی...... میں نے اسے گرا دیا...... میں گندا بچہ ہوں۔'

میں نا سمجھ بچی ہو کر بھی اُس کو اس قدر دھاڑیں مار کر روتا دیکھ کر سہم کر اپنا رونا بھول گئی تھی اور امی کی گود سے چمٹ گئی تھی۔ امی اُسے دلاسہ دیتی رہیں مگر وہ روتا دھوتا مجھے چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ امی کے سنائے گئے اس قصے پر مجھے کبھی ہنسی آتی تو کبھی میں چڑ جاتی۔ کیونکہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اُس نے مجھے شاذ ہی کبھی غور سے دیکھا ہوگا۔ بلکہ کبھی تو لگتا وہ مجھے جان بوجھ کر جتاتا ہے کے وہ مجھ سے خائف ہے یا پھر مجھے نظر انداز کر رہا ہے۔ میں نے بھی اُسے اسی طرح قبول کر لیا تھا۔ کچھ لوگ اپنے ہی طریقے سے ملتے ہیں۔ نہ وہ ملتے

ہیں نہ ہی بچھڑتے ہیں بس کہیں آس پاس منڈلاتے سے رہتے ہیں جیسے کسی پروانے کو موت کا خوف بھی ہو اور جلتی شمع سے محبت بھی ...... تو میں نے اُس کو اپنی زندگی میں وہی جگہ دی تھی ...... جو اُس نے چاہی تھی۔ یعنی ...... انگریزی گرامر والا سائلنٹ لفظ (silent words) جو کسی لفظ میں شامل تو ہو مگر پھر بھی تلفظ میں اُس کا کوئی ذکر نہ آئے۔ چلو یوں بھی ٹھیک تھا پھر اچانک یہ کیا ہوا کے میں سمجھ ہی نہیں پائی۔

'میں جانتا ہوں ...... تنہائی کا دکھ ...... ناپسند کیے جانے کا دکھ ...... جب آپ کسی کے لیے سب کچھ سہتے چلے جائیں ہر بات کو برداشت کرتے چلے جائیں بس مسکراتے چلے جائیں۔ اور جس کے لیے آپ اتنی قربانیاں دیں وہ پھر بھی آپ کی محبت کو ٹھکرا دے۔ تو کیسا دکھ ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں۔ میرے ساتھ جب ایسا ہوا تو میں تو مرد ہو کر بھی بکھر گیا مگر آپ ...... آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں آپ کس طرح یہ سب سہہ رہی ہیں اور کتنی ہمت اور استقامت سے ڈٹی ہوئی ہیں کے مجھے بھی آپ سے ہمت مل رہی ہے ...... میں آپ سے سیکھ رہا ہوں ...... میں سمجھتا ہوں۔ ہم دونوں ...... دونوں کا دکھ ایک جیسا ہی ہے ...... فرق اتنا ہے کے آپ ابھی تک محاذ پر ہیں جبکہ میں اپنا مورچہ گنوا آیا ہوں۔'

مجھے اچانک ملنے والے اُس پورے کارڈ میں کچھ اسی قسم کی باتیں تھیں جن کو پڑھ پڑھ کر میرا پارہ چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہ میں کس پاگل کے ساتھ پھنس گئی ہوں۔ میں نے دل میں سوچا۔

'اے خداوند ...... اب کہاں بھاگ لوں۔؟'

مجھے اُس کے اوپر اُس وقت سے شک ہوا تھا جب ایکدن میں بڑے مزے سے گاڑی سے کچھ سامان نکال رہی تھی اور وہ لپک کر نجانے کہاں سے وارد ہو گیا تھا اور جلدی سے میرے ہاتھ سے بھری بھری تھیلیاں اُچک لیں تھیں اُس وقت تک تو سب ٹھیک ہی رہا تھا مگر پھر اُس نے زبان کھولی۔

'کیا ظلم ہے۔ آپ کو ہی سب کرنا پڑتا ہے۔ یہ آپ کے کرنے کا کام ہے؟ میں دیکھتا ہوں آپ ہر وقت مصروف رہتی ہیں۔ کیا آپ کے میاں کا کوئی فرض نہیں۔ کوئی پرچون کی دکان تو جانا نہیں کے شرمارہے ہیں۔؟'

اُس نے تاسف سے سر ہلایا اور لفٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں گاڑی لاک کر کے پیچھے پیچھے۔ فلیٹ کے دروازے پر تمام سامان ڈھیر کر کے اُس نے پھر سے میرے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور چلتا بنا۔ دوسری بار میں کسی شادی میں جانے کے لیے نکلی تھی اور وہ لفٹ میں پہلے سے موجود تھا۔

'وہ آپ کو گاڑی تک لے کر بھی نہیں جا سکتے؟'

اُس نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ میں نے اُسے دلاسہ دیا کے ایسی بات نہیں وہ پارکنگ سے گاڑی نکالنے بچوں کو لے کر پہلے اُتر گئے یہ زیادہ اچھا ہے کے مجھے پارکنگ کی سیڑھیاں نہیں اُترنی پڑیں گی۔ اُس نے نظر بھر کر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر دکھ بھری گہری سانس لے کر منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو گیا ...... عجیب انسان ہے۔

مجھے سمجھ نہیں آیا کے اُس کا مقصد کیا ہے۔ مگر مجھے دل ہی دل میں ہنسی آتی رہی اور ساتھ ساتھ اُس پر غصہ بھی کھاتی رہی۔ وہ ہماری بلڈنگ کا ایک رہائشی تھا۔ ہم پہلے جس مکان میں رہتے تھے یہ لوگ وہاں بھی ہمارے پڑوسی تھے پھر اس عمارت کے محلے میں تعمیر شروع ہونے سے کافی محلے دار اس عمارت میں فلیٹ خرید چکے تھے۔ اُن لوگوں کا پہلے بھی آنا جانا تھا۔ فلیٹ میں آنے کے بعد بھی رہا۔ مگر میری اور اُس کی بات چیت بس چائے پانی دینے دلانے تک محدود رہی۔ بڑے ہونے کے بعد وہ اپنی والدہ کو ہمارے ہاں چھوڑ کر چلا جاتا اور فون کیے جانے پر لینے آ جاتا۔ اکثر ہمارے ہی گھر سے کوئی اُس کی والدہ کو ہماری منزل سے اُن کی منزل تک پہنچا آتا تھا۔ آہستہ آہستہ ہمارے گھر میں پیچھی مانند بھائی بہن اُڑتے چلے گئے۔ میں شادی کر کے شوہر صاحب کو لے کر امی کے پاس ہی رہنے لگی تھی اور پھر امی کے انتقال

کے بعد اُن لوگوں سے ملنا ملانا تقریباً ختم ہو گیا اور اکثر لفٹ میں یا بلڈنگ والوں کی جنرل میٹنگ میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اُس کی شادی بھی میری شادی کے آس پاس ہی بھی ہوئی تھی۔ مگر چند ہی مہینوں بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔

میرے لیے یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں اپنی زندگی میں مصروف...... شوہر صاحب کو سہولتیں دینے اور بچوں کی تربیت میں مگن ...... کبھی اُس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا...... اور پھر میں تو اُس کو بھول ہی گئی تھی یہ تک یاد نہیں تھا کے کافی دنوں تک وہ نظر نہیں آیا ہے...... بعد میں پتا یہ چلا تھا کے وہ نوکری کے سلسلے میں ملک سے باہر چلا گیا ہے اور گزرے کئی سالوں میں بھی کبھار اپنی والدہ سے ملنے یہاں آیا تھا۔ اور میرا خیال تھا کے اُسے بھی میرے وجود کے ہونے نہ ہونے کا کوئی خاص احساس نہیں تھا۔ مگر پھر......

وہ مستقل واپس آ گیا اور چند دنوں میں ہی بلڈنگ کی جنرل میٹنگ میں معلوم چلا کے وہ...... شوہر صاحب کا کولیگ ہے مگر دونوں کی برانچ مختلف ہیں ...... کبھی کبھار فون پر بات چیت ہو جاتی ہے...... اور آتے کے ساتھ ہی جیسے سب سے پہلے اُس نے مجھ پر نظر کرم کی۔ اچانک اُس کی نظروں میں آ جانا اور پھر اُس کا یوں بے باکی سے مجھ پر تجزیے کرنا مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر کچھ سمجھ بھی نہیں آ رہا تھا کے مجھے اس سلسلے میں کیا قدم اُٹھانا چاہیے۔ تیسری بار تو حد ہی ہوگئی تھی۔

وہ ایک شاپنگ پلازہ میں مل گیا۔ اتفاق سے میں اُس دن بھی اکیلی ہی تھی۔

'آپ یہ سب کیسے برداشت کر لیتی ہیں۔ اُن کو تو اتنی بھی فرصت نہیں کے آپ کے ساتھ شاپنگ پر ہی چلے جائیں۔ آپ کیوں اُن کو اتنی ڈھیل دیتی ہیں۔ کیوں آپ اکیلے اکیلے سب کام نمٹا لیتی ہیں۔ آپ کا بھی تو دل ہے۔ کبھی گھومنے پھرنے اور شوہر کے ساتھ انجوائے کرنے کا چاہتا ہوگا۔ وہ کیوں اتنے سرد مہر ہیں آپ کے ساتھ۔ آپ کو اس طرح اکیلے تنہا دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ میں اگر اُن کی جگہ ہوتا تو۔ ہر وقت۔ تمھارے ساتھ ساتھ رہتا۔!'

اُس نے کسی ریل کی طرح بے باک تقریر کی اور جھٹ سے نظروں سے ہی غائب ہو گیا۔ میں حیران پریشان کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ مگر اب مجھے اس کا انتظام کرنا ہے یہ بات ہنسی مذاق سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وہ نجانے ایسا کیا سوچ کر بیٹھ گیا ہے اور اب باقاعدہ مجھے جتانے بھی لگا۔ مجھے اُس کی غلط فہمی کو دور کرنا ہوگا۔ اور کبھی میں سوچتی کے کیا ضرورت ہے جو مرضی آئے سوچتا رہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کے میں اُس کو ہر بات کی وضاحت دوں۔

ویسے بھی ایسے لوگوں کے لیے خاموشی ہی بہترین علاج ہے۔ میں اُس وقت تک اُس کو اس قابل بھی نہیں سمجھتی تھی کے اُس پر اپنے الفاظ۔ اپنی ذاتی زندگی کھول کھول کر بیان کروں۔

ایکدن شہر کے حالات خراب ہو گئے تھے اور مجھے حسبِ عادت کچھ خبر نہیں تھی۔ کے انٹر کام بجا اور پھر بجتا ہی چلا گیا میں نے جھنجھلا کر اُٹھا کر سخت لہجے میں پوچھا۔

'کون بدتمیز ہے۔؟'

جواب میں خاموشی جس پر مجھے اور بھی غصہ آیا۔ میں نے پٹخ کر ریسور واپس رکھا ہی تھا کے انٹر کام پھر سے بج اُٹھا۔ میں نے جھٹ سے اُٹھا لیا۔ اُس نے ایک دو لفظوں میں حالات سے باخبر کیا اور پھر اپنی خدمات پیش کر دیں کے میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں چاہوں تو وہ لا کر دے سکتا ہے۔ میں نے شکریہ کے ساتھ اُس کی پیشکش کو گول مول کر دیا۔ اور جلد از جلد بچوں اور شوہر صاحب کی خیریت معلوم کرنے میں مصروف ہوگئی۔ بچے اسکول سے جلدی چھٹی ہو جانے پر اسکول کی ہی وین سے واپس آ رہے تھے اور شوہر صاحب یہ کہہ کر مطمئن کر چکے تھے کے شام تک سب ٹھیک ہو جائے گا تو ہی وہ دفتر سے اُٹھیں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ انٹر کام بجا۔ اور اُس کی تقریر شروع۔

'انہوں نے تو ایک بار بھی فون کر کے آپ سے

نہیں پوچھا ہوگا کے آپ کیسی ہیں۔ کہیں باہر تو نہیں۔ میں سب جانتا ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ مگر بھئی مجھے تو آپ پر حیرت ہوتی ہے آخر آپ کس مٹی کی بنی ہوئی ہیں؟'

اب مجھے آ گیا تھا غصہ۔ میں نے گلا کھنکھار کر اُس کا دماغ ٹھکانے لگانے کے لیے کچھ سخت باتیں کیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر سے ایسے گویا ہو گیا جیسے میں نے اُسے کچھ سخت سُنایا ہی نہ ہو۔ میں نے اُسے پھر سے ٹوکا۔

'اگر تم ایسا کچھ سمجھتے ہو تو سمجھتے رہو سمجھے۔ میں تم کو کبھی بھی کوئی صفائی نہیں دوں گی اس لیے کے تم کو میں جواب دہ نہیں ہوں۔ اور پھر تم کو میرے بارے میں اتنا سوچنے کا حق کس نے دیا؟ میری ذاتی زندگی میں دخل دینا اور رائے زنی اب بہت ہوئی۔ مجھے اور نہ آزماؤ۔ سمجھے تم؟'

مگر وہ میری بات کو ایک بار پھر نظر انداز کر کے پھر سے وہی سب دھرانے لگا۔ اب میرے پاس آخری حربہ ہی بچا تھا۔ میں نے حد ممکن دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

'سنو۔ میں آنٹی کے پاس جا کر اُن سے بات کروں کیا؟'

یہ سننا تھا کے کھٹ انٹر کام بند۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر مجھے شک تھا اور وہی ہوا۔ ایک دن میرے نام کا ایک کارڈ پوسٹ سے آ گیا۔ جس میں بکواس بھری پڑی تھی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ چکی تھی میں نے اطمینان سے چوکیدار کو بُلا کر کارڈ اُس کی امی کے ہاں بھجوا دیا۔ مجھے نہیں معلوم کے کیا ہوا۔ مگر ہاں میری جان چھوٹ گئی۔ اُس کے بعد بھی اکثر اُس سے ٹکراؤ ہو جاتا تھا مگر وہ جلدی سے راستہ بدل لیتا تھا۔ شوہر صاحب کو اُس کے اس طرح ہاتھ نہ ملانے اور ہمیں دیکھ کر راستہ بدل لینے پر ایک دو بار تشویش بس اتنی ہی ہوئی کے انھوں نے گاڑی میں بیٹھتے وقت ہی مجھ سے اس بارے میں ہلکے پھلکے انداز میں کچھ کہا اور پھر وہ بھی بھول گئے۔

میں اپنی مگن طبیعت پر غرور کی حد تک فخر کرتی رہی۔ ایسے لوگ صرف آپ کو راستے سے متزلزل کرنے آتے ہیں۔

شوہر صاحب کو اپنی نوکری کی ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد بلایا گیا اور کیونکہ دس دن سے زیادہ کی رہائش ممکن تھی اور بچے سردیوں کی چھٹی گزارنے دادی اماں کے ہاں تھے تو نا چاہتے ہوئے بھی مجھے شوہر صاحب کے ساتھ آنا پڑا۔ پہلے تو یہی گمان تھا کے چلو کچھ اسلام آباد ہی دیکھ لیں گے مگر اب جو ریسٹ ہاؤس پہنچے تو حیران رہ گئے۔ جنگل بیابان۔ ریسٹ ہاؤس اسلام آباد شہر سے کافی دور تھا اور اندھیرا پھیلتے ہی یہاں گیدڑ اور الو بولنے لگتے۔ شوہر صاحب کے دفتر والوں کا اپنا ریسٹ ہاؤس تھا اس لیے جگہ بدلنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یوں تو ریسٹ ہاؤس میں دفتر کی ملک بھر کی شاخوں سے لوگ پہنچے تھے مگر زیادہ تر کنوارے تھے۔ ایک صاحب اپنی بیگم کو لائے بھی تھے تو اُن کے کوئی رشتہ دار اسلام آباد میں ہی رہتے تھے جس کے باعث وہ صرف دو دن ریسٹ ہاؤس میں بڑی مشکل سے گزارا کر کے رشتہ دار کے ہاں سدھار گئی تھیں۔ پہنچنے والوں میں۔ وہ بھی شامل تھا مگر اب وہ اپنی حد پہچان چکا تھا۔ ویسے بھی یہ سارے صبح سویرے ناشتہ کر کے دفتر کے لیے نکل جاتے اور رات دیر تک آتے۔ میرے پاس کچھ بھی کرنے کو نہیں تھا۔ یہاں تو صفائی۔ کھانا پکانے۔ کپڑے دھونے اور استری کرنے تک کے لیے دوسرے لوگ موجود تھے لہذا میں خوب بور ہوئی اور ایک دن سردی کے باوجود پورا دن بارش میں بھیگتی رہی۔ ویسے بھی کراچی میں بارش کے لیے ترستے رہنے کے بعد اسلام آباد میں جو تیز بارش دیکھی تو دل للچا گیا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی کام بھی تو نہیں تھا اور نہ ہی کوئی بات کرنے والا تھا۔ اسلام آباد تک تو سب کچھ ٹھیک ہی رہا مگر دوسرے ہی دن پڑنے والے اتوار۔ سب تیار ہو کر مری کی دن بھر کی سیر کرنے نکل کھڑے ہوئے اور بس وہیں پہنچ کر مجھے شدید بخار نے جکڑ لیا۔ میری حالت خراب ہونے لگی مگر برداشت کرتی رہی کے اپنی وجہ سے

باقی لوگوں کی تفریح خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ واپسی پر راستے میں پڑنے والے ایک ڈاکٹر سے دوائی لے تو لی مگر بخار بھی اپنا وقت پورا کر کے ہی رہتا ہے لہذا ریسٹ ہاؤس پہنچتے پہنچتے میں نڈھال ہو چکی تھی اور رات میں بغیر کچھ کھائے پیئے جا کر بستر پر پڑ گئی۔ مجھے ہوش ہی نہیں رہا کے اندازہ کرتی کے شوہر صاحب کب کمرے میں آئے مگر ہاں اتنا یاد ہے کے صبح وہ مجھے ایک دو بار جگا کر کچھ نہ کچھ کھا لینے اور پھر دوائی لینے کی ہدایات کر کے دفتر والوں کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ میں دن بھر میں ایک بار بھی نہیں اُٹھی تھی۔ اگر ہوش آیا بھی تھا تو کچھ ایسا جیسے غبار۔ دُھند میں سب لپٹا ہوا محسوس ہوا اور میں جاگ کر بھی سوتی رہی۔ شام کے وقت کسی نے مجھے ہلکے ہلکے کندھے سے ہلا کر جگایا۔ میں نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں مگر بار بار میری نظریں بھٹک جاتیں میں کسی ایک چیز پر دھیان نہیں دے پا رہی تھی اور اسی میں مجھے نظر آیا کے وہ صبح کے وقت کمروں کی صفائی کرنے والی ملازمہ کے ساتھ کھڑا مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔

'میں جاؤں صاحب جی؟'

ملازمہ نے مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اُس سے رخصت چاہی اور اُس کا اشارہ پا کر تیزی سے کمرے سے چلی گئی۔ میں کوشش کر کے اب اُٹھ بیٹھی تھی جبکہ وہ میرے پیروں کے پاس کمبل تھوڑا اسمیٹ کر اپنی جگہ بنا کر بیٹھ گیا اور پھر مجھے نظر آیا کے اُس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔

'یہ لیں۔ سوپ ہے گرم گرم۔ آپ نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا اور دن بھر دوائی کا بھی یقیناً ناغہ کیا ہے۔ سوپ پی لیں پھر دوائی بھی دے دوں گا۔'

وہ تیزی سے میرے سامنے ٹرے جما کر گھوم کر سائیڈ ٹیبل پر آ کر جھک کر دوائیوں کو دیکھنے لگا۔

سوپ کی مزیدار خوشبو اور گرم بھاپ نے اپنا اثر دکھایا اور میں نے سڑوپ سڑوپ کر کے چمچ بھر بھر کر جلدی ہی سوپ ہڑپ کر لیا۔ وہ مسکرایا۔ پھر مجھے دوائی اور پانی کا گلاس پکڑا کر ٹرے اُٹھا کر دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔

'رات میں ایک بار پھر سوپ اور بریڈ بھجوا دوں گا۔ اسی طرح اچھے بچوں کی طرح پی لیجئے گا۔ اور ہاں یاد آیا۔ آپ کے شوہر صاحب کو تو آپ کی بہت فکر ہے بھئی۔ وہ رات کو دیر سے آئیں گے۔ آپ کو ہدایات کہلوائی ہیں کے اُن کا رات کھانے پر انتظار نہیں کیجئے گا۔ سبحان اللہ اُن کو یاد ہی نہیں کے آپ کل رات سے بخار میں تپ رہی ہیں۔ یا پھر آپ کی ناساز طبیعت کو اُن کے خیال میں خود سے ہی سنبھل جانا چاہیے۔ بہر حال مجھے پیغام دینے کا کہا تھا سو دے دیا ہے۔!'

یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اچھا ہوا چلا گیا کے میں اپنی آنکھوں کو چھلکنے سے روک نہیں سکی تھی۔ میں رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔

رات میں واقعی ایک بیرا سوپ دے کر چلا گیا اور رات کی دوائی کھا کر میری طبیعت کافی سنبھلی۔ شوہر صاحب آتے کے ساتھ ہی تھکن کا کہہ کر سو گئے اور میں اُن سے کوئی شکایت ہی نہیں کر سکی۔ کرتی بھی تو کیا کہتی۔؟

ہم جیسے مردہ ستارے۔ اب صرف دھوکے میں چمکتے ہیں۔ جس دن یہ دھوکا ختم ہو جائے گا جس دن ہماری روشنی زمین تک پہنچنی بند ہو جائے گی۔ لوگوں کو نظر نہیں آئے گی بس اُسی لمحے۔ دن۔ ہمیں باقاعدہ مردہ قرار دے کر قبر میں اُتار دیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہم نہ ہی کوئی شکایت کر سکتے ہیں یا ہی توجہ حاصل کرنے کے لیے کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اب اپنی عادت بدلوں بھی تو کس طرح۔ کیسا عجیب لگے گا میں اچانک شوہر صاحب سے کہوں کے وہ مجھے پوچھتے نہیں۔ میرا خیال نہیں کرتے۔ میرے ساتھ گھومنے پھرنے کا کوئی پلان نہیں بناتے۔ مجھے کبھی بھی اکیلے وقت نہیں دیتے۔ اگر شاذ و نادر میں بیمار پڑ بھی جاؤں تو سرہانے بیٹھ کر کبھی سر نہیں دباتے۔ آہ۔ شادی کے پندرہ سال ایک دوسرے کے ساتھ یونہی خاموشی سے گزر بسر کرنے کے بعد اس طرح کی شکایت ہو یا فرمائش۔ کچھ عجیب نہیں لگے گی؟

پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کے ایک اچھی بیوی ہونے کا یہی ثبوت ہے کے میں شوہر صاحب کو اپنی ذات کے لیے کبھی کوئی تکلیف نہ دوں۔ بے جا شکایتیں۔ فرمائشیں کر کے اُن کو ذہنی الجھن میں نہ ڈالوں اور گھر کا ماحول پُرسکون رکھنے کے لیے ہر دم اُن کا خیال رکھوں۔ اگر میری جگہ وہ بخار میں نڈھال بیہوش ہوتے تو کیا میں اس طرح معمول میں تیار ہو کر اُن کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور بھی کر سکتی تھی۔؟

ہاں شاید یہ ممکن ہوتا اگر ایسی ہی صورتحال شوہر صاحب اپنی ذات سے میرے لیے پیدا کرتے۔ مگر انجانے میں۔ خاموشی اور آہستگی سے۔ مساوات پر باندھے گئے ہمارے رشتے سے برابری ختم ہوتی گئی۔ میں صرف کرنے والی بن گئی اور کروانے والے شوہر صاحب۔ پھر بھی میں صابر و شاکر اپنی شادی شدہ زندگی کو چلاتی رہی۔ تو بھلا اب کیا کہوں؟ کیا سوچوں؟ اب تو شاید بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب تو بچوں کو بھی عادت پڑ گئی ہے کے وہ مجھے ہر وقت ہر دم تیار کامران دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کے لیے زندگی میں۔ میں کوئی کوتاہی کوئی کمی نہیں کر سکتی۔ اُن کو میں نے ہی ایک بے عیب ماں بن کر دکھایا ہے تو اب بھلا وہ کس طرح مجھ میں چھوٹا سا بھی کوئی عیب دیکھ کر برداشت کر سکیں گے؟ ہاں یہی سہی ہے کے جب تک ہماری روشنی چمکتی دمکتی نظر آ رہی ہے اسی طرح سب کو دھوکے میں رہنے دیا جائے۔ مردہ ستارے کے مردہ ہونے کا پرچار کر کے ملے گا بھی کیا؟

حسب معمول صبح شوہر صاحب دفتر سدھار گئے اور میری حالت قدرے بہتر ہونے پر میں ڈائننگ ہال میں ناشتہ کر رہی تھی کے۔ ایک بیرے نے آ کر مجھے اُس کا پیغام دیا کے ابھی سردی میں باہر نہ نکلوں اور ہو سکے تو سوپ اور لے لوں۔ دوائی بھی بلا ناغہ کھا لوں۔ میں مسکرا گئی۔ میں نے سر ہلا کر بیرے کو رخصت کر دیا۔ اور واقعی دن بھر اُس کی ہدایات پر سختی سے عمل بھی کیا۔ رات شوہر صاحب کے سو جانے کے بعد میں خود کو شال میں اچھی طرح لپیٹ کر باہر۔ ریسٹ ہاؤس کی دہلیز پر ہی چند لکڑی کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ میرا ارادہ کتاب پڑھنے کا تھا اور خوب خوب سردی کھانے کا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کے کراچی میں ابھی بھی شدید گرمی ہو رہی ہو گی ایسے میں چاہے طبعیت اجازت نہ دے تھوڑی بہت سردی کھا لینی چاہیے۔ اور ناساز طبعیت ہی کی صورت اسے لے کر کراچی واپس سدھارنا چاہیے۔ آخر کو اب بس تین راتوں ہی کی تو بات تھی۔ میں ابھی آ کر بیٹھی ہی تھی کے وہ ہاتھ میں بھاپ اُڑاتی کافی کا کپ پکڑے نمودار ہو گیا۔ میں سمجھ گئی تھی اُس کے ٹھٹکنے کے انداز سے ہی پتا چل رہا تھا کے وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔

’کافی پیئیں گی منگواؤں آپ کے لیے؟‘

میرے اثبات میں سر ہلانے پر وہ اندر جا کر کافی کا آڈر دے کر واپس چلا آیا اور میری ہی سیڑھی پر مگر دوسرے سرے پر جا بیٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں بھاپ اُڑاتی میری کافی بھی آ گئی۔

’تم دونوں میں علیحدگی کیوں ہوئی؟‘

میں نے اچانک اس طرح بے تکلفی سے اتنا ذاتی سوال اُس سے کرنے کا کبھی سوچا تک نہ تھا پتا نہیں کب یہ الفاظ میری زبان سے پھسل گئے تھے اور میں خود کو ہی سن کر دم بخود رہ گئی تھی۔

’اُسے میرا بہت زیادہ حساس ہونا پسند نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی کے میں بلاوجہ ہی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُس کے لیے پریشان ہو جاتا ہوں۔ وہ میری کیئر میری اُس کے لیے پرواہ کو میری چال سمجھتی تھی کے میں جان بوجھ کر خود کو اُس کے حواسوں پر سوار رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُس کے کہیں آنے جانے پر نظر رکھنے کے لیے اُس کو بار بار فون کر کے حال احوال لیتا ہوں۔ وہ میکے چلی جاتی تو میرے بار بار فون کرنے پر ناراض ہو جاتی کے شاید میں اُس پر شک کر رہا ہوں۔ بس کچھ یہی سب باتیں بڑھتی چلی گئیں۔‘ وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیا ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں کے شوہر اس قدر نظروں میں رکھے اور وہ اُس کی نظریں نہ سہہ پائیں۔ یا واقعی انسان کسی حال میں خوش

نہیں رہ سکتا؟

میں کتاب میں سر جھکائے بیٹھی تھی کے وہ تیز لہجے میں بولا۔

'وہ رہا۔ وہ دیکھو۔'

جب تک میں اُس کے اشارے پر تیزی سے آسمان پر گزرتے ستارے کو دیکھ پاتی وہ گم ہو چکا تھا۔ 'اوہ ہو۔ نظر نہیں آیا ناں؟ چلو کوئی بات نہیں کل رات پھر سے اُسے پکڑیں گے۔ میں تو جب سے آیا ہوں ہر رات ایسا ایک ٹوٹتا ہوا ستارہ ضرور دیکھ کر ہی سونے جاتا ہوں۔!'

پھر دوسری اور آخری تیسری رات بھی اسی طرح ہبز دبز میں گزر گئی اور میں شاید جان بوجھ کر اُس مردہ ستارے کی آخری بار ہم تک پہنچتی روشنی کو نظر انداز کرتی رہی۔ میں اُسے کیسے سمجھاتی کے یہ کس قدر غم زدہ کر دینے والا مشغلہ ہے۔ رات کو سوتے ہوئے بھلا کون چاہے گا کے کسی مردہ ہوتے ہوئے۔ بے جان ستارے کو زمین بوس ہوتا دیکھے۔ پتا نہیں اُسے ان ٹوٹتے بکھرتے ستاروں پر رحم کیوں نہیں آتا۔؟

میں نے گہرا سانس بھر کر اندھیرے میں لاتعداد چمکتے ستاروں سے بھرے آسمان پر نظر کی۔ اور میرا دل بھر آیا۔ میں اس کائنات کے بنانے والے کو پکار اُٹھی۔

'اے خدوند۔ کیا یہ سارے کے سارے ستارے مردہ ہو چکے ہیں؟ کیا کل ان کی جگہ اس آسمان کے بجائے کوئی خلا۔ اندیکھی۔ اندھیری قبر ہوگی۔؟'

اچانک مجھے کچھ محسوس ہوا اور میں گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جلدی میں میرے ہاتھ میں پکڑی کتاب لکڑی کی سیڑھیوں پر رات کی خاموشی میں اچھا خاصہ شور کرتی گر پڑی۔ میں مدد کے لیے کسی کو آواز دینا چاہتی ہی تھی کے۔ وہ ایمرجنسی لائٹ کے ساتھ نمودار ہو گیا۔

'کیا ہوا؟ کیا ہوا تم کو؟' اُس نے اپنے ہی انداز میں مجھ سے استفسار کیا۔

'کچھ نہیں۔ شاید کوئی چوہا تھا میرے پیروں پر چڑھتا چلا گیا۔ اندھیرے میں شاید اُسے بھی نظر نہیں آیا ہوگا۔؟' میں کھسیانی ہو گئی تھی۔

اُس نے جھک کر کتاب اُٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اور ایمرجنسی لائٹ بند کر کے ہم دونوں پھر سے اپنی جگہوں پر جا بیٹھے۔

'واپسی کی پیکنگ کر لی تم نے؟ کل صبح سات بجے تک ائیرپورٹ پہنچ جانا ہے۔!'

میں نے بات نکالنے کی خاطر پوچھا۔ اندھیرے میں دور سے اُس کی آواز آئی۔

'میں نے اپنا ٹرانسفر اسلام آباد کرا لیا ہے۔ میں یہاں اُس وقت تک رہوں گا جب تک اپنا کوئی کرایہ پر گھر نہ دیکھ لوں۔ اس لیے میں اب واپس نہیں جا رہا ہوں۔'

پتا نہیں کیوں میرا ایک سانس باہر جا کر اندر واپس آنا بھول گیا تھا۔ یا پھر دل نے ایک دھڑکن بہت خاموشی سے اسی اندھیرے میں کہیں کھو دی تھی۔ اچھا ہوا اُس نے ایمرجنسی لائٹ بند کر دی تھی۔ کیونکہ میں ایک بار پھر آنکھیں چھلکا بیٹھی تھی اور رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے خوف سے لرز اُٹھی تھی۔ وہ پھر گویا ہوا۔

'تم نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم سب مردہ ہو چکے ستارے ہیں۔ کہیں چمکتے نظر آئیں بھی تو دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ بس ان کی روشنی سے محظوظ ہونا چاہیے مگر کبھی بھی ان کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ پیچھا کرنے سے نظریں عمر بھر کے لیے بھول بھلیوں میں بھٹک سکتی ہیں۔ پھر سے آنکھوں میں خواب انشاء جی۔ اجتناب اجتناب اجتناب انشاء جی۔ ہاہاہا۔!'

وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر خاموش ہو گیا۔

میں اب خود کو سنبھال چکی تھی۔ گو اندھیرے میں تھی پھر بھی مسکرا رہی تھی۔ اور ایک بار پھر سے میں بے خیالی میں بول گئی۔

'اور وہ کیا کہا تھا۔ احمد فراز نے۔؟ ہاں۔
زندگی سے ایک یہی گلہ ہے مجھے۔ تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے۔

☆☆.....☆☆

منی ناول

تحسین انجم انصاری

میرے چارہ گر کو نوید ہو

زندگی سے جڑے اِک حسین رنگ کا پہلا حصہ

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ پچھلے کئی دنوں کی بارش کے بعد آج دھوپ نکلی تھی۔ موسم سرما کی نرم چمکیلی دھوپ آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔ اُس کا جاں فزا لمس جسم کو زندگی بخش احساس دلا رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہلکی سی پھوار پڑی تھی۔ اس لیے وہ اپنی چھتری ساتھ لے آئی تھی۔ سیاہ مرسڈیز بارش سے دھلی چوڑی سیاہ سڑک پر سبک انداز سے رواں دواں تھی۔ وہ سوچوں میں گم بیٹھی تھی کہ گاڑی ریڈ لائٹ کی وجہ سے رُک گئی۔ اُس نے چونک کر باہر دیکھا دونوں اطراف کی سڑکوں کے درمیان سوکھی پیلی گھاس کے درمیان ٹنڈ منڈ پودے کھڑے تھے۔ ابھی چند ماہ پہلے یہی پودے سرخ دہکتے گلاب کے پھولوں سے بھرے تھے۔ لیکن خزاں کی غارت نے اُن کا حسن تہہ و بالا کر کے اپنا سکہ جما دیا تھا۔ دور مارگلہ کے گہرے سرمئی پہاڑ ابھی تک بادلوں سے ڈھکے تھے۔ لیکن گاڑی کے اندر خوشگوار حرارت تھی۔ پھر بھی اُس کا دل چاہ رہا تھا۔ گاڑی سے باہر نکل کر خوشگوار دھوپ اپنے اندر جذب کرے۔ تھوڑی خنک ہوا چہرے پر محسوس کرے۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ گرین سگنل ہوتے ہی گاڑی دوبارہ چل دی۔ اُس نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر باہر دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک جدید خوبصورت ریسٹوران کے سامنے رُکی۔ تو اُس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔

ڈرائیور نے اُس کی سائیڈ کا دروازہ کھولا۔ تو وہ اپنا پرس اُٹھا کر باہر نکل آئی ایک نظر کھڑے ہو کر عمارت کا جائزہ لیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی مین دروازے سے اندر داخل ہو کر چاروں سمت دیکھا۔ پھر لبوں پر دھیمی مسکراہٹ سجائے تمکنت سے ایک میز کی جانب بڑھی۔ ڈھیلی ڈھالی دھاری دار گرین شرٹ اور سیاہ ڈریس پینٹ میں ملبوس دراز قد نوجوان نے کھڑے ہو کر دلکش مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کا جائزہ لیا۔ وہ جدید طرز کے بلیک اور براؤن لانگ ڈریس میں ملبوس تھی۔ چمکدار براؤن بال سٹیپس میں کٹے تھے۔

جو شانوں تک جاتے تھے۔ ستاروں سی چمکتی بڑی بڑی جاندار آنکھیں اور لبوں کا بے حد خوبصورت کٹاؤ...... وہ بہت پُراعتماد لگ رہی تھی لیکن آنکھوں میں چھپی ہلکی سی نروس لُک نوجوان سے چھپی نہ رہ سکی۔ جو کہ انڈر اسٹینڈیبل تھی۔ یہ اُن کی پہلی ملاقات تھی۔ نوجوان نے ستائشی انداز سے اُسے دیکھا اور اُس کے لیے کرسی کھینچ کر باہر نکالی...... لڑکی نے سر کے اشارے سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اُسے دیکھا اور بیٹھ گئی۔ تعارف کے دور سے گزرنے کے بعد نوجوان معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''آئی ایم ویری سوری، کہ مجھے آپ سے ریسٹوران میں ملنا پڑا۔ اصل میں ڈیڈی کے حکم کے مطابق ملنا تو آپ کے گھر میں ہی چاہتا تھا۔ اِس طرح انکل اور آنٹی سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ لیکن میری کانفرنس کراچی میں تھی۔ تمام دن بے انتہا مصروف گزرے...... آج بھی خاص طور سے واپسی کی فلائٹ اسلام آباد سے رکھوائی ہے۔ ٹائم بہت کم ہے۔ اس لیے انکل نے سجیسٹ کیا کہ ایئرپورٹ کے قریبی ریسٹوران میں ملاقات کر لیں اور یوں بھی ڈیڈی کا حکم تھا کہ آپ سے ملاقات کیے بغیر واپسی کی اجازت نہیں...... سو ہیئر آئی ایم''

نوجوان نے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ لا کر اُسے دیکھا اور وہ جو بہت غور سے اُس کی باتیں سن رہی تھی۔ ایک دم چونک گئی پھر مسکرادی۔

''آپ کو معذرت کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ مجھے آپ کی بے پناہ مصروفیات سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ وہ بولی تو نوجوان کو یوں لگا۔ کہیں سریلی اور مدھر گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ اُس کے چہرے میں کھو سا گیا تھا۔ اُس کے اِس طرح دیکھنے سے لڑکی ایکدم گلابی ہوگئی۔ آنکھوں میں روشنی پھیل گئی۔

''امیزنگ......'' نوجوان نے بے ساختہ کہا تو وہ ہنستے ہنستے چپ ہوگئی۔

''میرا خیال ہے پہلے کھانے کا آرڈر دے دیں۔ صبح سے اتنی مصروفیت رہی کہ کھانے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ آپ ریسٹوران میں طرح طرح کی خوشبوئیں...... بھوک کو خوب ہوا دے رہی ہیں۔ آپ کیا آرڈر دینا پسند کریں گی؟''

لڑکی جو اُس کے اتنی اچھی اردو بولنے کے باوجود اُس میں شامل ہلکے سے امریکن ایکسنٹ سے محظوظ ہو رہی تھی ایک بار پھر چونک گئی۔

''کچھ بھی آرڈر کر دیں پلیز...... میں سب کچھ کھا لیتی ہوں......'' نوجوان نے ایک بار پھر حیرانی سے اُسے دیکھا اور لڑکی کو اُس کی حیرت پہ حیرت ہوئی۔

''کیا آپ اکثر حیران ہونے کے عادی ہیں؟'' اُسے شرارت سوجھی تو میز پر کہنیاں ٹکا کر آگے کو جھک کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ چند لمحے تو نوجوان اِن آنکھوں کے طلسم میں کھو سا گیا۔ پھر یہ سوچ کر کہ یہ ایٹی کیٹس کے خلاف ہے۔ وہ بھی اُسی طرح جھک کر اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک اندازہ لگایا آپ نے...... مجھے اکثر غیر معمولی باتوں پر حیرت ہوتی ہے۔'' لڑکی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''ایسا کیا غیر معمولی دیکھ لیا آپ نے؟'' لڑکی محظوظ ہو کر بولی۔

''آپ کا انداز......؟'' وہ برجستہ بولا۔

''میرا انداز......؟'' اُس کی بڑی بڑی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

''ایسا کیا ہے میرے انداز میں؟''

''پہلے آرڈر دے لوں...... پھر اس بات پر بھی روشنی ڈالتا ہوں...... اُس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ اس ملاقات کو بہت زیادہ

انجوائے کررہا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے لیے بھی آرڈر کردوں؟''

''اجازت ہے۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولی۔

''مجھے خوشی ہوگی۔''

''چاہے میں بینگن آرڈر کردوں؟'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''بینگن میری پسندیدہ ڈشز میں سے ایک ہے۔'' وہ بھی جواباً شرارت سے بولی۔

''اوہو......'' وہ مصنوعی مایوسی سے بولا اور سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ تو زیادتی ہوگئی آپ کے ساتھ میں تو اپنے سامنے والے کو بھی بینگن کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔''

''اوہ شکر ہے میں آپ کے سامنے نہیں بیٹھی...... سائیڈ پر ہوں۔'' لڑکی نے بھی سنجیدہ ہوکر کہا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہنستے ہوئے لڑکی کے گالوں میں بڑے پیارے ڈمپل پڑے تھے۔ نوجوان جیسے اُن کے طلسم میں گرفتار ہوگیا۔ بیرا دونوں کے سامنے ڈرنکس رکھ کر چلا گیا تو نوجوان نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

''پلیز لیجیے۔'' لڑکی نے ڈرنک اُٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ اور نوجوان کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر نرمی' شائستگی' نفاست کی گہری چھاپ تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ ذہانت کی چمک تھی۔ گھنے سیاہ بال چہرے کو جاذبِ نظر بنا رہے تھے۔

''اگر آپ خاکسار کا جائزہ لے چکی ہیں تو میں اپنی بات شروع کروں؟'' نوجوان نے بے اختیار مسکراہٹ کو لبوں میں دبایا۔ لڑکی خفت زدہ ہوکر اپنی کلائی میں پڑے قیمتی نفیس کڑے پہ دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرنے لگی۔

''کون سی بات؟'' قدرے توقف کے بعد وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''وہی آپ کے غیر معمولی انداز والی بات۔'' نوجوان نے ایک گھونٹ بھر کر احتیاط سے اُس کی طرف دیکھا۔

''آپ کے ڈیڈی اس شہر کے چوٹی کے بزنس مین ہیں۔ میرے ڈیڈی کے مطابق آپ کا خاندان اس ملک کے امیر ترین خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد بھی ہیں۔''

''پھر؟'' لڑکی نے غور سے اُسے دیکھا۔

''پھر یہ......'' وہ اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''میں تو سمجھا تھا آج میری ملاقات ایک بگڑی ہوئی' مغرور اور نخوت سے بھرپور امیر زادی سے ہوگی۔

''مگر......'' وہ شرارت سے رُکا اور چمکتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ لڑکی نے اپنا گلاس پکڑا اور ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ اُس کے ہاتھوں میں غیر محسوس لرزش تھی۔ اُس نے خود پر قابو پایا اور نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ پھر حیرت زدہ تھا۔

''کیا میرے غیر معمولی انداز نے پھر حیران کردیا آپ کو؟''

''ہاں...... لیکن اس کے علاوہ ایک اور حیران کن بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی ہے؟''

''وہ بھی پوچھ ڈالیے۔'' اب وہ ریلیکس تھی۔

''میں سمجھتا تھا کہ دوسری باتوں کے علاوہ کھانے میں بھی آپ کے ہزاروں نخرے ہوں گے۔ لیکن آپ نے تو سب کچھ میرے اوپر ڈال دیا۔'' لڑکی بڑے دلکش انداز میں مسکرائی۔

''اگر آپ چاہیں...... تو میں آپ کو اپنا وہ

انداز بھی دکھا سکتی ہوں۔ لیکن پھر اس ریسٹورانٹ کے امن وامان اور پُرسکون ماحول کی گارنٹی میں نہیں دے سکوں گی۔ دیکھیے نا...... پھر تو چاروں طرف فرش پر ٹوٹی پلیٹوں اور چکنا چور گلاسوں کے بے شمار ٹکڑے بکھرے ہوں گے۔ بیروں کے چہروں پر کئی قسم کے نقش ونگار ہوں گے۔ اور ہوسکتا ہے کچھ گل بوٹے آپ کے چہرے پر بھی ہوں...... مگر یقین کیجیے آپ اس ملک میں میرے مہمان ہیں اور مہمانوں کی عزت کا خیال رکھنا ہماری روایات میں شامل ہے۔ اور یہ تو میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ کی عزت یا اَنا کو ذرا سی ٹھیس بھی لگے۔'' روانی میں بہت کچھ بول گئی تھی وہ اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''کیا ہوا......؟ میں نے کچھ غلط کہہ دیا یا پھر سے حیران کر دیا آپ کو؟''

''نہیں......'' وہ زیرلب مسکرایا۔

''آپ کے چہرے نے کچھ بھی غلط نہیں کہا اس وقت۔'' وہ کچھ کہنے والی تھی کہ بیرا ڈشز لاکر میز پر رکھنے لگا۔ تمام ڈشز پر نظر ڈالتے ہی وہ جان گئی کہ اُسے پاکستانی دیسی کھانے بہت پسند ہیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آئی ایم سوری لگتا ہے، شاید آپ کو میری چوائس اچھی نہیں لگی؟'' اُسے اس طرح دیکھتے پاکر وہ غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ لڑکی نے جان بوجھ کر برا سا منہ بنالیا۔

''دراصل باہر کے ملک میں پھیکے بے مزہ کھانے کھا کر زبان چٹخارے کی خواہش مند ہے۔ اس لیے یہ سب آرڈر کر دیا۔ آئی ہوپ یو ڈونٹ مائنڈ۔''

''ارے نہیں......'' وہ زیادہ دیر اس ایکٹ میں نہ رہ سکی۔

''میں تو یہ دیکھ رہی تھی کہ ہری مرچوں کی چٹنی اور اُچار نظر نہیں آ رہا۔'' نوجوان کا چہرہ کھل اٹھا۔ بیرے کو دونوں چیزوں کا آرڈر دے کر انہوں نے کھانا شروع کر دیا۔

''آنٹی گھر میں پاکستانی کھانے نہیں بناتیں؟''

''یہی تو مسئلہ ہے...... گھر میں کھانے کا ٹائم کس کو ملتا ہے...... اور بھوک کا میں بہت کچا ہوں...... زیادہ دیر برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے گھر آکر کھانے کی بجائے وہیں کھالیتا ہوں...... ہاں...... البتہ میرے چھوٹے بہن بھائی امی کے کھانے کا خوب مزہ لیتے ہیں۔ بہن بھائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اُس کے لہجے میں بہت محبت تھی۔

''بہت محبت کرتے ہیں آپ اپنے بہن بھائیوں سے؟''

''بہت زیادہ...... ہمارے گھر کی رونق ہیں دونوں...... مگر آپ تو شاید ایسی محبت کو نہیں جان سکتیں...... اکلوتی جو ہیں۔''

''ہوں......'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔

''پر اکلوتے ہونے کا بھی اپنا چارم ہے ماں باپ کی ساری محبت آپ کے حصے میں آتی ہے...... کوئی اور اُسے تقسیم نہیں کرسکتا۔''

''یہاں میں آپ سے ایگری نہیں کروں گا...... معذرت خواہ ہوں......'' وہ بریانی سے انصاف کرتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔

''میرا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ اور یہ صرف میرا نہیں دنیا کے کئی لوگوں کا خیال ہے کہ لوگ زیادہ ہو جائیں تو محبت تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ملٹی پلائی ہو جاتی ہے۔ کیا خیال ہے؟''

اُس کے اتنے اچھے فلسفے پر اس نے حیران

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہوکر اُسے دیکھا تو نوجوان نے قہقہہ لگایا۔

''گویا یہ طے ہوگیا کہ کبھی کبھی آپ بھی حیران ہوسکتی ہیں؟'' وہ بے ساختہ مسکرائی۔

''اور پتہ ہے آپ کو میں بھی اِسی بات پر حیران ہورہی ہوں۔ جس پر تھوڑی دیر پہلے آپ حیران تھے۔''

''یعنی؟''

''مغرب میں رہتے ہوئے اتنے مشرقی خیالات رکھتے ہیں۔ اتنے فیملی اوریٹنڈ ہیں آپ......'' اُس کی آنکھوں میں پھر محبت کی چمک پیدا ہوئی۔

''ہمارے ڈیڈی اور امی نے ہماری تربیت اسی انداز میں کی ہے......اور میری خواہش ہے کہ ہمارے گھر میں جو لڑکی آئے، وہ اس روایت کو برقرار رکھے۔''

''کیا آپ کے گھر میں کوئی لڑکی آنے والی ہے۔'' وہ جان بوجھ کر اُسے روکتے ہوئے شرارت سے بولی تو وہ بہت محظوظ ہوا......مگر وہ بھی کم تو نہیں تھا۔

''ہاں......میری شادی ایک لڑکی سے ہی ہوگی۔ اور ظاہر ہے میں تو یہاں اپنے ڈیڈی اور آپ کے پاپا کی ملی بھگت سے بیٹھا ہوں تو یہی سوچ کر بیٹھا ہوں اور آپ کو دیکھ کر یہی اندازہ ہورہا ہے کہ میری خواہشات ضرور پوری ہوں گی۔'' اُس نے بہت غور سے لڑکی کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ کھانے کو بھول کر جیسے پتھر کا بت بن گئی۔ بے حس وحرکت جیتی جاگتی گڑیا کی طرح جو حرکت کرنا بھول گئی ہو یا پھر اُس کی چابی ختم ہوگئی ہو لیکن اُس کی نظریں مضطرب اور بے چین نوجوان کے چہرے پر جمی تھیں۔

''ہیلو......'' جب کتنی دیر اسی طرح گزر گئی تو نوجوان نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''کمال ہے آج سے پہلے تو کسی نے مجھے یہ احساس نہیں دلایا کہ میں اتنا ہینڈسم ہوں کہ خوبصورت لڑکیوں کی نظریں مجھ پر جم کر رہ جائیں۔ وہ ایک دم ہوش کی دنیا میں آگئی اور زبردستی مسکرائی۔

جانے کیوں نوجوان کو محسوس ہوا کہ اُس کا وہ خوبصورت گلابی رنگ پھیکا پڑگیا ہو...... اور آنکھیں ذرا سی نم ہوں......ایسے جیسے گھٹا چھانے کو ہو۔

''نہیں......ایسی بات نہیں ہے۔'' اُس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی پوری توجہ پلیٹ کی طرف مبذول کی اور پھر براہِ راست اُسے دیکھا۔

''کیا آپ میرے لیے ایک اور سوفٹ ڈرنک آرڈر کرسکتے ہیں۔''

''کیوں نہیں......؟'' نوجوان کو محسوس ہوا کہ پہلے بھی وہ اپنا ڈرنک ایک ہی سانس میں ختم کرگئی تھی۔

''لگتا ہے......آپ کو بھوک سے زیادہ پیاس لگی ہے۔''

''ہاں......اچانک بڑھ گئی ہے پیاس......'' وہ جیسے زیرلب بولی۔

''اچھا یہ بتائیں آپ کی ہابیز کیا ہیں؟'' لڑکی نے ابھی ابھی آئے ڈرنک کو بھی آدھے سے زیادہ ایک ہی سانس میں ختم کرڈالا تھا۔

''میری ہابیز کچھ اتنی خاص نہیں ہیں۔''

''ہابیز ہمیشہ خاص ہی ہوتی ہیں......کیونکہ وہ آپ کے دل سے منسلک ہوتی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ تو وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔

''مجھے پڑھائی سے بے حد دلچسپی ہے...... ناول اور ہر قسم کی کتابیں پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ ان فیکٹ میں نے بے شمار ناولز پڑھ رکھے ہیں...... مجھے شاعری بھی بے حد پسند ہیں...... اچھے اچھے شاعروں کے بہترین شعر مجھے ازبر ہیں...... سیر و سیاحت سے دلچسپی ہے۔ پھول مجھے بہت پسند ہیں میرا دل چاہتا ہے میرا کمرہ ہر قسم اور ہر رنگ کے پھولوں سے مہکتا رہے۔''

''تو یہ کون سی مشکل بات ہے...... آپ کا گارڈن تو ہر قسم اور ہر رنگ کے پھولوں سے مزین ہوگا...... اور آپ کے ملازمین آپ کے کمرے میں پھول پہنچاتے رہتے ہوں گے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے لیکن یہ آپ کی زیادتی ہے کہ سب باتیں میرے متعلق ہوتی رہیں اور اپنے بارے میں آپ کچھ نہ بتائیں۔''

''تو پوچھیے......'' وہ دلچسپی سے مسکرایا۔

''کیا جاننا چاہتی ہیں آپ؟''

''آپ کی ہابیز کیا ہیں؟'' وہ دھیرے سے مسکرایا تو وہ بولی۔

''فارغ وقت ملے تو آپ کیسے گزارتے ہیں یا کیسے گزارنا پسند کرتے ہیں؟''

''فارغ وقت ملتا کب ہے اس خاکسار کو......'' وہ شوخی سے بولا۔

''اور جب بھی ایسا وقت نصیب میں لکھا ہو تو ڈھیر سارا سونا...... خوب دیر تک سونا میرا مشغلہ ہے۔''

''تو گویا بہت پوتی ہیں آپ؟'' وہ چپ رہا تو وہ فوراً معذرت کرنے لگی۔

''سوری مذاق کر رہی تھی...... برا مت مانیے گا۔ شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی میں کام...... اور صرف کام ہے...... مجھے یہ تو پتہ ہے کہ امریکہ میں ڈیوٹیاں بہت سخت ہوتی ہیں۔ سہولتیں زیادہ ملتی ہیں تو کام بھی زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب آپ شادی کریں گے تو بے چاری بیوی کے لیے تو وقت ہی نہ ہوگا آپ کے پاس وہ تو قیدِ تنہائی کا شکار رہے گی۔ آپ کا انتظار ہی کرتی رہے گی۔ یہ تو کسی طرح بھی فیئر نہیں ہے۔''

نوجوان جو اُس وقت سے اُسے گفتگو کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا اُس کی ہر جنبش ہر حرکت ہر انداز نوٹ کر رہا تھا اب بھی خاموش ہی رہا۔ لڑکی کچھ نروس ہوگئی۔

''اچھا آخری سوال...... آپ کو اپنے لیے کس قسم کی لڑکی پسند ہے؟'' سوال کرتے ہی لڑکی کو احساس ہوگیا کہ اُسے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نوجوان کے لب مسکرا اُٹھے۔

''مجھے یہ ملاقات ہمیشہ یاد رہے گی...... آپ کے والدین نے آپ کی بہت اچھی پرورش کی ہے...... انہیں میری طرف سے مبارکباد دیجیے گا...... اور رہا آپ کا سوال کہ کس قسم کی لڑکی پسند ہے مجھے، تو اس کا جواب ضرور دوں گا آپ کو...... لیکن ابھی نہیں...... پھر کبھی...... پھر کسی دن......''

نوجوان نے اپنی جیب سے ایک مخملیں ڈبیا نکالی...... چند لمحے بہت غور سے بہت پیار سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''یہ امی نے آپ کے لیے تحفہ بھیجا ہے...... بہت شوق سے خریدا تھا انہوں نے......'' لڑکی ذرا گھبرائی۔

''مگر...... مگر یہ کیسے لے سکتی ہوں میں؟ یہ نہیں ہوسکتا...... یہ میں نہیں لے سکتی۔'' نوجوان نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

''میری امی کا دل توڑ دیں گی آپ...... آپ شاید غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہیں یہ انگیجمنٹ رنگ

نہیں ہے، پلیز قبول کریں ...... پلیز ......'' نوجوان کا ہاتھ اسی طرح اُس کی طرف بڑھا ہوا تھا اور اُس پر ڈبیا رکھی تھی۔ لڑکی گھبراہٹ کا شکار ہونے لگی۔

'' پلیز ......'' اس بار نوجوان کی آواز میں جانے کیا تھا کہ وہ انکار نہ کرسکی اور آہستہ آہستہ ہاتھ آگے بڑھا کر ڈبیہ پکڑ لی۔

'' تھینکس ......'' نوجوان کا چہرہ چمکنے لگا۔

'' کھول کر نہیں دیکھیں گی؟'' لڑکی نے آہستہ آہستہ ٹرانس کی حالت میں ڈبیہ کھولی ...... نہایت خوبصورت انگوٹھی تھی بڑا سا سیفائر جگمگا رہا تھا۔ وہ مبہوت دیکھتی رہی۔

'' اگر آپ اجازت دیں تو پہنا دوں۔''

'' کیا مطلب؟'' اُس نے حیران آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

'' میں نے کہا نا یہ انگیجمنٹ رنگ نہیں ہے، بس ہماری ملاقات کی نشانی ہے اور میں یہ خوشی ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں کہ اسے میں نے خود ان ہاتھوں میں پہنایا ہے۔'' پھر اُس نے خود ہی اُس کا ہاتھ تھاما۔ انگلی میں انگوٹھی پہنائی۔ چند لمحے اُسے اپنے ہاتھ میں تھام کر دیکھتا رہا۔ پھر واپس اُس کی گود میں رکھ دیا اور بولا۔

'' اب آپ یہ بتائیں آپ ڈزرٹ میں کیا لینا پسند کریں گی؟'' لڑکی نے گم سم انداز میں اُسے دیکھا وہ اپنے ہوش میں کب تھی۔

☆......☆......☆

آج کھل کر دھوپ نکلی تھی۔ دن خوب روشن تھا لیکن دو ہزار گز پر محیط اُس عالیشان مینشن کے ایک کمرے کا ماحول ابھی تک خواب ناک تھا۔ چاروں طرف اونچی کھڑکیوں پر سرخ ویلوٹ کے بھاری پردے پڑے تھے جو سورج کی کرنوں کو اندر آنے سے روک رہے تھے۔ دیواروں پر قیمتی اعلیٰ مصوروں کی خوبصورت تصویریں سجی تھیں۔

کمرے کے چاروں کونوں میں امپورٹڈ قیمتی کانسی کے مجسمے پوری آن بان کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک طرف سرخ اور نارنجی پھولوں کے خوبصورت پرنٹ سے نیا صوفہ سیٹ تھا جس کے عین سامنے کافی ٹیبل تھی جس پر پھولوں کی انتہائی حسین ارینج منٹ تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی ملازمہ دبے پاؤں اُسے یہاں رکھ گئی تھی۔ کمرے کے وسط میں عالیشان کنگ سائز بیڈ تھا۔ جہاں جینا خوبصورت کمبل اور نرم نرم تکیوں میں سر دیے ابھی تک سو رہی تھی۔ جیسے کوئی بے حد خوبصورت اور من پسند خواب دیکھ رہی ہو۔ پورے کمرے میں ڈیپ ریڈ قالین بچھا تھا۔ اتنا دبیز کہ پاؤں رکھو تو اندر دھنس جائیں۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ جینا کی ملازمۂ خاص رانی دوبارہ دھیرے دھیرے دروازے پر دستک دے چکی تھی۔ مگر اپنی مالکن کے موڈ کے پیشِ نظر تیسری دفعہ دستک دینے کی جرأت نہ کرسکی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کے خیالوں میں جینا کی غصے سے انگارہ آنکھیں اور لبوں سے مغلظات کا طوفان نکلتا پوری شدت سے لہرایا تو اُس نے جھرجھری لی۔ صبح سے بڑی بیگم صاحبہ دوبار اُسے جگانے کا آرڈر دے چکی تھیں۔ جینا کا شاید ابھی اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لہٰذا وہ ملازمین کو ہدایات دے کر اپنے ذاتی کاموں کے سلسلے میں ڈرائیور کے ساتھ نکل گئیں۔ ابھی رانی بے چین انداز میں جینا کے دروازے کے باہر منڈلا رہی تھی کہ جینا کی بہترین سہیلی فضہ نمودار ہوئی۔ رانی نے سکون کی سانس لی۔

'' ابھی تک سو رہی ہیں شہزادی صاحبہ......''

اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''جی بی بی جی..... صبح سے دوبار بیگم صاحبہ انہیں جگانے کا حکم دے چکی ہیں۔ اور دوبار میں دروازہ کھٹکھٹا چکی ہوں..... وہ بے چارگی سے بولی۔
''چلو تمہاری ڈیوٹی تو ختم ہوئی۔ تم ایسا کرو کچن میں جاکر گگ سے شاندار سے ناشتے کا انتظام کرواؤ..... اور ساتھ میں خوب اسٹرانگ چائے یا کافی ہونی چاہیے۔''
''جی بیگم صاحبہ.....'' وہ خوش خوش چلی گئی تو فضہ اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں تقریباً اندھیرا تھا..... وہ چونکہ باہر سورج کی روشنی سے آئی تھی اس لیے چند لمحے کو کچھ نظر نہ آیا چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد اُس نے بھاری پردہ پیچھے ہٹایا تو جیسے روشنی کا سیلاب اندر آیا ہو۔
''اوہ گاڈ..... کون ہے یہ بدتمیز۔'' جینا کی آنکھوں کو روشنی ناگوار گزری تو وہ چیخ اٹھی فضہ آگے بڑھی اور بیڈ پر لیٹ گئی۔
''یہ بدتمیز تمہاری بیسٹ فرینڈ فضہ ہے..... اور شہزادی صاحبہ یہ کوئی وقت ہے سونے کا۔''
''تو اور سونے کا کون سا وقت ہوتا ہے۔'' اُس نے کمبل کھینچ کر دوبارہ اپنا منہ چھپانا چاہا..... کیونکہ اُسے چہرے کی مسکراہٹ کو چھپانا مشکل ہورہا تھا۔ فضہ نے دوبارہ کمبل کھینچ کر پرے کیا اور اس کے ساتھ لپٹ کر اُسے گدگدانے لگی۔ اور وہ مسکراہٹیں جنہیں وہ چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ خوشیوں سے بھرپور قہقہوں میں بدل گئیں۔ حتیٰ کہ اُس سے سانس لینا مشکل ہوگیا تب کہیں جاکر فضہ نے اُسے چھوڑا..... وہ اپنی رُکتی سانسوں کو بمشکل نارمل کرتی فضہ سے لپٹ گئی۔
''کیا بات ہے؟'' فضہ نے معنی خیز انداز میں اُسے دیکھا۔
''بڑی خوش لگ رہی ہو۔ کیا دنیا جہاں کی دولت مل گئی آج؟''
''دنیا جہاں کی دولت.....؟'' وہ لاپرواہی اورغرور سے بولی۔
''وہ تو پہلے ہی میرے پاس ہے۔''
''پھر کیا مل گیا..... جو چہرے پر اتنے گلاب کھلے ہیں؟''
''وہی جو نہیں تھا میرے پاس.....'' اُس نے بھرپور انگڑائی لے کر نشیلی آنکھوں سے فضہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ سرخ ریشم کے خوبصورت نازک لیس کی جھالروں سے سجے نائٹ سوٹ میں اُس کا جسم قیامت ڈھارہا تھا۔ وہ اچھل کر بیڈ سے اتری۔ اترنے سے پہلے فضہ کے منہ کو زور سے چوم لیا اور کارپٹ پر کھڑی ہوگئی۔ پھر جھومنے والے انداز میں پورے کمرے میں کسی گڑیا کی طرح رقص کرتے ہوئے گھوم کر واپس آئی اور دوبارہ دھم سے بیڈ پر فضہ کے قریب بیٹھ گئی۔
''اوہ فضی.....'' وہ پھر بے اختیار فضہ سے لپٹ گئی۔
''تمہیں کیا بتاؤں؟ کیسے بتاؤں؟'' فضہ نے انتہائی بے صبرے پن سے اُسے دیکھا۔
''اوہ پلیز..... پلیز پلیز..... جلدی بتاؤ نا..... میں تو مری جارہی ہوں ساری تفصیلات جاننے کے لیے ساری رات مشکل سے سوپائی ہوں۔ بس یوں سمجھو سوتے جاگتے کئی ساری رات..... بس تمہارا خیال ہی خوابوں خیالوں میں رہا..... پتہ نہیں کیا ہوا ہوگا..... جینا کی خواہش پوری ہوئی یا نہیں..... اُس نے جینا کی محبت کا انداز مثبت انداز میں دیا پھر اُس کا دل توڑ دیا۔''
''ہونہہ..... جینا نخوت سے اٹھی اور کھڑی

میں جا کھڑی ہوئی۔ فضہ بھی اُس کی تقلید میں پیچھے گئی۔ کسی میں اتنی ہمت، اتنی جرأت ہے فضی جو اس لڑکی کا دل توڑ سکے...... اُس نے اپنے نازک ہاتھ کے پالشڈ ناخن سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ اس لڑکی کا دل توڑنے سے پہلے ہزاروں بار سوچنا پڑتا ہے۔ وہ تو میرا دل ہی بری طرح دھڑک رہا تھا...... ورنہ مجھے یقین تو پورا تھا کہ وہ میرے سحر سے کبھی بچ ہی نہیں سکتا۔''

''پھر یہ ننھا سا دل کیوں بری طرح دھڑک رہا تھا؟'' فضہ پیار سے مسکرائی۔

''کیا کروں فضی...... اُس سے محبت جو اتنی کرتی ہوں...... اور جہاں بے پناہ محبت ہو وہاں وسوسے اور اندیشے بھی بہت ہوتے ہیں...... محبت انسان کو کتنا کمزور کر دیتی ہے اندر سے...... مجھے تو آج سے پہلے اندازہ نہیں ہوا۔''

''محبت انسان کو کمزور نہیں کرتی پگلی......'' فضہ نے اُس کی پیشانی سے بال ہٹا کر پیار سے اُسے دیکھا محبت تو انسان کو اندر سے مضبوط بناتی ہے۔ طاقت بخشتی ہے۔ جبھی تو اس دنیا اور اس سماج سے ٹکرانے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ جیسے کہ تمہیں اپنے ممی پاپا سے ٹکرانے کی ہمت کرنا ہوگی...... تم جانتی ہو نا؟''

''ارے تم فکر ہی نہ کرو...... پاپا تو ہمیشہ سے میری مٹھی میں ہیں...... بہت پیار کرتے ہیں مجھ سے...... میری کوئی بات نہیں ٹال سکتے اور رہیں ممی...... تو اُن کی مجھے کوئی فکر نہیں...... نہ میں نے پہلے کبھی اُن کی کوئی ناجائز بات مانی ہے اور نہ اب وہ میرے رشتے کی دیوار بن سکتی ہیں......'' جینا کی آنکھوں میں کیسا آہنی سا تاثر تھا۔ جیسے وہ ہر قسم کے طوفان سے نمٹنے کے لیے تیار ہو۔ ماحول کو سنجیدہ ہوتے دیکھ کر فضہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''ایک تو اس کم بخت...... بدذات رانی کو چین نہیں۔ ہمیشہ رنگ میں بھنگ ڈال دیتی ہے۔ مجھ سے لکھوا کر رکھ لو...... کسی دن میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گی۔''

''غصہ کیوں کرتی ہو...... بس یہی ایک خراب عادت ہے تم میں...... رانی کو میں نے ہی اچھے سے ناشتے کا آرڈر دیا تھا...... ہم دونوں کے لیے...... تم بس جلدی سے واش روم سے فارغ ہو کر آجاؤ تو خوب ڈٹ کر ناشتہ کرتے ہیں۔'' رانی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی کچھ ڈری ڈری اندر آئی۔

''رانی میں واش روم جا رہی ہوں...... میرے کپڑے نکال کر ڈریسنگ روم میں رکھ دو......'' رانی کو تحکمانہ انداز میں کہتی وہ اندر چلی گئی۔ رانی سرعت سے الماری کھول کر کپڑوں کا جائزہ لینے لگی اور پھر ایک خوبصورت گلابی لانگ اسکرٹ اور وائٹ بلاوز نکال کر ڈریسنگ روم میں رکھ دیا...... ساتھ میں پرس اور میچنگ جوتے بھی تھے۔

''بیگم صاحبہ کچھ اور چاہیے؟'' وہ مودب کھڑی تھی۔

''میرے لیے ایک کپ چائے بنا دو...... میں ناشتے سے پہلے چائے پیوں گی۔'' فضہ صوفے پر بیٹھ گئی اور میز سے ایک فیشن میگزین لے کر اُس کا مطالعہ کرنے لگی۔ رانی نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا تو اُسے جانے کا حکم مل گیا۔ جب تک فضہ کا کپ ختم ہوا جینا باہر آگئی۔ اگر سرخ سلیپنگ سوٹ میں وہ انگارے کی طرح دھک رہی تھی تو پنک اسکرٹ میں پُرسکون مہکی مہکی سرسراتی ہوا کی طرح تھی۔ وہ صوفے پر فضہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور خوشی اور جوش جذبات سے اُسے بھینچ لیا۔

''اوہ فضی میں اتنی خوش ہوں...... اتنی خوش

ہوں کہ تمہیں بتا نہیں سکتی۔''
''اچھا تو نہ بتاؤ......'' وہ مصنوعی مایوسی سے بولی۔
''ورنہ میں تو سب جاننے کی اُمیدیں لے کر آئی تھی۔''
''فضی کی بچی۔'' اُس نے زور سے اُسے چٹکی بھری۔
''اُف خدایا...... جینا میں مذاق کر رہی تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے میں یہاں جھک مارنے آئی ہوں۔ روزانہ تو کالج میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ اتنی بھی مری نہیں جا رہی تھی تمہارے لیے۔''
''اوکے...... اوکے...... اب یہ بتاؤ پہلے ناشتہ کرنا ہے...... یا پہلے ساری تفصیل......''
''نہیں یار پہلے ناشتہ کرتے ہیں...... مگر یہ رانی کہاں چلی گئی...... ناشتہ سرو کون کرے گا؟''
''اُسے میں نے ہی بھیجا ہے...... میں نہیں چاہتی وہ ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی سنے...... اور اتنی سستی بھی اچھی نہیں ہوتی جینا...... کبھی خود سے بھی ہاتھ ہلا لینا چاہیے۔''
''تو لیکچر فضی......'' اُس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا اور پھر دونوں ناشتے میں مشغول ہو گئیں اور جب رانی ٹرالی لے گئی تو دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔
''اب شروع ہو جاؤ۔ اور وعدہ کرو کوئی بات اپنی اس عزیز ترین فرینڈ سے نہیں چھپانی۔''
''اوکے یار...... یہ تو تمہیں پتہ ہے اُس نے مجھے ریسٹوران میں مدعو کیا تھا۔''
''کس نے؟'' فضہ شریر ہو رہی تھی۔
''اُسی ہینڈسم نے اور کس نے......'' جینا چڑ گئی۔
''اب تمہیں اُس کا نام بھی بھول گیا۔''
''میرے بھولنے سے کیا فرق پڑتا ہے یار...... اصل بات تو یہ ہے کہ تمہیں یہ نام نہ بھولتے پائے...... نہ نام اور نہ ہی نام والا......''
''کبھی ہو سکتا ہے بھلا یہ...... میں مر جاؤں گی پر اُسے نہیں بھولوں گی...... وہ تو میرے خون میں سرائیت کر چکا ہے۔'' کہتے ہوئے اُس کا چہرہ ایک لمحے کو گلابی ہوا...... پھر وہ سنجیدہ ہو گئی۔
''پھر...... پھر کیا ہوا؟'' فضہ بے تابی سے بولی۔
''میں جب وہاں پہنچی تو وہ پہلے سے موجود میرا انتظار کر رہا تھا...... میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا...... اور تمہیں شاید یقین نہ آئے میں تھوڑی سی خوفزدہ بھی تھی۔ لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا۔''
''اچھا کیا پہنا تھا تم نے؟''
''بڑا خوبصورت سا لانگ ڈریس تھا...... اور بہت سج رہا تھا مجھ پر۔''
''اور ہینڈسم نے کیا پہنا تھا؟''
''پینٹ شرٹ ہی پہنا تھا...... کوئی سوٹ پہن کر تو نہیں آنا تھا۔'' وہ چڑ گئی۔
''کیا مطلب تو سوٹ...... تو ٹائی؟'' فضہ حیران تھی۔
''نہیں وہ کہہ رہا تھا...... سفر میں وہ ہمیشہ ایزی کپڑے پہننا پسند کرتا ہے۔''
''اچھا پھر......؟'' فضہ ہمہ تن گوش تھی۔
''پھر اُس نے کھانا آرڈر کیا۔''
''کیا کیا آرڈر کیا؟''
''اب اتنی تفصیل میں، میں نہیں جا سکتی۔ کھانا تو کھانا ہوتا ہے...... اور کھانے کی طرف دھیان کس کا تھا میری نظریں تو بس اُس کے چہرے پر تھیں۔ ایک نوالہ منہ میں جاتا پانچ منٹ اُسے چباتے گزر جاتے۔''
''تو گویا تم صحت کے اصولوں کا بھرپور خیال

رکھ رہی تھیں...... کتنی مرتبہ چبایا تھا...... شاید بتیس مرتبہ چبانا چاہیے ہے نا۔'' وہ زبردستی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبانے کی کوشش کررہی تھی۔

''تم سننا چاہتی ہو یا نہیں؟'' جینا نے اُسے گھورا۔

''سوری......'' فضہ نے معصوم سی شکل بنائی۔

''ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے...... باتیں کرتے رہے۔''

''اچھا بس......'' فضہ نے ایکدم ہاتھ اٹھا کر اُسے روک دیا۔

''تم تو اصل بات پر کبھی پہنچوگی نہیں مجھے بس یہ بتاؤ اُس نے تمہیں پرپوز کیا یا نہیں۔''

جواب میں جینا نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ جس کی ایک انگلی میں بے انتہا خوبصورت انگوٹھی تھی جس میں ایک نفیس اور خوبصورت پتھر جگمگا رہا تھا۔ فضہ نے بے اختیار اُس کا ہاتھ تھام لیا...... اور رشک سے انگوٹھی دیکھنے لگی۔

''کتنی خوبصورت انگوٹھی ہے۔''

''ہے نا خوبصورت۔'' جینا کی آنکھیں جگمگ کررہی تھیں۔ چہرے پر بھرپور مسکراہٹ تھی۔

''اس نے خود اپنے مضبوط ہاتھوں سے یہ انگوٹھی میری انگلی میں پہنائی تو اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، چہرہ روشن تھا۔ اور میں...... میں اُس کے ہمراہ ساتویں آسمان پر کسی خوبصورت رنگین تتلی کی طرح اُڑ رہی تھی۔ اُس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا...... پتہ ہے میرا کیا دل چاہ رہا تھا؟''

''کیا؟''

''یہ وقت کبھی ختم نہ ہو...... ہم کبھی نہ بچھڑیں اسی طرح ایک دوسرے کی سنگت میں اڑتے رہیں۔ تمام عمر، ساری زندگی...... وہ جذب کے عالم میں بہتی فضہ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر جانے کس احساس کے تحت اُس کی نظر کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ اُس کا سارا جسم جیسے غصے سے تن گیا۔ وہ ایکدم اٹھی آہستہ آہستہ قدم رکھتی دروازے کی طرف گئی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ باہر رانی سہمی سہمی کھڑی تھی۔ جینا کو اس طرح دیکھ کر اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ جینا نے آگے بڑھ کر بھوکی شیرنی کی مانند اُس کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچے...... رانی کی چیخیں نکل گئیں۔

''الو کی پٹھی...... کمینی...... چھپ چھپ کر باتیں سنتی ہے ہماری۔'' اُس نے زور زور سے دو تین تھپڑ اُس کے گالوں پر کھینچ مارے۔

''پھر سب باتیں ممی کو سنا کر کان بھرتی ہے اُن کے...... میں بھی کہوں...... انہیں کیسے سب باتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ تو جاسوسی کرتی ہے میری۔ جینا کے ہاتھ پھر سے چلنے لگے۔ کبھی اُس کے بال کھینچتی اور کبھی زور سے تھپڑوں کی بارش کردیتی۔ فضہ حیرت سے اپنی جگہ ساکت و جامد یہ ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر تو ہلنے کی سکت ہی نہ رہی۔ یہ جینا تھی۔ تہذیب یافتہ، ہائی سوسائٹی کی پروردہ، سوفسٹی کیٹڈ جینا...... فضہ کو یہ تو علم تھا کہ جینا میں برداشت کی کمی ہے۔ اُسے فوراً غصہ آجاتا ہے اپنے سے کم حیثیت لوگوں کو اپنے مقصد کے بغیر منہ لگانا پسند نہیں کرتی۔ لیکن ایسی صورت حال میں جینا کو دیکھنا حیران کن تھا۔ یعنی جینا کے کردار میں اُس نے ایک اور خرابی کا اضافہ دیکھا تھا اور وہ تھا تشدد...... وہ بے انتہا غصے میں تشدد پر بھی اُتر سکتی تھی۔ رانی کی سسکیوں سے وہ ہوش کی دنیا میں آگئی اور جلدی سے اُن دونوں کی طرف بڑھی۔

''جینا کیا ہوگیا ہے تمہیں...... چھوڑ دو بیچاری کو...... دیکھو تو کیا حال کردیا ہے اُس کا؟'' فضہ نے

بڑی مشکل سے رانی کو اُس کے خونخوار پنجوں سے چھڑایا۔ جینا شاید خود بھی تھک گئی تھی فضہ کی مداخلت کو غنیمت جانا......

''تم نہیں جانتیں ان لوکلاس ملازموں کو...... یہ سب گھر کے ہر بھید کو جانتے ہیں او پھر موقع دیکھ کر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب کھڑی کیوں ہو...... دفع ہو جاؤ اپنی منحوس صورت لے کر......'' جینا ایک بار پھر چلائی تو رانی نے تھر تھر کانپتے ہوئے بتایا کہ بڑے صاحب اُسے بلا رہے ہیں۔

''ڈیڈی...... اس وقت؟'' وہ بے تحاشا حیران ہوگئی۔

''اس وقت تو وہ کبھی گھر نہیں آتے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''تم نے بے چاری کو موقع کہاں دیا ہے؟'' فضہ بہت آہستہ بولی۔

''آتے ہی تھپڑوں کی بارش شروع کردی۔ سارے بال کھینچ کے رکھ دیے۔''

جینا بھاگتی ہوئی باہر نکلی، فضہ بھی ساتھ تھی۔ ڈیڈی لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ دوڑ کر اُن سے لپٹ گئی۔

''ڈیڈی آپ اس وقت...... واٹ اے سرپرائز؟'' اُس کا لہجہ شہد سے بھی میٹھا تھا اور زبان میں پیار ہی پیار...... لگتا ہی نہیں تھا کہ چند لمحوں پہلے وہ رانی کی کیا درگت بنا کر آئی ہے۔

''میری پرنسس کیسی ہے؟''

''ایک دم فائن ڈیڈی......''

''اچھا ویری گڈ...... کل کی میٹنگ کیسی رہی؟''

''ایکسیلینٹ ڈیڈی۔''

''پہلے یہ بتاؤ...... ہماری بیٹی کو وہ نوجوان پسند آیا۔''

''بہت زیادہ ڈیڈی...... آئی تھنک ہی از اے ویری فائن جنٹلمین......''

''یہ بہت اچھی خبر ہے ہمارے لیے...... تم نے ممی کو بتایا' بائی دا وے کہاں ہے وہ؟''

''ڈیڈی وہ تو اپنے ہی کسی بزنس پر نکلی ہیں...... آئی ڈونٹ نو ویئر۔''

''اور فضا بیٹا کیسی ہیں آپ؟''

اسلم نے وہیں ٹرے میں تھوڑا سا کھانا اُن کے سامنے رکھ دیا تھا۔ ڈیڈی اصل میں بہت کم کھاتے تھے اور ان کی اچھی صحت اور فٹنس کا شاید یہی راز تھا۔

''ڈیڈی آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اس وقت تو آپ گھر نہیں آتے؟'' وہ صوفے کے ہتھے پر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''بیٹا اچانک ایک بزنس ٹرپ پر جانا پڑ گیا ہے۔ دو گھنٹے بعد فلائٹ ہے۔ بس پانچ منٹ بعد نکل جاؤں گا۔''

''اوہ تو ڈیڈی...... کدھر جا رہے ہیں آپ؟''

''آسٹریلیا؟''

''ڈیڈی...... کتنے دن کے لیے جا رہے ہیں آپ...... میں اُداس ہو جاؤں گی آپ کے بغیر پلیز ڈیڈی مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔''

''اوہ ڈارلنگ...... تمہاری کلاسز کا حرج ہوگا۔ ورنہ ضرور لے جاتا...... ایگزیمز کے بعد جہاں کا چاہے پروگرام بنالو...... چھٹیاں گزار لینا۔''

''وعدہ ڈیڈی۔''

''پکا وعدہ......'' انہوں نے اُس کے گال پر پیار کیا۔ فضہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اسلم نے بریف کیس اور بیگ اٹھایا۔ اور ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ اُدھر اُن کی گاڑی باہر نکلی اُدھر بیگم صاحبہ کی گاڑی اندر آئی۔ صاحب نے رُکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مگر ممی نے گاڑی سے اُتر کر جینا کی

طرف دیکھا۔

"یہ تمہارے ڈیڈی اس وقت گھر کیا کر رہے تھے؟" چونکہ فضہ جینا کے کمرے میں جا چکی تھی اس لیے جینا نے روڈلی اُن کی طرف دیکھا۔

"ڈیڈی بزنس ٹرپ پر آسٹریلیا جا رہے ہیں...... مجھ سے ملنے آئے تھے اور مجھے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے ہیں۔" وہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ جیسے یہ انتہائی غیر اہم بات ہو اُس رشتے کے لیے جسے ماں کہتے ہیں اور ممی منہ کھولے اُسے جاتا دیکھتی رہیں۔ پھر غم اور حسرت سے گیٹ کی طرف دیکھا اور چپکے سے ایک آنسو اُن کی آنکھوں سے نکل کر زمین پر گرا اور مٹی میں جذب ہو گیا۔

اندر جینا کے کمرے میں فضہ اور جینا دوبارہ راز و نیاز میں مشغول تھیں۔ جینا یوں خوش اور مطمئن تھی جیسے ابھی ابھی نہ تو اُس نے رانی کے ساتھ کچھ کیا ہو اور نہ ہی ممی کے ساتھ روڈلی بی ہیو کیا ہو...... اُس کی زبان پر تو اُسی ہینڈسم کے قصے تھے۔ اُس کی محبت تھی، اُس کا پروپوزل تھا اور اُس کے ساتھ مستقبل کے خواب تھے۔ اچانک فضہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اور وہ دوسرے قصے کا کیا بنا جینا......"

"وہ بھی ہینڈل کر لیا میں نے...... تم تو جانتی ہو فضی ڈیئر......" اُس نے چٹکی بجائی۔

"میں ہر مسئلہ یوں حل کر لیتی ہوں...... کوئی لوز اینڈ نہیں چھوڑتی...... اب دیکھا تم نے...... پاپا بھی مطمئن، ممی بھی پُرسکون اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو کسی اور ہی جہاں میں ہوں۔ پیار و محبت، عشق و عاشقی کے دامن میں گل و بلبل کے ہزاروں فسانے دل میں لیے۔" اُس نے بڑے جذب سے آنکھیں بند کیں اور مدہوش سی بستر پر گر گئی۔

☆......☆......☆

کالج میں بریک ٹائم تھا۔ اس لیے لڑکیاں مختلف ٹولیوں کی صورت میں جگہ جگہ بیٹھی کئی قسم کی عیاشیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ کچھ لڑکیاں کتابیں کھولے اگلے پیریڈ میں ہونے والے ٹیسٹ کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔ کئی لڑکیاں بڑے لان میں گھاس پر کینٹین سے خریدی ہوئی چیزوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ کھانے کے ساتھ باتیں بھی جاری تھیں۔ کیونکہ یہی ٹائم تھا کہ وہ بول کر خود کو ریلیکس کر سکتی تھیں۔ ورنہ اگلے دو پیریڈز میں سر عثمانی کی کلاس میں تو زبان بندی کا دستور تھا۔ کئی لڑکیاں بینچ پر اکیلی ہی کتاب لیے بیٹھی تھیں۔

لان کے ایک طرف جینا کا گروپ تھا۔ جس میں اُس کی بیسٹ فرینڈ فضہ کے علاوہ صوفیہ، آسیہ رانیہ اور ٹینا بھی تھیں۔ اُن کے سامنے کینٹین سے خریدے گئے کافی لوازمات تھے جن سے پیٹ پوجا ہو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ سب سے زیادہ جینا چہک رہی تھی۔ خوشی اُس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ارے یہ زارا اکیلی اُس بینچ پر کیا کر رہی ہے؟" سب نے اُس سمت دیکھا جہاں آسیہ نے اشارہ کیا تھا۔ واقعی وہ تنہا ایک بینچ پر بیٹھی تھی اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پیپر پلیٹ میں سموسہ تھا۔ جسے آہستہ آہستہ کھاتے ہوئے وہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ جینا ایکدم کھڑی ہو گئی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ تیز قدموں سے اُس کی طرف بڑھی۔

"اے فضہ...... ایک بات تو بتاؤ۔" آسیہ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں پوچھو......" فضہ نے چپس کھاتے ہوئے اُسے دیکھا۔

"جینا بڑی خوش نظر آ رہی ہے آج...... جب سے کالج آئی ہے خوب چہک رہی ہے۔ آخر یہ کیا

راز ہے...... کوئی بات ہے کیا؟''
''میں نے بھی محسوس کیا ہے اُس کے لبوں سے ہنسی پھوٹی پڑ رہی ہے۔ آنکھیں بھی مسکرا رہی ہیں۔'' رانیہ نے کہا تو ٹینا بھی پیچھے نہ رہ سکی۔
''اور چال تو دیکھو آج اُس کی...... کیسی بدلی بدلی نظر آ رہی ہے کچھ تو ہے۔ بد۔ لے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔'' آسیہ جس کی آواز بہت اچھی تھی اور وہ گانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ لہک لہک کر گانے لگی۔ فضہ نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور جینا کی طرف دیکھا جو زارا سے گفتگو میں مصروف تھی۔
''خدا کے لیے اگلا مصرعہ نہ گا دینا۔ اُس نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔''
''ویسے اگلا مصرعہ یہی ہے نا...... گھر کی بربادی کے آثار نظر آتے ہیں۔'' ٹینا جو تھوڑی تھوڑی عقل سے پیدل تھی کہے بنا نہ رہ سکی۔ فضہ نے گھور کر اُسے دیکھا تو رانیہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔
''کچھ تو ہے......''
''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔'' آسیہ پھر سے بہکنے لگی۔ تو فضہ نے کمر سے اُسے ٹھوکا دیا اور زارا اور جینا کی طرف اشارہ کیا وہ دونوں اِدھر ہی آ رہی تھیں۔
زارا کچھ چپ چپ...... کچھ خاموش سی تھی۔
''اے زارا......'' آسیہ نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا اور شوخی سے مسکرائی۔
''چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے''
''پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے''
زارا کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جینا نے غصے سے آسیہ کی طرف دیکھا۔
''تمہیں تو کوئی بولنے کا موقع دے آسیہ...... پھر یہ زبان رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔''
''تو زبان بولنے کے لیے ہی تو ہوتی ہے۔'' آسیہ آج موڈ میں تھی۔
''تم اپنی کہو...... آج بڑی خوش نظر آ رہی ہو...... اتنی خوش کہ یہ چال بھی بدلی بدلی سی ہے...... پاؤں رکھتی کہیں ہو اور پڑتے کہیں اور ہیں...... کیا کوئی خزانہ مل گیا...... کوئی دل والا...... جانِ تمنا...... جانِ جگر......'' اُس نے شرارت سے اُسے آنکھ ماری تو جینا نے غرور سے گردن اوپر کر کے اُسے دیکھا۔
''تمہاری ساری باتیں درست ہیں کنیز...... ہمیں ایک ایسا شہزادہ مل گیا ہے جس نے ہمارا یہ قیمتی دل ہم سے چرا لیا ہے۔''
''ہائے ہائے چور کہیں کا......'' ٹینا نے گھبرانے کی ایکٹنگ کی تو فضہ نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔
''ہمیں تو اس چوری پر اعتراض نہیں ہے...... تم کیوں فکر میں دبلی ہو رہی ہو ٹینا...... ہم نے تو ویسے ہی اپنا دل سرِ راہ اُس کے رستے میں رکھ دیا تھا کہ شاید اُس کی نظر پڑ جائے۔ اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اُس کی نظر پڑ گئی۔ اُس نے اٹھایا اور بڑے پیار سے اپنی جیب میں ڈال لیا۔''
''ارے جیب میں تو تصویر ڈالتے ہیں۔'' ٹینا کنفیوز ہو گئی۔ پھر گڑبڑا کر بولی۔
''کوئی تصویر ہے اُس کی تمہارے پاس؟''
''ہاں...... ہے تو......'' وہ بڑے انداز میں مسکرائی۔
''مگر ہمارے دل میں ہے...... تم دیکھ نہ سکو گی۔''
''زارا تم اتنی خاموش کیوں ہو یار...... ٹیسٹ سے ڈر لگ رہا ہے۔'' فضہ نے غور سے اُس کے کملائے ہوئے خاموش چہرے کی طرف دیکھا۔
''تم ٹھیک سمجھیں......'' وہ دھیرے سے بولی۔

"رات تیاری نہیں کر سکی...... عجیب بے چینی اور بے کلی تھی طبیعت میں...... نہ سو سکی اور نہ ہی ٹیسٹ کی تیاری کر سکی...... آج سر مایوس ہوں گے۔ اوہ کتنے مایوس ہوں گے سر۔" اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

"ارے گولی مارو سر کو اور فضول ٹیسٹ کو......" جینا نے لاپرواہی سے کہا۔

"میں تو آج کلاس میں جانے کا ارادہ ہی نہیں رکھتی۔ میں نے تو نوٹس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ سوچ رہی ہوں باقی کلاسز جائیں بھاڑ میں...... میں تو گھر جا رہی ہوں...... کیوں فضہ...... چلتی ہو میرے ساتھ...... کچھ دیر گپیں ماریں گے...... کھانا کھائیں گے اور پھر تم اپنے گھر کی راہ لینا اور میں سوؤں گی۔ خوب سوؤں گی۔" اُس نے کسی خوش کن خیال کے تحت آنکھیں بند کر کے کہا۔ فضہ اور جینا دونوں اٹھیں اور گیٹ کی طرف چل دیں۔

"آج کل تم بہت زیادہ سونے لگی ہو۔" فضہ بولی۔

"ہاں...... اُس نے خوابوں میں جو آنا ہوتا ہے۔" وہ آنکھوں میں نشے کی کیفیت لیے مسکرائی۔

وہ ابھی گیٹ تک نہیں پہنچی تھیں کہ گھنٹی بجی...... ایک ہلچل سی مچ گئی۔ لڑکیاں جلدی جلدی اپنی کتابیں اُٹھا کر کلاس رومز کی طرف بھاگیں۔ پیپر پلیٹس اور گلاس جاتے جاتے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ چند سست لڑکیاں گلاس اِدھر اُدھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ جو بعد میں ملازمین اٹھانے لگے جو صفائی کے ذمے دار تھے۔ گیٹ سے بغیر کسی وجہ کے گزر جانا آسان نہیں تھا۔ لیکن جینا ان معاملات میں ماہر تھی۔ اُن دونوں کے ڈرائیورز گاڑیوں سمیت باہر کھڑے تھے۔ جینا نے گیٹ سے ذرا فاصلے پر دو ملازمین کا آپس میں جھگڑا کروا دیا۔ اونگھتا ہوا چوکیدار چونک کر اُدھر آیا اور معاملہ رفع دفع کروانے لگا تو وہ چپکے سے باہر نکل گئیں۔ فضہ نے اپنے ڈرائیور کو گھر بھیج دیا۔ واپسی پر اپنے پک کرنے کا ٹائم بتایا اور جینا کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ فضہ بھی اچھے ویل آف خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن جینا کے والد جواد خاقانی کا شمار شہر کے امیر ترین خاندانوں میں ہوتا تھا۔ ایک تو وہ سافٹ ویئر انڈسٹری کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی منافع بخش سائیڈ بزنس بھی شروع کیے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اسٹاک ایکس چینج میں بھی بہت اہم اسٹاک ہولڈر تھے۔ وہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر تو پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اُن کا بچپن اُن کی امنگوں اور خواہشات کے مطابق نہیں تھا۔ لیکن اُن کے خیالات نہایت بلند اور ارادے بہت مضبوط تھے۔ وہ اس گاؤں کی سادی سی زندگی سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے والدین احمد خاقانی اور والدہ صفیہ بیگم بہت سادہ لوگ تھے۔ سادہ دل اور سادہ طبیعت' قناعت پسند بھی تھے۔ اپنی ضروریات سے زیادہ کی انہوں نے کبھی خواہش نہیں کی۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ جن سے انہیں اتنا کچھ مل جاتا کہ آرام سے گزارہ ہو جاتا۔ لیکن یہ تو اُن کے اختیار میں ہرگز نہیں تھا کہ وہ اولاد بھی اپنے جیسی ہی پیدا کرنے پر قادر ہوں۔ یہ اختیار تو ہمیشہ سے قادرِ مطلق کے پاس رہا ہے۔ جواد خاقان اپنے والدین کے برعکس قناعت کے نام سے آشنا نہیں تھے۔ بچپن تو جیسے گزرنا تھا گزر گیا لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد وہ حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ کرنا چاہتے ہی نہیں تھے۔ زبردستی ضد کر کے شہر گئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنی زندگی سنوارنا چاہتے تھے۔ اپنے ماں باپ کی طرح رہنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ انہیں تو زندگی کی ہر سہولت چاہیے تھی۔ ہر وہ چیز چاہیے تھی جو اُن کا ناطہ اعلیٰ سوسائٹی

کے ساتھ جوڑ سکے اور آہستہ آہستہ اُن کے یہ خواب پورے بھی ہو رہے تھے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں ایک فارن سافٹ ویئر کمپنی میں جاب مل گئی۔ انہوں نے دن رات محنت کی اور آگے ہی آگے بڑھتے گئے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اور ایک دن وہ بھی آیا جب وہ خود ایک کمپنی کے مالک بن گئے۔ لیکن اُن کے قدم وہاں بھی نہ ٹھہرے اور تب تک نہ ٹھہرے جب تک اُن کی کمپنی بہترین کمپنی کی سند حاصل کر کے سرفہرست نہ ہوگئی۔ ماں باپ بیٹے کی کامیابیوں سے بہت خوش تھے۔ آخر ماں باپ تھے اُن کو خدا نے دل ہی ایسا گداز دیا ہوتا ہے جو اولاد کی محبت سے دھڑکتا ہے۔ چاہے وہ زندگی میں فیل ہو جائے اور چاہے اُس کے قدم ستاروں کو چھوتے لگیں۔ جواد خاقانی چاہتے تھے اب اُن کے والدین گاؤں کی اس زندگی کو چھوڑ کر شہر میں اُن کے شاندار محل نما گھر میں جا کر رہیں۔ انہیں اعتراض بھی نہیں تھا یہ الگ بات تھی کہ پرکھوں کی اس زمین کو چھوڑتے ہوئے اُن کا دل ریزہ ریزہ ہوا تھا۔ لیکن اولاد کی خواہش ٹھکرا نہیں سکتے تھے۔ ایک ہی تو بیٹا دیا تھا خدا نے' اگر دو تین اولادیں ہوتیں تو ہمیشہ گاؤں میں رہتے اور کبھی کبھی جواد سے ملنے بھی چلے جاتے۔ اب بھی ایسا ہو سکتا تھا لیکن جواد خاقانی نے صاف کہہ دیا کہ اب وہ دوبارہ گاؤں نہیں آئیں گے کیونکہ' یہاں آتے ہوئے انہیں ہتک کا احساس ہوتا ہے۔ اگر اُن کے اعلیٰ طبقے کے جاننے والوں کو علم ہو گیا کہ اُن کی اصل کیا ہے تو وہ شرمندگی سے مر جائیں گے۔ ماں باپ صدمے سے بے حال ہو گئے بیٹے کے منہ سے اپنی قیمتی زمین اور آباؤ اجداد کے بارے میں ایسے خیال سن کر...... لیکن دل تو اللہ نے بڑا دیا ہوتا ہے والدین کو کہ ہر دکھ ہر غم اس میں جذب ہو جاتا ہے۔ وہ گاؤں سے ناطہ توڑنے پر راضی ہو گئے۔ مگر اُن کی ایک شرط تھی۔

''پہلے تابو سے شادی کر لو...... وہ تمہارے بچپن کی منگ ہے۔ تمہاری خالہ نے کب سے اُسے تیرے آسرے پر بٹھا رکھا ہے۔'' جواد بدک کر پیچھے ہٹے۔

''تابو...... وہ اَن پڑھ...... گنوار جسے بات کرنے کی تمیز نہیں...... وہ بھلا محفلوں میں میرے ساتھ کیسے جائے گی؟ میرے قدم سے قدم ملا کر کیسے چلے گی؟ یہ نہیں ہو سکتا۔'' اُن کا آہنی چہرہ دیکھ کر والدین حیرت زدہ رہ گئے۔

''مگر وہ تمہاری ٹھیکرے کی منگ ہے جوادے...... اگر تم اُس سے شادی نہیں کرو گے تو کوئی نہیں کرے گا۔ ساری عمر اسی طرح بیٹھی بوڑھی ہو جائے گی۔''

''تو میں کیا کروں...... میں نے اُس کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ دس جماعتیں پڑھی ہیں اُس نے لیکن دیکھو تو یوں لگتا ہے گدھے پر کتابیں لادی گئی ہیں۔ اماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو تہذیب یافتہ طریقے سے بولنا بھی نہیں آتا۔''

''کس طریقے سے؟'' ماں بھلا کیا سمجھتی۔

''اماں...... اُس کا لہجہ دیکھا ہے۔ بالکل پینڈو ہے۔ اُس کی ڈریسنگ دیکھی ہے۔ کپڑے تک پہننے کا سلیقہ نہیں ہے اُس میں...... کیا چیختے چلاتے رنگ پہنتی ہے۔ کیسے رنگ برنگے پراندے لٹکائے پھرتی ہے اور پھر وہ ہیل والی بدوضع جوتیاں...... کچھ بھی تو......''

''بیٹا...... اگر تم چاہو گے تو سیکھ لے گی سب کچھ...... عورت اپنے مرد کے لیے سو قربانیاں دیتی ہے تو کیا وہ نہیں دے گی؟ جیسا تو چاہے گا وہ ویسا ہی کرے گی۔ تو اُسے اپنے رنگ میں رنگ لینا اُس کے لیے گھر میں استانیاں بلوا لینا...... جس طرح تو

چاہے اُسے سدھا لینا اپنے مطابق۔‘‘

’’ہونہہ سدھا لینا...... جیسے وہ کوئی پالتو جانور ہے نا...... وہ دنیا جہاں کی تلخی اپنے لہجے میں سمو کر بولا۔ تو مہتاب عرف تابو جو دوسرے کمرے میں کھڑی ساری گفتگو سن رہی تھی۔ اُس کی انا کو سخت ٹھیس لگی۔ دل جو اُس کے نام پر پگھل کر موم ہو جاتا تھا ایک دم پتھر بن گیا۔ وہ سارے سنہرے روپہلے جذبات‘ ریشمی گلابی لچھوں کی طرح پھسلتے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ایسی بے عزتی‘ ایسی توہین......

’’اور کبھی غور سے دیکھا ہے آپ نے اُسے...... کبھی کوئی خوبی نظر آئی ہے اُس میں...... نہ کوئی گن اور نہ ہی...... نہ ہی...... وہ ایک لمحے کوڑکے...... موٹی بھینس جیسی...... نہ دماغ نہ عقل ایک کھونٹے سے باندھ دو اُسے تو یہ سمجھ نہ آئے کہ اُسے کتنا چارہ کھانا ہے...... اس سے تو بہتر ہے آپ بھوری کو اُس کے کھونٹے سے ہٹا کر تابو کو باندھ دیں۔ کوئی فرق نظر نہیں آئے گا آپ کو...... اور آپ کہتی ہیں میں اُس سے شادی کرلوں...... نو...... نیور...... امپاسبل

مہتاب نے بڑی مشکل سے کسی چیز کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ لیکن ڈوبتے دل اور بے جان ہوتے جسم نے مہلت نہ دی...... وہ دھم کرکے زمین پر آرہی۔ صفیہ بیگم چونک کر کسی انہونی کے احساس سے کانپ گئیں اور جلدی سے ساتھ والے کمرے میں گئیں۔ احمد خاقانی اور جواد بھی پیچھے آئے اور دھک سے رہ گئے۔ تو اُس نے سب سن لیا تھا۔ اور سہہ نہ سکی تھی۔

وار ہی ایسا کاری تھا کوئی بھی ہوتا ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا اور وہ تو مہتاب جس نے ہوش سنبھالنے کے بعد صرف اور صرف جواد کے خواب دیکھے تھے۔ ایک تو وہ جانتی تھی کہ وہ اُس سے منسوب ہے اور اگر نہ بھی ہوتی تو شادی دل بس اُسی کے نام پر دھڑکتا۔ اُسی کی مالا جپتا‘ عمر کے ساتھ ساتھ اُس نے اُسے اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ اور یہ خیال کہ وہ ایک دن اُس کی ہونے والی ہے۔ ساری عمر اُس کی سنگت میں گزارنے والی ہے۔ اُس کے دل کو ہر وقت خوشی کے احساس سے بھرے رکھتا۔ سہیلیاں اُس کا نام لے کر چھیڑتیں تو وہ گلابی ہو جاتی۔ خالہ کبھی اُس کا ذکر کرتیں تو یوں شرما جاتی جیسے کلیاں لجا گئی ہوں۔ بڑی بڑی آنکھیں (جنہیں جواد بیل کے دیدے کہتا تھا) بھرا بھرا گداز جسم (جسے اُس نے موٹی بھینس کہا تھا) اور دلکش ادائیں (جنہیں وہ پینڈوانہ حرکتیں کہتا تھا) وہ بہت خوبصورت نہ ہی لیکن قبول صورت تھی۔ اُس کے لیے جان قربان کر دیتی جیسا وہ کہتا ویسا ہی روپ دھار لیتی۔ اُس کے قدموں میں جوگن بن کر ساری عمر بتا دیتی۔ لیکن یہ آج جو پگھلا سیسہ اُس نے ان کانوں میں انڈیلا تھا۔ وہ اذیت ناک حقیقت سے اس بے دردی سے روشناس ہوئی کہ دل سہہ نہ سکا۔

صفیہ بیگم نے جلدی سے گلاس میں پانی لے کر اُس کے منہ پر چھڑکا...... اُس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ سامنے وہی تھا۔ پہلی نظر اُس پر پڑی تو دل پر پھر گھونسہ پڑا۔ اُس نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں۔ اُسے دیکھنے کی تاب کہاں تھی۔ خواہش بھی نہ رہی تھی۔ اُس نے بے اختیار صفیہ بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

’’خالہ...... مجھے گھر چھوڑ دو۔‘‘

’تھوڑی دیر آرام کرلے میری جان...... پھر گھر ہی جانا ہے۔‘‘ خالہ کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔

’’نہیں خالہ...... ابھی...... اسی وقت...... وہ کوشش کر کے اٹھی خالہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور اُس کے قریب سے یوں گزر گئی جیسے وہ کچھ بھی نہ ہو۔ کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ اُس کی ذرا برابر اہمیت نہ

ہوا اُس کی زندگی میں۔

انتاز ہر اُس کے کانوں میں انڈیلنے کے باوجود وہ غصے سے بل کھا کر رہ گیا۔ جواد خاقانی نظر انداز کرنے والی شخصیت نہیں ہے، نہ کبھی تھا' یہ انتہا تھی اُس کے حد سے بڑھتے ہوئے غرور اور نخوت کی...... اُس معصوم لڑکی کی شخصیت کی ساری خامیاں سنگدلی سے گنوا دی تھی۔ مگر اُس کی لاتعلقی کی ایک نظر دل میں کینہ بھر رہی تھی۔ اُس سے بدلہ لینے پر اُکسا رہی تھی۔

صفیہ بیگم خاموش آزردہ اور دل گرفتہ واپس آئیں۔ کچھ کہنے کو رہ کیا گیا تھا۔ مگر احمد خاقانی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بردباری اور متانت سے بولے۔

''تم خود کو اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھتے ہو۔ اپنی شخصیت اور اپنی نوکری پر بڑا ناز ہے تمہیں۔ تم سمجھتے ہو تم اتنا کماتے ہو کہ تم اپنے ماں باپ تک کو خرید سکو۔ اپنی منگیتر کو دھتکار سکو۔ دنیا اس وقت تمہارے قدموں میں ہے۔ لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے جو باتیں تم کر رہے تھے اگر تمہیں یاد ہوں...... اور تم دوبارہ نہیں سن سکو تو یہ سوچو کہ جو زبان تم استعمال کر رہے تھے اور جو لفظ تمہارے منہ سے نکل رہے تھے۔ وہ کسی تعلیم یافتہ انسان کے نہیں بلکہ کسی اَن پڑھ جاہل اور گنوار شخص کے منہ سے ہی نکل سکتے ہیں۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تمہیں جنم دیا۔ تم اپنا غرور...... تکبر اور دولت اور وہ سب چیزیں جنہیں تم اس گاؤں کے مقابلے میں اچھا سمجھتے ہو لے کر یہاں سے اسی وقت چلے جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ نہیں جا رہے۔ ہم یہاں تابو کے ساتھ رہیں گے۔ کہ اب اُس نے تمہارے بغیر اکیلے زندگی گزارنی ہے۔ کوئی بھی کسی کی منگ سے شادی نہیں کرتا۔ ہمارے لیے وہ ہماری بہو ہے۔ یتیم بچی ہے...... ہمارے ساتھ رہے گی اپنی ماں کے ساتھ...... بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔

☆......☆......☆

جواد خاقانی نے مہتاب عرف تابو سے شادی کیوں کی۔ وہ صحیح وجہ کبھی نہ جان سکا۔ کبھی اُسے لگتا اُس نے اپنے روٹھے ماں باپ کو منانے کے لیے یہ شادی کی ہے۔ کبھی لگتا ہے اُن پر احسان جتانے کے لیے کی ہے کہ یہ اُس کی فطرت میں شامل تھا۔ کبھی لگتا اُس نے تابو پر رحم کھایا ہے۔ لیکن اس خیال کی وہ فوراً تردید کر دیتا۔ اُسے تابو پر کبھی رحم نہیں آ سکتا۔ شاید اُس نے تابو سے اُس لاتعلق نظر کا بدلہ لینے کے لیے شادی کی ہو کہ نظر انداز کیا جانا وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اور وہ بھی اتنی غیر معمولی ہستی سے جسے وہ کیڑے مکوڑوں سے بھی کم تر سمجھتا تھا۔ یا پھر ساری عمر اُسے تڑپانے کے لیے...... ہاں شاید یہی ٹھیک وجہ ہے۔ وہ اُسے تڑپانا چاہتا تھا۔ اور پھر جان بوجھ کر اُس پر سوکن لانا چاہتا تھا۔ تاکہ اگر کوئی کمی رہ جائے تو وہ بھی پوری ہو جائے۔ سہاگ رات آدھی سے زیادہ باہر گزارنے کے بعد وہ اندر آیا تو تابو بستر پر نہیں تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اُسے کھڑکی کے پاس کھڑے باہر چاند کو گھورتے پایا۔ سادہ کاٹن کے لباس میں...... میک اپ سے بے نیاز دھلا دھلایا چہرہ لیے۔ جس پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔

اُس کا خون کھول اٹھا۔ یہ درست تھا کہ وہ اُسے کوئی توجہ دینے والا نہیں تھا لیکن اُس کا تو فرض تھا کہ سہاگ کے جوڑے میں بیڈ پر بیٹھ کر اپنے مجازی خدا کا انتظار کرے خواہ ساری رات بیت جائے۔ مگر اُسے اس طرح دیکھ کر اُسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ جنگلی شیر کی طرح اُس کی طرف بڑھا اور سختی سے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس سے زیادہ سختی کے ساتھ اُس نے اپنا

بازو چھڑایا اور کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تابو پوری آنکھیں کھولے اُسے دیکھ رہی تھی اُن آنکھوں میں شرم وحیا نہیں تھی۔ طوفان تھا' نفرت تھی' اور جانے کیا کیا تھا۔

''مجھے ہاتھ مت لگانا۔'' اُس کی آواز میں پھنکار تھی۔

''کیوں؟'' وہ زہر آلود لہجے میں بولا۔

''میں کوئی سڑک پر چلتا لوفر نہیں ہوں۔ تمہارا شوہر ہوں اور اگر تمہیں ہاتھ لگاؤں گا تو اپنا حق وصول کروں گا۔ جائز حق......''

''ہونہہ...... جائز حق...... بس مردانگی کا مظاہرہ کرنا ہی آتا ہے۔ انسانیت' محبت' شرافت اِن چیزوں سے تو کوئی سروکار نہیں ہے آپ کو۔''

بات پوری کرنے سے پہلے ہی جواد کا تھپڑ اُس کے چہرے پر پڑا۔ اور زبان مغلظات بکنے لگی اور جب اُس کا خون غصے اور وحشت کا سارا زہر لیے جسم میں گردش کرنے لگا تو اُس نے اپنا حق بھی وصول کر ہی لیا...... تابو کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا...... اُس کی مردانگی کا مظاہرہ ختم ہوا تو وہ آرام سے اٹھی اور باتھ لے کر کپڑے چینج کیے۔ ان سب کاموں سے فارغ ہو کر باہر آئی تو وہ بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ غصے نفرت اور دیوانگی نے اُسے بے حال کر دیا تھا۔ اس کے قدم ٹھٹک کر اس کے پاس رُک گئے۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی مداخلت کسی پریشانی اور شرم و حیا کی اَن دیکھی دیوار کے بغیر اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے نظر بھر کر اُسے دیکھنے کی مہلت پہلے کبھی نہیں دی تھی۔ ابھی چند لمحے پہلے جنگلی شیر کی مانند نظر آنے والا چہرہ اس وقت کتنا معصوم لگ رہا تھا۔ کسی بچے کی طرح جو ضد کرتے کرتے تھک ہار کر نیند کی آغوش میں چلا گیا ہو۔ سارے نقوش ریلیکس ہو گئے تھے۔ چہرے پر زرا برابر ٹینشن نہیں تھی اور تابو کے قدم جیسے وہیں جم کر رہ گئے تھے۔ آج دل بھر کر اسے دیکھ لوں پھر جانے موقع ملے یا نہ ملے...... زندگی رہے یا نہ رہے۔

☆......☆......☆

زارا نے صفیہ بیگم کے کندھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھے اور اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔

''امی...... ریلیکس کریں پلیز...... اس طرح فکر مند ہو کر کیوں اپنا بلڈ پریشر بڑھاتی ہیں۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں۔ اِدھر آئیں اور اس کرسی پر بیٹھ جائیں۔ آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں نا۔ میں چائے بھی بنالوں گی اور شہریار کو قریبی دکان پر بھیج کر بسکٹ بھی منگوالوں گی' آپ بس فکر مند نہ ہوا کریں۔ آپ جانتی ہیں آپ پریشان ہوتی ہیں تو میں کتنی بے چین ہو جاتی ہوں۔''

زارا نے انہیں کرسی پر بٹھا کر جلدی سے چائے کا پانی رکھا اور ٹرے رکھ کر اُن میں برتن سیٹ کرنے لگی۔ پھر شہریار کو آواز دی۔ اُسے سو کا نوٹ تھمایا اور بسکٹ اور نمکو لانے کا کہہ کر پانی کی طرف متوجہ ہوئی۔

فرحت آراء نے پریشانی سے اُسے دیکھا۔

''تم ابھی کالج سے آئی ہو...... کھانا بھی نہیں کھایا۔ کپڑے بھی نہیں بدلے اور کاموں میں جھونک دیا تمہارے ابو نے' ذرا آرام کرنے کا موقع نہیں ملتا تمہیں...... اور تمہارے ابو انہیں تو بالکل خیال نہیں گھر کا بجٹ کس طرح چل رہا ہے۔ اُسی پرانی نوابی شان میں گم رہتے ہیں جو تمہارے دادا کے وقت میں بھی نہیں رہی تھی اور اوپر سے اُن کی یہ موئی شاعری اس نے تو عاجز کر کے رکھ دیا ہے مجھے...... روزانہ اُن کے فارغ اور نکمے دوست آجاتے ہیں۔ محفلیں جمتی ہیں' چائے کے دور چلتے ہیں۔ شعر و شاعری پر بحث ہوتی ہے اور......''

''تو پھر کیا ہوا امی...... اس میں حرج ہی کیا

ہے۔ ابو کا دل بھی لگا رہتا ہے اور ان کی ادبی طبیعت کو تسکین بھی ہو جاتی ہے۔

''لیکن ہمارے بجٹ پر جو بوجھ پڑتا ہے۔ وہ کون پورا کرے گا۔ کما کر تو وہی لاتے ہیں نا گا بندھا جو مہینے کے شروع میں میرے حوالے کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قارون کا خزانہ دے دیا۔ جتنی مرضی مہمان نوازیاں کریں گے ختم نہیں ہوگا۔ مگر مجھے تو پورا مہینہ چلانا پڑتا ہے۔'' صفیہ بیگم آزردہ سی کرسی پر بیٹھی اپنی پیاری ہونہار اور عقل مند بیٹی کو دیکھ رہی تھیں چائے کو دم لگ چکا تھا۔ شہریار بھی چیزیں لے آیا تو اُس نے ٹرے سجا کر اُس کے ہاتھ ڈرائنگ روم میں بھجوا دی۔

''کچھ بھی ہو امی...... آپ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں غصہ کرتے ہوئے اپنی اس اولاد کی طرف دیکھ لیا کریں جو آپ سے بے پناہ پیار کرتی ہے اور اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا...... کبھی سوچا آپ نے؟'' زارا نے محبت سے ماں کے گلے میں بازو حمائل کر دیے اور اُن کی پیشانی چوم لی۔ صفیہ بیگم کے دل کو بے پناہ تسکین ملی، روح کو سکون آ گیا۔

''سارا کہاں ہے امی...... آ گئی نا اسکول سے۔''

''ہاں کھانا کھا کر سو گئی ہے۔ کہہ رہی تھی کل ٹیسٹ ہے تیاری کرنی ہے۔ دو گھنٹے بعد اٹھا دینا۔''

''تم جلدی سے کپڑے بدل کر اور منہ دھو کر آ جاؤ...... میں کھانا نکالتی ہوں اُتنی دیر میں......''

''امی بھوک نہیں ہے۔ کالج میں سموسہ کھا لیا تھا۔''

''ایک سموسہ سے کیا ہوتا ہے۔ تمہاری صحت کے بارے میں بالکل کوئی کمپرومائز نہیں ہوگا سمجھی تم...... بس فوراً جاؤ اور فوراً سے پہلے واپس آؤ۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے امی......'' زارا شوخی سے بولی۔

''اگر فوراً سے پہلے واپس آنا ہے تو پھر فوراً کیسے جاؤں؟''

''شریر لڑکی...... مجھے باتوں میں مت اڑاؤ...... اور جلدی جاؤ۔'' کھانے کے بعد زارا امی کے ساتھ ہی اُن کے کمرے میں آ گئی اور اُن کے ساتھ لپٹ کر لیٹ گئی۔

''امی...... میں نے ایک بات سوچی ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو......''

''پگلی...... تمہاری بات کا برا کیوں مانوں گی...... تم نے ہمیشہ سمجھ کی بات کی ہے۔''

''میں چاہتی ہوں آپ گھر کا بجٹ میرے ہاتھ میں دے دیں۔'' صفیہ بیگم نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''تمہیں اپنی ماں کی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں رہا؟''

''بخدا یہ بات ہرگز نہیں ہے امی......'' وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپ اتنی عقل مند ہیں آپ نے ہمیشہ ایک ایک پیسہ سمجھداری سے خرچ کیا ہے اور اتنی تنگی میں بھی ہماری ضروریات کو پورا کیا ہے میں آپ کی صلاحیتوں پر شک کیسے کر سکتی ہوں؟''

''تو پھر ایسی بات کیوں کی تم نے؟''

''امی پلیز آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' اُس نے محبت سے ماں کی طرف دیکھا۔

''یہ سب میں آپ کی صحت کی وجہ سے کہہ رہی ہوں آپ ٹینشن بہت لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے۔'' وہ معصومیت بھری مسکراہٹ سے بولی۔

''میں اپنی صلاحیتیں بھی آزمانا چاہتی ہوں......

میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ ہر امتحان میں ٹاپ کرنے کے بعد میں عملی زندگی میں کتنے پانی میں ہوں...... ہاں اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں تو......" وہ کہہ کر خاموش ہوگئی اور شرارت سے صفیہ بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی چالاکی سمجھ کر مسکرائیں۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... یوں بھی آخر اگلے گھر جانا ہے تمہیں...... گھر کو مینج کرنے کا تجربہ بھی حاصل کرلو تو اچھی بات ہے...... مجھے آخر اس بات کا خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟"

"امی......" زارا نے اُن کے سینے میں منہ چھپالیا...... صفیہ بیگم نے بڑی محبت اور بڑے پیار سے اُسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ کسی قیمتی متاع کی طرح...... اور سر پر بوسہ دیا۔

"امی...... نانو سے ملے زیادہ دن نہیں ہوگئے۔" وہ اسی طرح ماں کے سینے سے لگے لگے بولی تو انہوں نے بازو اُس کے گرد سے ہٹا کر باہر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

"ہاں...... کافی دیر ہوگئی جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کتنی بار سوچا جا کر مل آؤں۔ لیکن گھر کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر بے بس ہوگئی۔" انہوں نے ایک آہ بھری۔

"کون سوچ سکتا ہے کہ جن ماں باپ نے پیدا کیا۔ ساری زندگی پال پوس کر بڑا کیا۔ اُن سے یوں جدا ہونا پڑے گا کہ پھر اتنا طویل عرصہ اُن کے بغیر گزارنا عجیب نہیں لگے گا۔ کبھی اسی طرح تم دونوں بھی چلی جاؤ گی اپنے اپنے گھروں میں اور پھر کب یہ پیاری صورتیں دیکھنے کو ملیں...... خدا ہی جانے۔"

"تو امی پھر طے ہے نا کہ اگلے ماہ کا بجٹ میں چلاؤں گی؟"

"بالکل......"

"اور آپ حساب کتاب نہیں مانگیں گی، کوئی آڈٹ نہیں ہوگا۔" وہ ماں کا دھیان بٹانا چاہتی تھی اور اُس میں کامیاب رہی۔

"اور امی میں نے تو سوچ لیا ہے۔ امتحانوں کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم نانو کے گاؤں جارہے ہیں چھٹیاں وہیں گزاریں گے۔ کھیتوں سے سبزیاں توڑیں گے۔ دریا کے کنارے پکنک منائیں گے، کتنا مزہ آئے گا نا...... شہریار تو خوب انجوائے کرے گا۔"

"اور تمہارے ابو کو کون راضی کرے گا۔ اپنے مشاعرے اور دوستوں کو کیسے چھوڑیں گے؟"

"مابدولت راضی کریں گے امی...... آپ تو جانتی ہیں میں اُن کی سب سے لاڈلی بیٹی ہوں۔" زارا کے چہرے پر محبت کی چمک تھی۔ وہ بیڈ سے نیچے اتری اور چپل پاؤں میں پھنسائے۔

"اب آپ آرام کریں امی...... میں اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔ سارا کو بھی جگانا ہے اور دیکھوں شہریار نے ڈرائنگ روم سے برتن اُٹھا کر کچن میں رکھے یا نہیں۔"

کچن سے مطمئن ہوکر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں دونوں دیواروں کے ساتھ ساتھ دو سنگل بیڈ رکھے تھے۔ درمیان رائٹنگ ٹیبل اور کرسیاں تھیں ایک بیڈ پر سارا سو رہی تھی۔ ماتھے اور چہرے پر بال بکھرے تھے۔ آدھا کمبل اوپر تھا اور آدھا بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ زارا نے پیار سے اُسے دیکھا۔ اُس کا کمبل ٹھیک کیا اور پھر آ کر اپنے بیڈ لیٹ گئی۔ بے حد تھکی ہونے کے باوجود وہ صفیہ بیگم کے بارے میں فکر مند تھی۔ ہر بات پر ٹینشن لینے ذرا سی فکر کی بات برداشت نہ کرنے کی وجہ سے وہ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہوگئی تھیں۔ زارا کو ماں باپ سے بے حد محبت تھی۔ انہیں معمولی سا پریشان دیکھنا بھی اُس کی برداشت سے باہر تھا۔ وقت اور حوادث

زمانہ نے انہیں بارہا ٹھیکروں سے نوازا تھا۔ وقت تو بادشاہ ہے بدلتے رہنے کا..... اسی وقت کی جانبازیوں کا خدا مالک ہے۔ وہی اُس کی ہر جنبش اور ہر کروٹ کو ترتیب دیتا ہے وقت جو کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ نوازنے پر آتا ہے تو عرش پر بٹھا دیتا ہے اور سزا دینے پر آتا ہے تو خاک میں ملا دیتا ہے۔ کیسی کیسی شاندار ہستیاں اُس کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئیں اور کتنے فقیروں کے سر پر تاج سجایا' عزت اور ذلت تو خدا کے اختیار میں ہے۔

زارا کے پردادا جمال مرزا ہندوستان میں ایک چھوٹی سی ریاست کے نواب تھے۔ نرم دل اور مہربان..... علم و ہنر کے زیور سے آراستہ..... کتنے خوبصورت اور عالیشان محل میں رہائش پذیر تھے۔ سینکڑوں ملازمین تھے۔ مصاحبین تھے جو اُن کے دسترخوان اور خزانے سے مستفید ہوتے۔ مگر ایک لمحہ کو غرور دل میں نہ آیا۔ ایک ہی اولاد تھی طلال مرزا..... اُن کی تربیت میں کوتاہی نہیں کی..... علم و ہنر سے انہیں بھی آراستہ کیا..... گھر میں آکر اتالیق..... عربی' فارسی اور اردو کے علاوہ دوسرے دنیاوی علوم اور فلسفے وغیرہ کی تعلیم دیتے تھے۔ طبیعت میں شاعری بھی تھے۔ اچھے شعر کہنے لگے تو جلال مرزا بہت خوش ہوئے۔ شعروشاعری کی دل میں بہت قدر تھی۔ جوان ہونے پر اپنی چچازاد سے شادی کروادی۔ بیوی بھی خدا نے ایسی دی کہ جس کے دل میں علم کی قدر تھی۔ وہ اپنے شوہر کی شاعری کی عاشق تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں بھی ہر قسم کا ہنر تھا مگر ملازمین کی موجودگی میں کام کی ضرورت نہ تھی پھر بلال مرزا پیدا ہوئے تو ساری توجہ اُن کی تربیت پر مبذول کردی۔ ابھی نواب بلال مرزا ایک سال کے تھے کہ دادا خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ریاست کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری طلال مرزا کے سر پر آن پڑی۔ باپ کی طرح وہ بھی شفیق اور مہربان تھے۔ اور یہی خصوصیت نواب بلال مرزا میں بھی آئی تھی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب پاکستان کی تحریک نے پورے ہندوستان میں اتنی مضبوطی سے قدم جمائے کہ انگریز اور ہندو کو مطالبہ مان لینے کے سوا کوئی راستہ نہ دکھا۔ طلال مرزا نے ریاست کے سارے وسائل تحریک کے لیے وقف کردیے۔ اور قائداعظم کو اپنی بے لوث وفاداری کا یقین دلایا اور جب پاکستان بنا تو ایک لمحہ سوچے بغیر سب کچھ چھوڑ کر بلال اور بیوی کے ہمراہ پاکستان آگئے۔ پہلا پڑاؤ لاہور میں ڈالا..... ریاست کے زیادہ تر وسائل تو تحریک کی نذر کرچکے تھے۔ یہاں کلیم میں ایک وسیع وعریض حویلی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اسی پر صبر وشکر کیا اس وقت بلال مرزا ڈیڑھ سال کے تھے۔ اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی آئے تو معلوم ہوا کہ اُن میں بھی شاعری کے جراثیم ہیں..... طلال مرزا خوش تھے۔ مگر والدہ حسینہ بیگم کو یہ بات پسند نہ آئی۔ وہاں تو ریاست تھی۔ وسائل لامحدود تھے۔ کچھ نہ بھی کرتے تو فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ زندگی کی مشکلات کیا ہوتی ہیں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ طلال مرزا کو ایک کالج میں نوکری مل گئی۔ مگر شروع شروع میں گزارا مشکل نظر آیا۔ عادتیں جو ایسی بڑی تھیں پھر جب پتہ چلا کہ دارالحکومت اسلام آباد منتقل ہو رہا ہے تو وہاں زمین خرید لی اُس وقت زمینیں سستی تھیں۔ ایک ہزار گز کا پلاٹ خریدنے کے لیے زیادہ رقم درکار نہیں تھی۔ حویلی کو بیچ کر ایک گھر میں منتقل ہونے جو اتنا بڑا تو نہ تھا لیکن وہ افراد ہی کتنے تھے بلال مرزا کی تعلیم جاری رہی..... اور جب تک اُن کی تعلیم مکمل ہوئی' اسلام آباد میں گھر بھی مکمل ہوگیا سب وہاں

شفٹ ہو گئے۔ پھر بلال مرزا کو قائد اعظم یونیورسٹی میں جاب مل گئی تو طلال مرزا بوڑھے ہو چکے تھے۔ اماں بھی کمزور تھیں' بلال مرزا اُن کی خدمت میں لگ گئے۔ مگر شاعری بھی دل و دماغ پر سوار تھی۔

کئی سال گزرے تو طلال مرزا کو یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ یہ وہ پاکستان نہیں ہے جس کے لیے وہ ہندستان میں اپنی ریاست چھوڑ کر کچھ سوچے سمجھے بغیر آ گئے تھے۔ لیکن ملال یا پچھتاوا اب بھی نہیں تھا۔ صرف دکھ کا احساس تھا کہ قربانیاں رائیگاں جاتی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ یہی حال حسینہ بیگم کا تھا۔ اُن تینوں نے اسلام آباد کو بڑھتے' پھولتے اور پھیلتے دیکھا اور ساتھ ساتھ لوگوں کی خود غرضی' بے ایمانی اور پیسے کی ہوس کو بھی پھولتے پھلتے دیکھا۔ پہلے تو یہ غم حسینہ بیگم کو کھا گیا...... طلال مرزا اور بلال مرزا تنہا رہ گئے۔ تو طلال مرزا نے سوچا زندگی کا کیا بھروسہ اس سے پہلے کہ اُن کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے۔ بلال مرزا کی زندگی کو سہارا دے جائیں۔ انہیں کوئی ساتھی دے جائیں تا کہ اگر وہ خدا کو پیارے ہو جائیں تو وہ تنہا نہ رہ جائیں۔ کوئی غم خوار کوئی ہمدرد ہو جو ساتھ دے نہ کرتے کرتے عمر چالیس تو ہو چکی تھی اس طرح صفیہ بیگم دلہن بن کر اس گھر میں آ گئیں جو کہ آج کل ایف سکس کا علاقہ کہلاتا ہے۔ سستے وقتوں میں خریدا تھا۔ اور بہت اچھا بنایا تھا خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی آشیانہ تو ہے۔ ورنہ حالات جس طرح خراب ہو رہے تھے زمانے کی بے مہری ...... حکمرانوں کی نااہلی اور ہوسِ اقتدار جس طرح پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی تھی۔ اپنا گھر نہ ہوتا تو گزارا مشکل ہو جاتا...... کبھی کبھی اپنی ریاست وہاں کے عیش و آرام اور پر بہار دن یاد آتے تو آنکھیں نم ہو جاتیں...... فوراً استغفار کرتے ...... خدا کا شکر کرتے...... ورنہ خدا کو اختیار تھا کہ وہ یہ گھر بھی عنایت نہ کرتا اور سڑک پر بٹھا دیتا...... فقیر بنا دیتا...... ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیتا کہ خدا نے انسان کے ساتھ پیٹ ایک ایسی چیز لگا دی ہے۔ جو عزت دانا کے بُت کو پاش پاش کر دیتی ہے بلال مرزا کی تنخواہ میں گزارا ذرا مشکل سے ہوتا......

لیکن یونیورسٹی سے آنے کے بعد ڈرائنگ روم میں جو دوستوں کی محفلیں جمتیں' چائے کے دور چلتے انہوں نے آمدنی اور اخراجات میں توازن نہ رہنے دیا تھا۔ کبھی کبھی طلال مرزا سوچتے آخر باپ دادا پر ہی تو گیا ہے۔ کیا غلط کر رہا ہے۔ اُن کے گرد بھی مصاحبین کا جمگھٹا رہتا تھا۔ دستر خوان بچھتے تھے کسی کو کھانا کھائے بغیر جانے نہیں دیا جاتا تھا اور یہاں بھی تو یہی ہو رہا ہے۔ بے شک بہت چھوٹے پیمانے پر ہو رہا تھا مگر اتنی ہی استطاعت تھی۔ ورنہ وہ بلال مرزا کو جانتے تھے۔ اگر اُن کے اختیار میں ہوتا تو وہ کیا نہ کرتے طلال مرزا کا دل تڑپتا...... بلال کو سمجھاتے وہ سعادت مندی سے سر جھکا دیتے لیکن کسی کو آنے سے روکنا اُن کو گوارا نہ تھا۔ زبان کو یارا نہیں تھا ایسے میں زارا اور سارا وہ پھول تھے جنہوں نے اُن کو بکھرنے سے بچایا ہوا تھا۔ وہ اُن کی معصوم اور پیاری پیاری حرکتوں میں زندگی کو دھڑکتا محسوس کرتے......

پھر جب شہریار اس دنیا میں آیا تو انہیں لگا بیٹے کی فیملی مکمل ہو گئی۔ اُن کا سارا وقت اُن کے ساتھ گزرتا...... ملکی حالات سے دھیان ہٹ جاتا۔ لیکن جو کانٹا دل میں چبھ چکا تھا۔ وہ ابھی اندر ہی تھا اور آہستہ آہستہ ناسور کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ زارا سارا اور شہریار اُن کی زندگی کی رونق تھے۔ تینوں ہی ماں اور باپ سے زیادہ دادا سے مانوس تھے۔ بہت پیار کرتے تھے اُن سے' پورے دس سال انہوں نے اُن کی تربیت کی کہ صفیہ بیگم تو ہمہ وقت گھر داری میں مصروف رہتیں' بجٹ پورا کرنے کی کوشش میں

ہراساں نظر آتیں، لیکن ایک دن شفقت، محبت اور تربیت کا یہ چراغ بھی گل ہوگیا۔ خاص طور پر زارا کو یوں لگا سورج تاریک ہوگیا ہے۔ کوئی روشنی نہیں رہی بڑی ہونے کے ناطے وہ اُن سب سے زیادہ قریب تھی۔ سب سے زیادہ محبت لی تھی اور سب سے زیادہ محبت کی تھی۔ بلال مرزا اور صفیہ بیگم بھی بے دم تھے۔ سارا اور شہریار بے جان تھے۔ لیکن زارا سے تو یوں لگتا تھا کسی نے زندگی چھین لی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں اتنے آنسو تھے کہ خشک ہونے میں نہ آتے۔ کتنی مشکل سے اُس نے اس عظیم سانحے سے سمجھوتہ کیا تھا یہ تو وہی جانتی تھی۔

لیکن وقت جیسے عظیم حکیم نے آخر کار اس غم کو سہہ لینا ممکن بنا دیا۔ دادا جان نے ہی اُن تینوں کو بہترین اسکولوں میں داخل کروایا تھا۔ حالانکہ صفیہ بیگم نے کچھ جھجک کر بجٹ کم ہونے کا ذکر بھی کیا تھا۔ لیکن طلال مرزا نے یہ کہہ کر انہیں چپ کروا دیا تھا کہ وہ ہر بات پر سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ لیکن نواب جلال مرزا کے گریٹ گرینڈ چلڈرن کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی رہ جائے یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ اور اس وقت جب سارہ دوسرے بیڈ پر سو رہی تھی اور زارا یہ سب یاد کر رہی تھی اُس کی آنکھوں میں اُس عظیم شخصیت کے لیے آنسو تھے۔ محبت اور احترام کے آنسو......

گھڑی پر نظر پڑی تو خیال آیا اب سارا کو جگا ہی دینا چاہیے۔ وہ اپنے ٹیسٹ کے بارے میں بہت حساس تھی اور ہمیشہ سب کو پیچھے چھوڑنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

صبح سارا ابھی سو رہی تھی۔ زرا نے سب کے لیے جلدی جلدی ناشتہ تیار کیا اور میز پر سجا رہا۔ تبھی بلال مرزا تیار ہو کر اپنی آستین کے بٹن بند کرتے ہوئے باہر آ گئے۔

''السلام علیکم بابا جانی...... جلدی سے آجایئے ......ورنہ سب ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''ہم تو آ ہی گئے ہیں مگر تمہاری والدہ محترمہ کہاں ہیں؟'' تبھی صفیہ بیگم چائے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ کپ تو زارا نے پہلے ہی میز پر رکھ دیے تھے۔ ٹرے میں خوبصورت ٹی کوزی کے ساتھ ڈھکی ہوئی چائے دانی...... چینی دان اور دودھ دان تھا۔

بلال مرزا نے صفیہ بیگم کو چائے سمیت آتے دیکھا تو شرارت سے بولے۔

''بیگم دسترخوان سج گیا کیا...... ہمیں تو لوازمات میں کچھ کمی سی دکھائی دیتی ہے...... آپ کا کیا خیال ہے...... ہم درست کہہ رہے ہیں نا؟''

''یہ تو آپ ہی جانیں کس چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ شاید آپ کے دو چار دوست موجود نہیں ہیں اُن کی کمی ہی محسوس ہو رہی ہوگی......'' وہ ذرا جل کر بولیں۔

''زارا بیٹا...... چولہے پر کچھ رہ تو نہیں گیا؟''

''نہیں تو بابا جانی......''

''پھر ہمیں یہ جلنے کی بو کہاں سے آرہی ہے؟'' زارا نے شرارت سے ماں کی طرف دیکھا۔

''مجھے تو لگتا ہے بابا جانی جیسے کسی ظالم حکمران نے کسی معصوم کا دل جلایا ہے۔''

''اُس ظالم حکمران کو تہہ دل سے شرمندہ ہو کر اُس معصوم سے معافی مانگنی چاہیے۔ نا خلف کہیں گا۔'' صفیہ بیگم نے انہیں گھور کر دیکھا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

''معصوم منتظر ہے بابا جانی...... اُس ظالم کو جلدی سے معافی مانگ لینی چاہیے اس سے پہلے کہ بات بڑھے۔''

''ارے معافی ہم کیا خاک مانگیں گے...... وہ معصوم تو ہم سے جان بوجھ کر دور بیٹھ گئیں۔''

''اوہ تو وہ ظالم حکمران آپ ہیں کیا؟'' زارا نے مصنوعی حیرت سے پوری آنکھیں کھول دیں۔

''باپ بیٹی ڈرامہ ختم کرو اور ناشتہ کرو...... اور یہ سارا اور شہریار کہاں ہیں؟''

اُسی وقت شہریار دوڑتا ہوا آیا اور ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگا...... اُس کے پیچھے پیچھے سارا تھی۔

''امی جان شہری سے کہیں میری پنسل واپس کردے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''کون سی پنسل؟'' صفیہ بیگم حیرت زدہ تھیں

''امی میری لکی پنسل آپ کو پتہ ہے آج میرا ٹیسٹ ہے۔ اور اگر میں نے اُس پنسل سے ٹیسٹ نہ دیا تو میرے اچھے نمبر نہیں آئیں گے۔''

''بری بات بیٹا...... یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ اور کم از کم آپ جیسی روشن خیال بیٹی کے منہ سے سن کر ہمیں حیرت ہوئی۔''

''مگر بابا جانی......''

''شہری آپ کو وہ پنسل کیوں چاہیے؟'' صفیہ بیگم نے پیار سے پوچھا۔

''آج میرا بھی ٹیسٹ ہے امی جان...... میں نے تیاری نہیں کی...... تو میں نے سوچا شاید سارا کی لکی پنسل سے میرے اچھے نمبر آ جائیں۔''

''نمبر صرف لکی پنسل سے اچھے نہیں آتے نالائق لڑکے...... پڑھنا بھی پڑتا ہے۔'' سارا سرزنش کے طور پر بولی تو بلال مرزا نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''آپ نے خود ہی اپنی بات کی تردید کردی سارا...... آج ہم ایک تجربہ کرتے ہیں' آپ آج کا ٹیسٹ کسی دوسری پنسل سے دو...... اور شہری کو یہ پنسل دے دو۔''

''کیوں بابا جانی؟'' سارا نے احتجاج کیا۔

''یہ آپ کے لیے امتحان ہے بیٹی؟''

''کیسا امتحان؟''

''کیا آپ میں اتنی لیاقت ہے کہ اُس لکی پنسل کے بغیر اچھے نمبر لے سکیں۔ اور شہری کے لیے امتحان ہے کہ کیا پڑھے بغیر صرف لکی پنسل کی مدد سے اچھے نمبر آ سکتے ہیں؟''

''یہ بھی ٹھیک ہے بابا جانی......'' سارا پُرسوچ انداز میں بولی اور پھر شہری کو چڑانے والے انداز میں بولی۔

''آج دیکھتے ہیں تم کتنے پانی میں ہو۔''

''سارا...... چھوٹا بھائی ہے...... پیار سے بات کرو۔''

''ہماری بھی آپ سے یہی درخواست ہے بیگم۔'' بلال مرزا معصوم سی شکل بنا کر بولے تو صفیہ بیگم نے گھور کر انہیں دیکھا۔

''بیگم کیا آپ اپنے جادوگر ہاتھوں سے ہمارے لیے کپ میں چائے انڈیل سکتی ہیں۔'' زارا نے زیرلب مسکرا کر اپنے والدین کی طرف دیکھا اور پھر دل میں اُن کے سدا خوش رہنے کی دعا مانگی۔

''شہری...... سارا جلدی ناشتہ کرو تمہاری بس آنے والی ہوگی۔''

دونوں آرام سے بیٹھ گئے تو زارا نے مسکرا کر بلال مرزا کی طرف دیکھا۔

''بابا جانی...... ایک خوش خبری ہے آپ کے لیے۔''

''چشمِ ما روشن دلِ ماشاد...... ہم ہمہ تن گوش ہیں فرمایئے۔'' وہ شرارت سے جھکے۔

''اگلے ماہ سے گھر کا بجٹ آپ کی یہ صاحبزادی چلانے لگی۔'' اُس نے مصنوعی کالر جھاڑے تو چائے کا گھونٹ لے کر بلال مرزا نے ایک لمحہ کو اُسے اور پھر اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔

''کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ہماری صاحبزادی

ہماری بیگم کے حق پر ڈاکہ کیوں ڈال رہی ہیں؟''

''یہ ڈاکہ نہیں بابا جانی...... آپ کی صاحبزادی اپنی صلاحیتیں آزمانا چاہتی ہے اور اُسے ملکۂ عالیہ کی اجازت سے یہ فرض سونپا گیا ہے۔''

''کیوں بیگم صاحبہ...... اس زمانے میں جب دنیا دوسروں کے حقوق غصب کررہی ہے آپ نے اپنا حق کیوں چھوڑا؟''

''آپ کو تو اپنی شاعری اور دوستی سے فرصت نہیں...... آپ کیا جانیں بچوں کی تربیت ہر شعبے میں ضروری ہوتی ہے۔''

''اور جب شاعری اور دوستی کی بات رہ گئی تو ہمارے بجٹ میں آپ کے دوستوں کے لیے چائے کے ساتھ اچھی اچھی ڈشز بھی شامل ہوں گی۔ اب تو خوش ہیں نا......''

''آپ کی امی پہلے ہی ہم سے اس بات پر ناراض رہتی ہیں۔ آپ کیوں ہمیں مزید زیرِ عتاب لانا چاہتی ہیں۔'' بلال مرزا خوشگوار لہجے میں صفیہ بیگم کو دیکھ کر بولے تو زارا نے اُٹھ کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اور اُن کے گال پر بوسہ دیا۔

''اب ایسا نہیں ہوگا بابا جانی...... امی نے وعدہ کیا ہے...... اور دیکھ لیجیے گا امی اپنا وعدہ پورا کریں گی۔ اور شہری...... تم ابھی تک اپنے پراٹھے سے کھیل رہے ہو...... جلدی جلدی کرو...... دیر ہوجائے گی ورنہ......''

''امی جان...... میرے پیٹ میں درد ہے......'' شہریار نے منہ بنایا۔

''ہاں آج ٹیسٹ ہے نا...... تیاری ہی نہیں...... پیٹ میں درد ہوگا۔'' سارا شوخی سے بولی وار اُٹھتے ہوئے اُس کے سلیقے سے بنے بال خراب کرکے بھاگ گئی۔ شہریار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''سارا بھائی سے معذرت کرو فوراً......'' سارا نے معذرت کی تو زارا پیار سے شہری کے پاس بیٹھ گئی۔

''دیکھو شہری...... آپ نے تیاری نہیں کی...... لیکن اسکول جانا پڑے گا...... تاکہ آپ کو سبق ملے کہ ٹیسٹ کی تیاری ضروری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے چھٹی کا بہانہ نہیں چل سکتا۔'' زارا نے سنجیدگی سے اُسے سمجھایا اور پیار کیا۔ صفیہ بیگم نے بھی گلے سے لگا کر رخصت کیا۔ لیکن اُن کا دل بیٹے کی حالت پر آزردہ تھا۔ اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ اُس کی جگہ وہ خود ٹیسٹ دے آئیں۔ لیکن بیٹے کی تربیت کے لیے ضروری تھا کہ دل پر پتھر رکھیں۔ سب رخصت ہوگئے تو وہ چائے کا ایک اور کپ بنا کر لاؤنج میں آگئیں پھر کارنر میں پڑی رضیہ بیگم کی تصویر دیکھ کر اُن کا دھیان اپنی ماں کی طرف چلا گیا۔ دل بے چین سا ہوگیا۔ کافی دیر سے اُن سے ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ گھر کی ذمہ داریاں اجازت نہیں دیتی تھیں کہ وہ گاؤں کا چکر لگالیں۔ زارا نے وعدہ کیا تھا کہ امتحان دیتے ہی چھٹیوں میں وہ سب گاؤں جائیں گے۔ نانو سے ملاقات کریں گے اور خوب مزے کریں گے۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگئیں کہ جب بچے اپنے مزے کر رہے ہوں گے تو وہ ماں بیٹی اتنے مہینوں کی جدائی کے بعد خوب باتیں کریں گی۔ کچھ ماضی کی یادیں تازہ کریں گی اور کچھ اپنے بچوں کے متعلق باتیں کریں گی۔ بچوں کا خیال دل میں آیا تو دل محبت کی گرمی سے خود بخود پگھلنے لگا اور لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

☆......☆......☆

جیسے ہی کلاس ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ سب لڑکیوں نے کتابیں اور نوٹ بکس بند کرکے ڈیسک میں رکھیں اور ٹیچر کے جاتے ہی باہر کو لپکیں۔ قصہ

نے کلاس روم کے دروازے سے ہی جینا کو بازو سے پکڑا اور دوسری سہیلیوں کی نظر بچا کر ایک طرف لے گئی۔ جینا حیرت سے اُسے دیکھتی اُس کے ساتھ چلتی رہی' اور جب دونوں ایسی جگہ پہنچ گئیں جہاں تلاش کر لیے جانے کا اندیشہ نہیں تھا تو فضہ عین جینا کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟'' جینا نے پھیکے چہرے کے ساتھ کچھ حیرت اور کچھ ناگواری سے اُسے دیکھا۔

''ایک تو تم میری اجازت کے بغیر مجھے کھینچ کر جاسوسوں والے انداز میں اِدھر لے آئی ہو۔ اوپر سے یہ فضول سوال...... مطلب کیا ہے تمہارا؟''

جینا نے اُسے غصے سے دیکھ کر بات کی تھی لیکن فضہ سے اُس کی نم آنکھیں پوشیدہ نہ رہ سکیں۔

''جینا...... یہ میں ہوں فضہ...... تمہاری بیسٹ فرینڈ جو تمہیں اندر باہر سے جانتی ہے۔ آج جب سے تم کالج آئی ہو تمہاری شکل پر بارہ بجے ہیں۔ کسی سے بات نہیں کر رہی...... نہ شوخی نہ شرارت کھوئی کھوئی سی ہو گم سم نظر آ رہی ہو...... بتاؤ نا کیا بات ہے؟''

جینا کے بے اختیار ہی آنسو نکل آئے۔ بڑی مشکل سے انہیں روکا۔ چہرہ صاف کیا تھوڑی دیر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی اور پھر آہستہ سے بولی۔

''فضہ آج پورا ہفتہ ہوگیا ہے اُسے گئے ہوئے...... لیکن اُس نے ایک بار بھی کال نہیں کی۔''

''تو یہ بھی کوئی مسئلہ ہے...... اُس نے کال نہیں کی تو تم کر لو۔'' فضہ نے اُسے تسلی دی۔

''اُس کے پاس انٹرنیشنل موبائل نہیں ہے اُس نے کہا تھا وہ جاتے ہی موبائل خریدے گا اور مجھے اپنا نمبر بتائے گا۔ لیکن پورا ہفتہ گزر گیا ہے فضہ......''

''تو کیا ہوا جینا...... کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اُسے وقت نہ ملا ہو...... اور پھر دوسرے ملک میں ایسی جگہوں کا پتہ بھی تو نہیں ہوتا...... تم کیوں اتنی فکر مند ہو۔''

''فضہ میں بہت اُداس ہوگئی ہوں۔ اتنے دن اُس سے بات نہیں ہو سکی۔ جب تک اُس کی آواز نہیں سنوں گی۔ اُس کی خیریت کا پتہ نہیں چلے گا۔ مجھے چین نہیں آئے گا۔''

''یا اللہ! یہ محبت بھی کیا شے ہے؟'' فضہ نے شوخی سے کہا۔

''سنا تھا کہ انسان کی خوشیوں کی ضامن ہے۔ اُسے ستاروں میں لے جاتی ہے۔ لیکن یہاں تو مجھے آنکھوں میں ہی ستارے' موتی نظر آ رہے ہیں۔ ویسے موصوف ہوں گے کہاں آج کل؟ کہاں کورس کرنے گئے ہیں؟''

''کورس تو انگلینڈ میں ہے۔'' جینا کی آواز پھر بھرا گئی۔

''یہی تو مسئلہ ہے...... کوئی اتہ پتہ بھی تو نہیں رہا۔ کہہ رہا تھا اُسے ابھی خود معلوم نہیں کہ وہ کب کہاں ہوگا؟ دوست کے پاس جا رہا ہوں...... جہاں جہاں وہ لے جائے گا۔ چلا جاؤں گا کورس کے بعد کئی ملکوں میں جانے کا پروگرام ہے...... لیکن جاتے ہی موبائل لوں گا اور تمہیں اپنا نمبر ضرور دوں گا۔ جہاں جہاں جاؤں گا' تم سے بات ضرور کروں گا کیونکہ تمہاری خوبصورت آواز کانوں میں نہیں پڑے گی تو بہرا ہو جاؤں گا۔ میرا دن نہیں نکلے گا اور اب دیکھو ہفتہ گزر گیا اور اُس کا دن ہی نہیں نکلا...... وہ کافی آزردہ اور غمگین نظر آ رہی تھی۔ فضہ نے اُس کے شانوں کے گرد بازو پھیلا کر تسلی دی۔

''فکر نہ کرو...... جلد ہی اُس کا فون آئے گا۔ وہ بے شمار وجوہات بتائے گا فون نہ کر سکنے کی اور بہت سی معذرت کرے گا۔ دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا۔ کوئی

مذاق تھوڑی ہے اُس نے تمہیں پروپوز کیا ہے انگوٹھی پہنائی ہے۔ شادی کا وعدہ کیا ہے۔ کوئی ایسے ہی تو تعلق نہیں جوڑ لیا۔ تمہیں اعتبار نہیں اُس پر...... اُس کی محبت پر بتاؤ؟''

''وہ تو ہے فضہ...... لیکن میں بہت محبت کرتی ہوں اُس سے اور یہ دوری مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی...... جبکہ اُس کا فون تک نہیں آیا۔ میں کیا کروں؟ کیسے دل کو بہلاؤں؟''

''میں بتاتی ہوں خوابوں اور خیالوں میں اُس سے ملاقات کیا کرو اُس کے دل کا حال سنا کرو اپنے دل کا حال سنایا کرو۔ اُسے بتاؤ تم کتنی بے قرار اور بے چین ہو۔ وقت یوں پلک جھپکتے میں گزر جائے گا۔'' فضہ نے چٹکی بجائی لیکن جینا کے دل کو سکون نہیں آیا۔

''چلو اس وقت تو کینٹین چلتے ہیں کچھ پیٹ پوجا ہو جائے بھئی ہم سے تو غم بھی خالی پیٹ نہیں کیا جاتا...... وہاں ٹینا' آسیہ' صوفیہ اور زارا ہوں گی دل کچھ بہل جائے گا۔''

''نہیں تم جاؤ......'' جینا آزردگی سے بولی۔

''میرا بالکل نہیں چاہ رہا کہیں جانے کو یا کچھ بھی کھانے کو' میں لان میں جا کر بینچ پر بیٹھتی ہوں' ایک پیریڈ رہ گیا ہے...... جو اٹینڈ کرنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ میں وہیں بیٹھ کر اُس کے ختم ہونے کا انتظار کروں گی اور پھر گھر جاؤں گی۔ شاید اُس کا کوئی میسج یا مس کال آئی ہو۔'' فضہ اُسے افسوس سے دیکھ کر رہ گئی۔

جیسے ہی جینا کی گاڑی گیٹ سے اندر آئی۔ جینا کتابیں وہیں چھوڑ کر تیزی سے باہر لپکی۔

''ڈرائیور میری بکس اندر پہنچا دینا۔'' تیز رفتاری سے چلتی اندر آئی اور لاؤنج میں بیٹھی مہتاب خاقان کو نظر انداز کرتی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

مہتاب کے دل میں گہرا ملال اتر آیا آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ اُس کی اکلوتی بیٹی تھی واحد اولاد...... دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے سے اتنی دوری پر تھیں کہ مہتاب کو لگتا وہ زندگی میں کبھی بھی کسی قیمت پر بھی اُس تک نہیں پہنچ پائے گی۔ اور اُس کی وجہ بھی وہ جواد کو سمجھتی تھی۔

شادی کی پہلی رات ہی جس سرد مہری نے اُن دونوں کے درمیان جنم لیا تھا۔ جسے عمر بھر کے لیے سرد جنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ دونوں کے درمیان بس جسمانی ضرورت کا رشتہ رہ گیا تھا۔

جہاں مہتاب کے دل میں اپنی بے عزتی کا احساس ہر دم ناگ بن کر انہیں ڈستا تھا۔ وہاں جواد کو مہتاب کا انہیں نظر انداز کرنا اُن سے لاتعلق رہنا اُن کے کسی کام کی پرواہ نہ کرنا اور کسی قیمت پر اُن کے قدموں میں نہ جھکنا بری طرح کھلتا تھا۔ اُن کی مردانگی پر زبردست چوٹ پڑتی تھی۔ اُن کے لیے یہ خیال اذیت ناک تھا کہ اُن جیسی شاہانہ شخصیت کے سامنے وہ اَن پڑھ اور گنوار ہو کر بھی اپنی عزت کا بھرم کیوں قائم رکھے ہوئے تھی۔ لیکن انہیں زیادہ ملال اس لیے نہیں تھا کہ اُس کو اس کی سزا وہ دوسری شادی کی صورت میں دینے کا تہیہ کر چکے تھے۔ اُس پر سوکن لانے کا خیال اور پھر اِس کے سامنے سوکن سے پیار و محبت جتا کر اُسے تڑپانے کا خیال بڑا خوش کن تھا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے تھے کہ جب انسان خدا بننے کی خواہش کرتا ہے تو خدا کی خدائی جوش میں آجاتی ہے۔ جیسے ہی انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ایک دوست کی طرح دار اور خوبصورت بہن سے شادی کر کے مہتاب کے منہ پر طمانچہ ماریں گے۔ اماں نے انہیں خبر سنائی کہ مہتاب امید سے ہے۔ جواد خاقان کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ لیکن دماغ اور دل میں زلزلہ آ گیا۔ غصے کی زیادتی

سے وہ کچھ دیر تو بول ہی نہ سکے۔ اور جب بولے تو منہ سے یہی نکلا۔

”نیور...... امپاسبل...... اس عورت کے بطن سے میرا بچہ...... میں یہ قیامت تک نہیں ہونے دوں گا۔“ اماں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور پھر بے اختیار اُن کی نظریں جھک گئیں۔ یہ وقت بھی اُن کی زندگی میں آنا تھا کہ اُن کا بیٹا اُن کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر ایسی بات کہہ رہا تھا کہ وہ خود شرمساری محسوس کر رہی تھیں۔ ابال اگر جواد خاقان کے دل میں اُٹھ رہے تھے تو چوٹ کھائی ناگن کے احساسات مہتاب کے دل میں بھی قیامت برپا کر رہے تھے۔ یہ دوسری بار تھی کہ جواد خاقان نے اُن کی اور اُن کی شخصیت کی توہین کی تھی۔ ان کے پندار کو زبردست ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس بار تو برداشت کرنا اذیت ناک ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا تھا۔ آخر عزتِ نفس کتنی چوٹیں اور کتنے زخم برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی کہ یہ اُس زندگی کے لیے ضروری تھا جس نے اُن کی کوکھ میں جنم لیا تھا۔ اور جس کے لیے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ابھی سے اُن کے دل میں موجزن تھا۔

اماں نے بڑے صبر و تحمل سے جواد کی طرف دیکھا۔

”تمہیں اِس بچے کے لیے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا اور مہتاب کا بچہ ہوگا۔ ہم اسے پالیں گے۔ تم بے شک اُس کی شکل بھی نہ دیکھنا...... اور یہی سمجھنا خدا نے تمہیں کوئی اولاد دی ہی نہیں۔“

وہ فیصلہ کن انداز میں سب کہہ کر انہیں اسی طرح حیران پریشان کھڑا چھوڑ کر چلی گئیں۔ پورا ایک ہفتہ سوچ بچار کے بعد جواد خاقان نے اس شادی کو کچھ دیر کے لیے پس پشت ڈال دیا جینا پیدا ہوئی تو اُن کے دل نے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ وہ اسپتال جائیں۔ لیکن دوستوں کے مبارکباد دینے اور اسپتال جا کر بھابی اور بچے کو دیکھنے کی خواہش پر مجبور ہو کر انہیں آنا ہی پڑا۔ اماں نے جب گلابی کمبل میں لپٹی۔ سیاہ کانچ جیسی آنکھوں اور نرم پھولے پھولے گلابی گالوں والی جینا کو زبردستی اُن کی گود میں ڈالا تو انہوں نے بے اختیار اُس کی طرف دیکھا۔ اُسی لمحے بچی نے آنکھیں کھولیں اور باپ کی طرف دیکھا یہ اُن دونوں کی نظروں کا پہلا ٹکراؤ تھا یا کوئی طلسمی لمحہ وہ پہلی نظر میں ہی اُس چھوٹی سی پری کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ اُس کے گال پر پہلا بوسہ جنت کی معطر ہواؤں کی طرح نرم و نازک اور خوشبودار تھا۔ دل میں جذبات اُمڈ کر آئے اور آنکھوں میں آنسو بن کر برسے، بے اختیار کسی متاعِ حیات کی طرح اُسے سینے سے لگا لیا۔

اماں آسودگی سے مسکرائیں۔ پھوار تو شاید مہتاب کے دل پر بھی پڑی۔ لیکن وہ اُس آگ کو بجھانے کے لیے ناکافی تھی جو ایک مدت سے دل میں سلگ رہی تھی۔ اور جس نے دل میں چھالے ڈال دیے تھے۔

جینا جواد خاقان کی آغوشِ محبت میں پروان چڑھتی رہی۔ مہتاب کا دل ہر دم اُس کے لیے ہمکتا لیکن جواد اُسے جینا کے زیادہ قریب آنے کا موقع ہی نہ دیتے۔ ایسے لگتا تھا جیسے صرف دودھ پلانے والی آیا ہیں، اُس کے سب کاموں کے لیے جواد نے دو تین آیائیں رکھ دی تھیں۔ خود دفتر جانا کم کر دیا تھا۔ گھر میں ہی دفتر بنا لیا۔ بزنس تو زیادہ تر یوں بھی موبائل کے ذریعے ہی کرتے، فائلیں بھی گھر کے آفس میں دیکھتے کمپیوٹرز کا سارا سامان بھی سیٹ کر لیا تھا۔

☆......(جاری ہے)......☆

افسانہ

نبیلہ نازش راؤ

بُری نظر

''جب اتنی اچھی لڑکی تھی، شکل کی بھی، سیرت کی بھی اور آپ سب کو اتنا چاہتی بھی تھی تو آپ نے فیصل سے اس کی شادی کیوں نہ کر دی۔'''' میں تو ضرور کر دیتی لیکن بیٹی وہ ہماری ذات برادری کی نہ تھی۔ اور تمہیں پتا ہی ہے کہ ہمارے ہاں......

''ایک کمرے میں اب میرا گزارہ نہیں ہوتا۔'' میں نے کئی مرتبہ کہی ہوئی بات دوبارہ دہرائی جواب میں فیصل نے میری طرف نظر اُٹھا کر غور سے دیکھا۔

''گزشتہ ایک ہفتے سے تمہارا یہ جملہ میں دن میں کئی کئی بار سن رہا ہوں۔''

''ہمیشہ سنتے ہی رہیں گے۔'' میں چڑ گئی۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ بات کرنا چاہتی ہو تو کھل کر کرو۔''

''میں کہنا کیا چاہتی ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ وہی حقیقت ہے، حد ہوگئی ہے، دس سال سے اس ایک کمرے میں جس طرح سے چار بچوں کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ میرا دل ہی جانتا ہے۔'' میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ایک کمرے میں مجھے واقعی بہت تکلیف تھی۔

''کتنی مرتبہ کہا ہے کہ بچوں کو سدرہ یا فریدہ کے پاس سُلا دیا کرو۔ امی کے پاس شروع ہی سے سلاتیں تو اُن کی عادت ہو جاتی۔''

''بات بدلنے کی کوشش نہ کریں۔ فلیٹ کی قسطیں کب کی ادا ہو چکی ہیں۔ فلیٹ خالی پڑا ہے۔ آخر وہاں رہنے میں کیا قباحت ہے؟''

''شروع ہی سے سب کے ساتھ رہنے کی عادت ہے۔ سوچتا ہوں اکیلے کیسے رہیں گے۔'' فیصل سوچ میں پڑ گئے۔

''یہی بات سوچنے لگیں تو اتنے گھر کیوں بنیں۔ اب وہ پہلے جیسا زمانہ تو نہیں رہا جب بڑی بڑی حویلیاں ہوا کرتی تھیں اور کئی کئی خاندان مل کر رہتے تھے۔ اب تو تین چار سو گز کے مکان ہوتے ہیں۔ بمشکل تمام ایک ایک کمرہ ناکافی تو ہوگا۔'' میں نے پُر جوش لہجے میں تقریر کی۔

''خیر! اب اتنا ناکافی بھی نہیں ہے۔'' وہ بُرا مان گئے۔

''اچھا خاصا بڑا کمرہ ہے۔ امی نے سب سے بڑا کمرہ ہمیں ہی دے رکھا ہے۔''

''میں کب کہہ رہی ہوں کہ چھوٹا کمرہ ہے۔'' میں جلدی سے بولی۔ (کتنے دن کی کوشش کے

بعد تو آج بات بڑھی تھی۔)

''آپ یہ تو دیکھیے کہ یہاں ہمیں کتنی دقت ہوتی ہے۔ کوئی مہمان آئے تو کہاں بٹھاؤں۔ ڈرائنگ روم تو ایک ہی ہے نا۔ اس میں کبھی تو جاوید (دیور) کے دوست بیٹھے ہوتے ہیں تو کبھی سدرہ، فریدہ کی سہیلیاں ہوتی ہیں۔'' میری آواز میں رقت آگئی۔

''اپنے مہمانوں کو اپنے کمرے میں بٹھالیا کرو۔''

''ہر مہمان کو تو نہیں بٹھایا جاسکتا۔ ہر وقت یہ بچے کباڑ بھی تو پھیلائے رکھتے ہیں۔ صاف کرتے کرتے عاجز آجاتی ہوں۔''

''فلیٹ میں جائیں گے تو سب کیا سوچیں گے۔'' وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اُن کے والدین سے تابعداری کچھ زیادہ ہی تھی۔

''سوچیں گے کیا؟ لوگوں کے سوچنے کو چھوڑیں۔''

وہ تبسم آنٹی کی بیٹی فاطمہ تو شادی کے پانچ ماہ بعد الگ ہوگئی تھی۔ اور ناہید آپا کی بیٹی سیما نے آٹھ ماہ مشکل سے سسرال میں کاٹے اور.....''

''بس زیادہ مثالیں نہ دو۔'' انہوں نے تنگ آکر میری بات کاٹی۔

''مجھے معلوم ہے ایسی بیس مثالیں تم دس منٹ میں پیش کرسکتی ہو۔ لیکن اس سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے والدین کے ساتھ ہی رہ رہے ہیں۔''

''مجھے آپ سے یہی امید تھی کہ آپ کبھی بھی میرا ساتھ نہ دیں گے۔ ہمارے دس بچے ہوجائیں گے تب بھی یہی ایک کمرہ کا ڈبہ آپ کو اچھا لگے گا۔ حفظانِ صحت کے اصول معلوم ہیں آپ کو؟ ایک کمرے میں اتنے افراد کا سونا طبی نقطہ نظر سے سخت مضر ہے، جب سب کو ٹی بی ہوجائے گی تب آپ کو ہوش آئے گا۔'' مجھے غصہ آنے لگا۔ میں جذباتی ہوگئی۔

''اللہ نہ کرے۔'' وہ زیرِلب مسکرائے پھر بولے۔

''جب سے اس فلیٹ کی قیمت ادا ہوئی ہے تم وہاں رہنے کے لیے بے تاب ہو، چلو یہی سہی، امی بھی کہہ رہی تھیں کہ تم وہیں شفٹ ہوجاؤ۔ الگ رہو گے تو دو چار چیزیں بھی اکٹھی کرلو گے۔ ذمہ داری کا احساس بڑھ جائے گا۔'' انہوں نے

نوید دی تو میرے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ اشتیاق سے پوچھا۔
''امی نے کب کہا...... آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔'' میں اُن کے قریب آگئی۔
''اب تو خوش ہو۔'' انہوں نے میرا مسکراتا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔ اور پھر جلد ہی میں اپنے فلیٹ میں شفٹ ہوگئی۔ تین کمروں کا مختصر سا فلیٹ تھا، ایک چھوٹا سا ٹی وی لاؤنج......

میں نے جھٹ پٹ سامان ترتیب دے ڈالا۔ جہیز کا وہ قیمتی ڈھیر سارا سامان جو کمرے میں ٹھنسا ہوا تھا۔ اب اس گھر میں پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ بچوں کے بیڈروم کے لیے بیڈ خریدنا پڑے۔ تھوڑی بہت آرائشی چیزیں بھی لائی اب گھر مکمل طور پر آراستہ تھا۔ میرے خیالوں اور خوابوں کے مطابق میری خوشی دیکھ کر۔'' وہ بھی خوش تھے۔
ممکن ہے دل میں والدین سے جدائی کا صدمہ ہو لیکن کم از کم مجھ سے انہوں نے اس کا اظہار نہ کیا۔ اس بات میں تو واقعی کوئی جھوٹ نہ تھا کہ میرے سسرال میں سب بہت اچھے تھے۔ محبت کرنے والے لیکن مسئلہ وہی فلیٹ کا تھا۔ چڑیا بھی اپنا گھونسلہ بناتی ہے پھر میرے دل میں اپنے فلیٹ کو آباد کرنے کی خواہش کیوں نہ جاگتی۔ سو اپنے علیحدہ رہنے کے عمل پر میں متاسف نہ تھی۔
میرے سامنے والے فلیٹ کی ما کہ۔ مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ کھچڑی نما کٹے ہوئے بالوں، خوب باریک بھنوؤں والی خاتون مجھے پہلی نظر میں اچھی نہ لگیں۔ شوخ سے رنگوں والی ساڑی کے ساتھ انہوں نے خوب اونچا سا بلاؤز پہن رکھا۔ سانولا ڈھلکا ڈھلکا پیٹ دیکھ کر مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی۔ انہوں نے ٹرے میری طرف بڑھائی تو پُرتکلف سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آگئی۔
''میری بیٹی نیلم نے آپ کے لیے قورمہ اور بریانی بھیجی ہے۔''
''اس کی کیا ضرورت تھی؟''
''اب تو پڑوسی ہیں۔ یہ لین دین تو چلتا ہی رہے گا۔ دراصل نیلم کو کھانا پکانے کا بہت شوق ہے۔'' میں نے انہیں اندر بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ چند لمحے ہی بیٹھیں۔
''پھر کبھی آؤں گی، آج تو بس یہ دینے آئی تھی۔''

کھانے کے ساتھ میں نے ان کے ہاں سے آیا قورمہ اور بریانی بھی رکھا۔ پتلا پانی سا شوربہ اور چند بوٹیاں تیر رہی تھیں۔ بریانی بھی کچی تھی، ایک کنی کی کسر رہ گئی تھی۔ فیصل نے ایک نوالہ چکھ کر چھوڑ دیا۔ اُن کا منہ بن گیا۔
''کس قدر خراب طریقے سے پکایا ہے۔ اس سے اچھی تو تمہارے ہاتھ کی پکی ہوئی دال اور سبزی ہوتی ہے۔''
میں نے پیار اور محبت سے اُن کی طرف دیکھا۔ یہ سچ تھا کہ اُن کی حوصلہ افزائی اور تعریفوں کی وجہ ہی سے میں کھانے پکانے پر خاص توجہ دیتی تھی اور اسی لیے اب بہت اچھا پکانے لگی تھی۔ ورنہ شادی سے پہلے انڈا تلنے، آلو ابالنے کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔
شام کو نیلم مجھ سے ملنے آگئی۔ میرے تصور میں کوئی کمسن، نوخیز سی لڑکی تھی۔ لیکن وہ تو پچیس چھبیس سال کی لڑکی تھی۔ جو کمسن بننے کی ناکام کوشش کررہی تھی کھلے بالوں کے ساتھ براؤن سوٹ میں ملبوس وہ خاصی الہڑ لگ رہی تھی۔
''اندر فیصل کسی کام سے آئے۔''
''السلام وعلیکم بھائی جان!'' انہوں نے

اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔ سر ہلا کر گویا سلام کا جواب دیا اور واپس اندر چلے گئے۔

مجھے اپنے شوہر کی یہ عادت بڑی پسند تھی۔ غیر لڑکیوں کو دیکھ کر ہمیشہ نظریں نیچی کرلیا کرتے تھے۔ خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کبھی نہ کرتے۔ میری نندیں، سدرہ، فریدہ ہمیشہ اپنے بھائی کی تعریفیں کیا کرتیں۔ اُن کے بدھوپن اور شرافت کے کئی قصے میں سن چکی تھی۔ ساس بھی ایسی ہی باتیں کرتی تھیں۔ مثلاً شادی سے قبل کئی تصویریں اُن کو دکھائی گئیں کہ اُن کی پسند ہی سے شادی طے کی جائے گی۔ کوئی تصویر پسند کرلیں لیکن انہوں نے سب کچھ اپنی والدہ اور بہنوں کی پسند پر چھوڑ دیا۔ اور یہ کہ محلے کی ایک لڑکی نایاب انہیں بہت چاہتی تھی۔ وہ گھر میں ہوتے تو بار بار بہانوں سے چکر لگاتی۔ کئی مرتبہ خط بھی بھجوائے لیکن وہ اس کے معاملے میں ہمیشہ مٹی کے مادھو بنے رہے۔ اُسے نظر اُٹھا کر دیکھتے تک نہ تھے۔

''شکل کی اچھی نہ ہوگی۔'' میں نے حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا۔

''ارے نہیں۔'' انہوں نے فوراً تردید کی۔

''ایسی خوبصورت لڑکی تھی کہ کیا بتاؤں، عادات و اطوار بھی بہت اچھے تھے۔ بہت ہی پیاری بچی تھی۔ ہمارے پورے ہی گھر پر عاشق تھی۔ کپڑے سینا بہت اچھے آتے تھے۔ زبردستی میرے اور بچیوں کے کپڑے سینے کے لیے لے جاتی۔ یہ سوٹ جو میں پہنے ہوئے ہوں یہ بھی اسی کے ہاتھ سِلا ہوا ہے۔ وہ آجاتی تو مجھے کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ میں روٹی پکا رہی ہوتی تو زبردستی خود پکانے بیٹھ جاتی۔''

وہ کہیں دور خیالوں میں کھوگئیں۔ اُن کی اتنی تعریفوں سے میں دل ہی دل میں جل سی گئی۔ لیکن بظاہر مسکرا کر بولی۔

''جب اتنی اچھی لڑکی تھی، شکل کی بھی، سیرت کی بھی اور آپ سب کو اتنا چاہتی بھی تھی تو آپ نے فیصل سے اس کی شادی کیوں نہ کردی۔''

''میں تو ضرور کردیتی لیکن بیٹی وہ ہماری ذات برادری کی نہ تھی۔ اور تمہیں پتا ہی ہے کہ ہمارے ہاں ذات برادری سے باہر آج تک کسی کی شادی نہیں ہوئی ہے۔'' وہ ایک سرد آہ بھر کر بولیں۔ فیصل کو لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

میرے میکے یعنی اپنی سسرال جاتے تو جس نشست پر جاکر بیٹھتے بس تادمِ آخر سر جھکائے وہیں بیٹھے رہتے۔ میری سہیلیاں کبھی کبھار مجھے بہت چھیڑتی تھیں۔

''تمہیں بھی نظر اُٹھا کر دیکھتے ہیں یا نہیں۔''

''مجھے کیوں نہ دیکھیں گے۔'' میں فوراً برا مان جاتی۔

''ظاہر ہے کہ اب کیا تمہیں بھی نہ دیکھیں گے۔'' وہ آنکھیں نیم وا کرکے میری طرف شرارت سے دیکھتیں تو میں جھنجلا جاتی۔

مجھے فلیٹ میں آئے بیس پچیس دن ہوچکے تھے۔ انہی دنوں تھکاوٹ کی وجہ سے میں بیمار ہوگئی۔ معمولی بخار اور جسم میں درد تھا۔ لیکن دل چند دن میکے میں رہنے کے لیے بری طرح سے چاہنے لگا۔

''فیصل میں ایک دو ہفتے امی کے ہاں جاکر رہوں گی۔'' میں نے اطلاع دی۔

''ایک دو ہفتے؟'' اُن کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میری شکل کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی نقاہت آگئی۔

''میں تمہیں جانے سے منع نہیں کر رہا ہوں لیکن تمہاری غیر موجودگی میں میرا کیا ہوگا؟'' انہوں نے تشویش سے کہا۔

''ایک دو ہفتے کی ہی تو بات ہے۔ میں فریزر میں کھانے پکا کر رکھ جاؤں گی۔ روٹی آپ بازار سے لے آیا کیجیے گا۔'' میں نے آسان سا حل پیش کیا۔ لیکن اُن کا چہرہ ویسا ہی متفکر رہا۔

''سوچ لو، مجھے بہت مشکل ہوگی۔''

''میں اپنے گھر رہنے چلا جاتا لیکن فلیٹ کو چھوڑا بھی تو نہیں جا سکتا۔'' ایک دو ہفتے کی تو بات تھی۔ میری نظر میں انتہائی معمولی امی کے ہاں جا کر اگلے ہی دن میں بھلی چنگی ہوگئی۔ فیصل سے روزانہ ہی فون پر بات ہو جاتی تھی۔ بے چارے آفس جاتے ہی پہلا کام یہ کرتے تھے کہ فون پر میری خیر و عافیت دریافت کرتے تھے۔

چار دن بعد میری طبیعت اُکتا گئی۔ اپنا گھر یاد آنے لگا۔ نجانے گھر کا کیا حال ہو رہا ہو۔ فیصل تو چیزیں پھیلانے میں انتہائی ماہر تھے۔ ایک چیز ڈھونڈنا ہوتی تو بیس چیزیں پھیلا دیا کرتے۔ میں واپس جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ فون پر انہیں نہ بتایا تاکہ اچانک دیکھ کر زیادہ خوشی ہو۔

دروازہ کھلا ہوا تھا میں دبے قدموں اندر گئی تاکہ انہیں حیران کر سکوں۔ وہ کچن میں تھے میرے چاروں بچے ڈرائنگ روم میں چھپ گئے تھے تاکہ انہیں ڈرا کر حیران کریں۔ لیکن اچانک میں خود حیران رہ گئی۔ وہ کسی سے مخاطب تھے۔ آواز اونچی ہی تھی۔

''اتنی تکلیف آخر آپ کیوں کرتی ہیں۔ مجھے سخت شرمندگی ہوتی ہے۔''

''بھائی جان! میں آپ کے لیے مچھلی پکا کر لائی ہوں کل آپ نے بتایا تھا ناکہ آپ کو مچھلی بہت پسند ہے۔'' نیلم نے کہا۔

''آپ کے ہاتھ سے پکی ہوئی ہر چیز مجھے بہت پسند ہے۔'' فیصل کے لہجے میں بڑا پیار تھا۔ میں سن رہ گئی۔ ایسے تو کبھی مجھ سے نہ کہا تھا۔ کوئی جاہل عورت ہوتی تو شور مچا کر پورا محلہ جمع کر لیتی شاید میں بھی یہی کرتی لیکن پھر مجھے نیلم سے زیادہ اپنے شوہر کی عزت کا خیال آ گیا۔ اُن کی عزت میری عزت تھی۔

میں واپس مین دروازے تک پہنچی کس طرح پہنچی یہ نہ پوچھیں۔ کال بیل کئی مرتبہ بجائی۔ بچے بدستور اندر ڈرائنگ روم میں چھپے ہوئے تھے۔ میرے دل پر گزرنے والی قیامت سے بے خبر، میں اندر آئی تو فیصل سامنے تھے میں اُن کے کچھ کہنے سے پیشتر بیڈ روم میں جا کر گر گئی نیلم چپکے سے نکل گئی۔

''اچانک کیسے آ گئیں۔ مجھے فون کر دیتیں تو میں لینے آ جاتا۔'' میں آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ (بہروپیے کا چہرہ دیکھنے کو دل نہ چاہا)

''طبیعت کیسی ہے؟'' انہوں نے تشویش سے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

''چند دن اور وہاں رہ لیتیں۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

(مرد کتنا مکار اور ریاکار ہوتا ہے) کچھ دن بعد میں نے فیصل سے کہا۔

''میرا دل یہاں نہیں لگ رہا ہے وہیں جا کر رہتے ہیں۔ بچوں کو بھی سب لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ میں بھی کام کر کر کے اُکتا سی گئی ہوں۔ وہاں تو کام کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ سب مل جل کر کر لیتے تھے۔'' میں بڑے خوشگوار موڈ میں تھی۔ لیکن وہ جیسے اچھل سے گئے۔ برا سا منہ بنا کر بولے۔

''پہلے وہاں دل نہیں لگتا تھا۔ اب یہاں دل نہیں لگتا ہے۔ ہر وقت گھر میں گھسی رہتی ہو۔ کسی سے ملا جلا کرو آمنے سامنے والوں کے ہاں جایا کرو۔'' انہوں نے مشورہ دیا۔ (اس دن سے 'وہ'

آئی جو نہیں تھی)

''نہیں! میں یہاں نہیں رہوں گی۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

ہماری واپسی بڑی شاندار تھی سب نے خوشی خوشی استقبال کیا۔ میری ساس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

''مجھے معلوم تھا کہ میری بہو کا دل میرے بغیر نہیں لگے گا۔ ارے بھئی' یہ اتنا بڑا گھر بھی تم ہی لوگوں کا ہے۔ اگلے مہینے سے میں اوپری منزل بنوانا شروع کر رہی ہوں۔ اوپر تم رہنا، نیچے جاوید اور اُس کی دلہن رہیں گے، رہیں فریدہ اور سدرہ تو وہ کتنے دن کی مہمان ہیں۔ کچھ عرصے بعد اپنے گھر کی ہو ہی جائیں گی۔ اپنا فلیٹ تم لوگ چاہو تو کرائے پر دے دو۔''

میں ان کے کندھے سے سر ٹکائے آنسو بہائے جا رہی تھی۔ ابھی تک بات بھائی جان تک ہی محدود تھی۔ لیکن یہ بھائی...... لفظ بھی یقیناً میرے ایک دو مرتبہ میکے جانے کے بعد ہٹ جاتا فیصل کے 'جان' بن جانے میں تھوڑی سی کسر ہی رہ گئی تھی۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میں اس بات سے واقف ہو گئی۔ میں نے ڈسٹ بن میں پڑی مچھلی کے بارے میں دوسرے دن پوچھا۔ اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''میں بازار سے لایا تھا لیکن بُو آ رہی تھی۔ شاید باسی مچھلی تھی۔ اس لیے میں نے کوڑے میں پھینک دی کھاتا تو خوامخواہ طبیعت خراب ہو جاتی۔''

وہ مجھ سے زیادہ معصوم بن گئے تھے سچ کہہ دیتے تو مجھے اُن پر یقین آ جاتا۔ اب سسرال واپس آ کر میری اصلی شخصیت واپس آ گئی۔ میں نے سوچا ان پر جتا ہی دیا جائے کہ میں واپس کیوں آ گئی ہوں۔

ایک دن میں نے اُن سے کہا۔

''کسی دن مجھے آپ باسی نہ سمجھنے لگیے گا۔''

''باسی؟'' انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔

''تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' وہ واقعی کچھ نہ سمجھے تھے۔

''اس دن آپ نے تازہ مچھلی کو باسی سمجھ کر کوڑے دان میں پھینک دیا تھا۔ اب کہیں کسی دن مجھے باسی سمجھ کر نہ پھینک دیجیے گا۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، تم تو میری جان ہو۔''

اُن کی آواز دھیمی تھی مگر آنکھوں میں حیرت بھی تھی۔

میں نے مسکرا کر اُن کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ میں آپ کی جان ہوں لیکن اس سے پہلے کہ کوئی اور بھائی جان کہتے کہتے آپ کی جان بن جائے اور آپ کو تازہ کھانا ڈسٹ بن میں ڈالنا پڑے۔ بہتر ہے کہ میں اپنے بھرے پرے سسرال ہی میں رہوں۔'' انہوں نے گھبرا کر میری جانب دیکھا اور پھر وہی ازلی مردانگی دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟ بہت بری بات، بتایا بھی تھا کہ مچھلی اچھی نہیں تھی۔''

''میں آپ پر بالکل شک نہیں کر رہی...... لیکن بیوی ہونے کے ناطے میرا فرض ہے کہ نیلم جیسی شکاری خواتین سے اپنے بسے بسائے گھر کو بچا کر رکھوں۔'' یہ کہہ کر میں شرارت سے ہنسی تو جواباً وہ بھی ہنس پڑے مگر اُن کی ہنسی میں شرمندگی تھی۔ بس میرے لیے یہی کافی تھا ویسے بھی مجھے سبق مل گیا تھا کہ شوہر کو کبھی بھی اکیلے چھوڑنا نہیں چاہیے مگر ظاہر ہے انسان میکے جانا بھی نہیں چھوڑ سکتا تو ایسے میں سسرال میں ہی رہنا مناسب ہوتا ہے۔ ساس صاحبہ اگر بہو پر نظر رکھتی ہیں تو وہ اپنے بیٹے کی حرکتوں پر بھی کڑی نظر رکھتی ہیں اور یہی تو وہ نظر ہے جو گھر کو اور رشتوں کو بری نظر سے محفوظ رکھتی ہے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

نیئر شفقت

راج دُلاری بہنا...

''بہر حال...... جو بھی ہے اماں شادی تو میں بازل سے کروں گی۔'' راحمہ کے لہجے میں ہٹ دھرمی سی در آئی تھی۔ ''بھول جاؤ میری رانی۔'' اماں کے لہجے میں افسردگی تھی۔ شاید بیٹی کا دکھ اس کے دل میں کنڈلی مار کے بیٹھ گیا تھا۔ ''اس زندگی میں تو......

رات کی تاریکی میں وہ دو سائے اس تیسرے سائے کو بانہوں میں لیے گویا گھسیٹتے ہوئے لیے جا رہے تھے۔ وہ تیسرا سایہ پتہ نہیں بے ہوش تھا یا پھر ہوش و بے ہوشی کی سرحد پر تھا۔ رات ایسی تاریک تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہوا بھی دم سادھے ہوئے تھی۔ گویا کہ سانس لیا تو تاریکی کا فسوں بکھر جائے گا۔ گاؤں کے کتے بھی بھونکتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ اگر انہوں نے کوئی آواز نکالی تو شاید کوئی انہونی ہو جائے گی۔

ایسے میں وہ دونوں سائے تیسرے بے ہوش سائے کو سنبھالے تیز تیز چلتے ہوئے ہانپنے لگے تھے۔ گھر سے چلے ہوئے انہیں ابھی محض پندرہ منٹ ہوئے تھے مگر یہ پندرہ منٹ انہیں پندرہ صدیاں لگ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

سکینہ پانچویں بار امید سے ہوئی تھی۔ اس کی مناجات اور دعاؤں میں روز بروز شدت آتی جا رہی تھی۔ وہ ایک بیٹی کی چاہ میں پاگل ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے اللہ نے اسے چار بیٹے دیے تھے۔ وہ خود بھی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ ایک بہن ایک سکھی کی کمی اسے ساری زندگی شدت سے ستاتی رہی تھی۔

اور اب بیٹی کی صورت میں وہ اپنی اس کمی کی تلافی کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر اللہ پاک بھی نعمتیں عطا کیے جا رہا تھا اور چوہدری اکمل کا شملہ اونچا ہوئے جا رہا تھا۔ گو وہ کوئی روایتی زمیندار نہیں تھا۔ خود بھی بی اے پاس تھا اور بیوی بھی اس کی میٹرک پاس تھی۔ گاؤں کی کیمسٹری کے مطابق یہ دونوں پڑھے لکھے تھے۔ مگر بیٹے تو ایسی چیز ہوتے ہیں کہ ان کے حصول کے لیے انسان کچھ بھی کر گزرتا ہے اور یہاں تو وہ بن مانگے عطا کیے جا رہا تھا اور نعمتیں گھر میں آتی کس کو بری لگتی ہیں۔

دو بیٹوں کے بعد جب جب سکینہ امید سے ہوتی تھی تب تب اس کی دعائیں طویل ہوتی جا رہی تھیں۔ منہ سے تو چوہدری صاحب بھی یہی کہتے تھے کہ اللہ پاک رحمت کر دے مگر جب نعمت آتی تو چوہدری صاحب کا سینہ پھول جاتا۔

☆......☆......☆

تاریک رات لمحہ بہ لمحہ آگے سرک رہی تھی اور وہ ہانپتے سائے بھی ہولے ہولے آگے بڑھ رہے تھے۔

چند منٹوں کا وہ فاصلہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ مگر طے کردہ منصوبے کے تحت وہ فاصلہ انہیں طے کرنا ہی تھا۔ بس وہ ڈر رہے تھے کہ بے ہوش سائے کو کہیں ہوش نہ آ جائے اور وہ ہوش میں آ کر شور مچانے لگے اور سارا گاؤں اکٹھا ہو جائے کہ رات کے سناٹے میں تو سوئی گرنے کی آواز بھی بہت دور تک جاتی ہے۔

☆......☆......☆

چار بیٹوں کے بعد گھر میں ننھی پری کی صورت میں رحمت اتری تو انہوں نے اس کا نام بھی راحمہ رکھ دیا۔ عورتیں بیٹوں کی مائیں بن کر اتراتی پھرتی ہیں اور سکینہ بیٹی کی ماں بن کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ مکمل ہو گئی ہے۔ اس کی بہن اس کی دوست اُس کی سکھی اس کا دکھ سکھ بانٹنے کے لیے آ گئی ہے۔ چوہدری صاحب بھی بہت خوش تھے چار بیٹے تو تھے نا پھر ایک بیٹی کے آ جانے سے کیا فرق پڑتا۔

ننھی پری کے بھائی بھی بے حد خوش تھے۔ گڑیا سی بہن ان کے لیے جیتا جاگتا کھلونا تھی۔ جس سے کھیل کر وہ کبھی نہیں تھکتے تھے۔ اسکول جانے سے پہلے گڑیا سی راحمہ کو دیکھ کر جانا اور اسکول سے واپسی پر سب سے پہلے راحمہ کے حضور حاضری دینا یہ اُن کا معمول بن چکا تھا۔

وقت گزرتے کون سی دیر لگتی ہے۔ پاؤں پاؤں چلتی راحمہ پہلے اسکول داخل ہوئی اور پھر وقت کے تعاقب میں چلتی ہوئی کالج جا پہنچی۔ بڑے دونوں بھائیوں نے تو باپ کے ساتھ زمینداری کو ترجیح دی جبکہ چھوٹے دونوں بھائیوں نے مل کر بہت بڑا جنرل اسٹور کھول لیا۔ جہاں پچاس کے قریب تو ملازم تھے اور وہ خود ایئر کنڈیشن آفس میں بیٹھ کر نگرانی کرتے تھے۔ گاؤں بھی اب ٹپیکل گاؤں تو رہے نہیں تھے۔ یہ گاؤں بھی ایک بڑے قصبے یا چھوٹے سے شہر کی صورت اختیار کر چکا تھا اور جنرل اسٹور نہ صرف ان کے قصبے بلکہ آس پاس کئی گاؤں

کی ضروریات بھی پوری کرتا تھا۔

☆......☆......☆

بالآخر وہ اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔
''سب ٹھیک ہے نا۔'' آنے والے سایوں نے وہاں پہلے سے موجود سایوں سے سرگوشی کی۔
''ہاں سب ٹھیک ہے۔'' ان میں سے ایک نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔
''اس...... نے زیادہ اڑی تو نہیں دکھائی۔'' آنے والے سایوں میں سے ایک نے گالی دے کر پوچھا۔
''مزاحمت تو کافی کی مگر ہم دو تھے کیسے نہ ڈھے جاتا۔''
''چلو ٹھیک ہے...... اسے ہوش تو نہیں ہے نا۔''
''ہم نے اتنا مارا ہے کہ بے ہوش ہو گیا ہے۔''
''چلو پھر اپنا کام شروع کریں۔''
''ہاں چلو۔''

☆......☆......☆

وہ بہت دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ ایک موٹر سائیکل سوار اس کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے یونیورسٹی تک آتا ہے یونیورسٹی کا موڑ مڑتے ہی وہ غائب ہو جاتا ہے۔ شکل اُس کی وہ یوں نہ دیکھ سکی کہ اس نے ہیلمٹ پہنا ہوتا تھا۔ کسی وقت وہ اس کی گاڑی کے پیچھے ہو جاتا' کبھی برابر تو کبھی آگے' وہ دونوں یونیورسٹی ساتھ ہی پہنچتے تھے۔
ایک ڈیڑھ ماہ بعد اس کا صبر جواب دے گیا تو اس نے اس لڑکے کو پکڑنے کا ارادہ کر لیا۔ ڈرائیور چاچا سے کہہ کر اس نے کار وہیں رکوائی جہاں وہ لڑکا موٹر سائیکل کھڑی کر کے ہیلمٹ اُتار رہا تھا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر ایک مرتبہ تو راحمہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ وہ لڑکا تھا یا اپالو کا کوئی مجسمہ...... راحمہ کی طرف دیکھے بنا وہ ہیلمٹ بغل میں دبا کر یونیورسٹی کے کامرس ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل پڑا تو راحمہ کو ہوش آیا۔
''اے مسٹر۔'' اس نے اونچی آواز میں پکارا تو وہ مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں میں راحمہ کے لیے اجنبیت تھی۔ ایک دفعہ تو اس اجنبیت کو محسوس کر کے راحمہ ٹھٹک گئی۔ مگر پھر اسے اپنا واہمہ جان کر اس کے پاس جا کر بولی۔
''اے مسٹر...... تم اتنے دنوں سے میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو۔'' اس لڑکے کی آنکھوں میں حیرانی در آئی اور وہ اچنبھے سے بولا۔
''آپ کا پیچھا؟ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔''
''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔'' وہ کچھ اکڑ کر بولی۔
''تم سارنگ پور سے میرا پیچھا کر رہے ہو۔''
اب کی بار وہ لڑکا کچھ چونکا۔
''سارنگ پور؟ وہاں تو میں رہتا ہوں۔ گھر سے نکلتا ہوں تو سیدھا یونیورسٹی پہنچ کر دم لیتا ہوں...... مگر آپ؟'' اس نے ایک لحہ توقف کیا۔ پھر جیسے اُس کی سمجھ میں بات آ گئی۔ وہ دونوں ایک ہی قصبے کے باسی تھے۔ ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور تقریباً ایک ہی وقت میں یونی کے لیے نکلتے تھے اور راحمہ یہی سمجھ بیٹھی کہ وہ اس کا پیچھا کر رہا ہے۔
''تو آپ بھی سارنگ پور میں رہتی ہیں۔'' اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا تو راحمہ شرمندہ سی ہو گئی۔
''سوری...... اِٹ از جسٹ اے مس انڈرسٹینڈنگ......''
''اِٹ از او کے' کوئی بات نہیں ہو جاتا ہے ایسے...... ویسے آپ کس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں اور کیا کر رہی ہیں۔''

☆......☆......☆

''ایسے کب تک چلے گا بازل...... چھ مہینے ہو گئے ہیں ہمیں ملتے ہوئے اور اب تو تمہارا بی ایس بھی مکمل ہونے والا ہے۔''
''پھر؟'' وہ ملاقات ان کی محبت کا آغاز بن گئی تھی۔ پسندیدگی محبت میں ڈھلی تھی اور محبت دن بدن

بڑھتی جارہی تھی۔

''پھر کیا میری جان......'' بازل نے اس کا جملہ اُچک لیا۔

''پھر مجھے نوکری مل جائے گی تو میں تمہارے گھر رشتہ بھیج دوں گا۔تم اس دوران اپنا ماسٹرز مکمل کرلو اور میں نوکری ڈھونڈتا ہوں......ٹھیک......؟'' اور راحمہ پھر کسی انجانے دیس کے سپنوں میں کھوگئی۔

راحمہ کے ماسٹرز کرنے سے پہلے ہی بازل کو نوکری مل گئی اور ساتھ ہی اس نے ایم فل میں ایڈمیشن بھی لے لیا۔اب وہ یہی چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد راحمہ کے گھر رشتہ بھیج دیا جائے۔اسے ڈر تھا کہ راحمہ کے والدین اس کا رشتہ کہیں اور نہ طے کردیں۔مگر راحمہ ابھی ہچکچا رہی تھی۔اسے اب احساس ہورہا تھا کہ اس کے اور بازل کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ ذات پات ہے۔وہ لوگ اونچی ذات کے زمیندار تھے جبکہ بازل کے والدین کمی کمین کہلاتے تھے اوران کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔یہ بازل ہی تھا جو پڑھ لکھ کر بڑا افسر بننے کے خواب دیکھتا تھا۔دل لگاتے وقت ذات پات کی باتیں کون سوچتا ہے۔یہ سب کچھ تو بعد میں سمجھ آتا ہے۔راحمہ چاہتی تھی کہ پہلے ماں کو بتا کران کا عندیہ لے لیا جائے پھر آگے کا سوچتے ہیں۔اس اثناء میں وہ اپنا ماسٹرز بھی مکمل کرلے گی۔اسے یقین تھا کہ بازل کا اچھا مستقبل دیکھتے ہوئے اس کے والدین کبھی انکار نہیں کریں گے۔ویسے بھی وہ کوئی روایتی زمیندار نہیں تھے۔پڑھے لکھے اور آج کے دور کے تقاضوں کو سمجھنے والے لوگ تھے۔مگر......سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہوتو پھر بات ہی کیا ہے۔

ابھی امتحانات میں چھ ماہ رہتے تھے جب راحمہ کے لیے سجاد کا رشتہ آیا۔تھا تو غیر خاندان کا مگر ذات برادری ایک تھی۔باہر سے پڑھ کر آیا تھا۔اچھی نوکری پر لگا ہوا تھا۔اس کے والدین بھی زمیندار تھے۔سو اس کے والدین کی ہاں میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔مگر راحمہ گھبرا گئی اوراس نے بازل کو فون کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا اور تاکید کی کہ وہ جلد از جلد اپنا رشتہ بھیج دے۔آگے کیا ہوگا اس نے ابھی کچھ نہیں سوچا تھا مگر وہ بازل کے لیے اسٹینڈ لینے کو تیار تھی۔

بازل کے گھر والے تو پہلے ہی تیار تھے سو مٹھائی کے ٹوکرے لے کر راحمہ کا رشتہ لینے آگئے۔راحمہ کے والدین نے بڑے آرام وسکون سے ان کی بات سنی اور بڑے احترام سے یہ کہہ کر انہیں رخصت کردیا کہ وہ راحمہ کا رشتہ پکا کرچکے ہیں اور جلد ہی شادی بھی ہوجائے گی۔

پڑھی لکھی راحمہ کو یہ کیسے گوارا ہوسکتا تھا کہ اس سے پوچھے بنا اس کا رشتہ طے کردیا جائے۔سو اس نے اپنی مرضی ماں کو بتانے میں دیر نہ کی۔

''اماں شادی میں کروں گی تو صرف بازل سے ......آپ اباجی کو اور بھائیوں کو بتادیں۔'' اس نے بہادری دکھاتے ہوئے کہا ورنہ اندر سے تو وہ بے حد ڈری ہوئی تھی کہ ہر مشرقی اور عزت دار لڑکی ایسی بات کرتے ہوئے نہ صرف جھجکتی ہے بلکہ ڈرتی بھی ہے کہ کہیں باپ بھائیوں کی غیرت نہ جاگ جائے۔ مگر اپنا حق استعمال کرنا بھی ضروری تھا کہ وہ آج کے دور کی پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی تھی۔

''چپ کرجا دھیے۔'' ماں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سختی سے کہا۔

''تیرے باپ اور بھائیوں کو پتہ چل گیا تو وہ تیرے ٹوٹے کردیں گے۔''

''اماں! میں پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ میں کس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔'' اس نے کچھ قطعیت سے کہا۔

''اور پھر بازل میں کیا برائی ہے؟''

"پڑھ لکھ ضرور گئی ہے پر ہے تو لڑکی نا...... جس کی قسمت کے فیصلے اس کے بھائی اور باپ ہی کرتے ہیں۔"

"انہوں نے تو مجھ سے بھی رائے لینا مناسب نہیں سمجھا۔ بس بتادیا تھا کہ ہم نے سجاد سے راحمہ کا رشتہ پکا کردیا ہے۔" ماں نے اسے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

"باقی جہاں تک بازل کی بات ہے اس میں کوئی خرابی یا برائی نہیں ہے۔ بس وہ ہماری ذات برادری کا نہیں ہے۔"

"میں نہیں مانتی ذات برادری کو اماں...... تعلیم نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔"

"تعلیم تو اور بھی بہت کچھ سکھاتی ہے دھیے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں تعلیم کو اپنی مرضی سے استعمال کیا جاتا ہے۔"

"بہرحال...... جو بھی ہے اماں شادی تو میں بازل سے کروں گی۔" راحمہ کے لہجے میں ہٹ دھرمی سی در آئی تھی۔

"بھول جا دھی رانی......" اماں کے لہجے میں افسردگی تھی۔ شاید بیٹی کا دکھ اس کے دل میں کنڈلی مار کے بیٹھ گیا تھا۔

"اس زندگی میں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں اُس زندگی میں وہ ضرور تیرا ہو جائے گا۔" ماں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں اماں میں اسی زندگی میں اسے پاؤں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ...... اور آپ دیکھ لینا۔" اس کے لہجے میں عزم ہی نہیں تھا ایک اور شے بھی تھی جسے محسوس کرکے ماں کا دل لرز اٹھا۔

"نہ، نہ دھیے، کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھانا جس سے تیرے باپ اور بھائیوں کے شملے نیچے ہوں۔"

"تو پھر یہ بات اباجی کو سمجھا دیں۔" وہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔

لیکن اباجی کو سمجھانا تو دور کی بات انہیں بتانے کا حوصلہ بھی اماں بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اباجی کو پتہ چل گیا۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ راحمہ اور بازل کا عشق بھی ظاہر ہوگیا۔ راحمہ بازل سے فون پر بات کر رہی تھی اور وہ باتیں بڑے بھائی نے سن لیں اور انہوں نے جاکر اباجی کو بتادیا۔ اباجی نے کسی سے بھی پوچھے گچھے بغیر سجاد کے گھر والوں کو تاریخ دے دی کہ بارات لے آؤ۔"

راحمہ کو تو مانو پتنگے لگ گئے۔ وہ کسی صورت سجاد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بازل سے چھپ کر بھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر کرے تو کیا کرے۔ بازل سے فون کا رابطہ بھی منقطع ہو چکا تھا کہ بھائی جی نے سب سے پہلے سیل فون ہی اپنے قبضے میں کیا تھا۔ بالآخر سوچ بچار کے بعد اس نے موقع پا کر لینڈ لائن نمبر سے سجاد کو کال کی۔ نمبر وہ پہلے ہی بھائی جی کے فون سے نکال چکی تھی اور اسے صاف لفظوں میں بتادیا کہ وہ بازل کو پسند کرتی ہے اور کسی صورت اس سے شادی نہیں کرسکتی۔ بہتر یہی ہوگا کہ وہ خود ہی شادی سے انکار کردے۔

سجاد کم ظرف آدمی تھا۔ اس نے ساری صورتِ حال گھر والوں کے گوش گزار کیں اور گھر والے زبان کے اسلحے سے لیس ہو کر انکار کرنے آ پہنچے۔ گولہ باری تو خوب ہوئی مگر راحمہ کی جان اس کم ظرف آدمی اور اس کے گھر والوں سے چھوٹ گئی۔ سجاد اور اس کے گھر والوں سے تو راحمہ کی خلاصی ہوگئی۔ مگر اس کے اپنے گھر والوں نے اس کے وہ لتے لیے کہ بس...... راحمہ سب کچھ صبر و برداشت سے سنتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ گرد بیٹھ جائے تو پھر بازل سے رابطہ کرے گی۔

لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ یہ گرد گرد نہیں ہے بلکہ گرد

کا بگولا ہے جو اس کا سب کچھ اڑا کر لے جائے گا۔

اس کے گھر والوں کو بڑی اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ ایک رشتے کو انکار کر سکتی ہے تو دوسرے رشتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ عین وقت پر نکاح سے انکار کر دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھاگ کر شادی کر لے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ وہ یہ بھی تو سوچ سکتے تھے کہ ان کی بیٹی اور بہن صرف اپنا حق جائز طریقے سے مانگ رہی ہے ورنہ بھاگ کر شادی کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ تو نہ تھا۔ وہ تو صرف وہی حق استعمال کر رہی تھی جو اسلام نے اسے دیا تھا مگر پڑھ لکھ کر ذہنیت تو نہیں بدل سکتی نا...... جب تک کہ شعور نہ آئے اور اسی جہالت میں انہوں نے وہ فیصلہ کیا کہ دورِ جاہلیت کی یاد تازہ کر دی۔

دو بھائیوں نے بے ہوش بازل کو پکڑ رکھا تھا اور دو نے ہوش و بے ہوشی کی سرحد پر کھڑی راحمہ کو...... چھپ کی آواز سے راحمہ کی آنکھیں تھوڑی کھلیں۔

''کیا کر رہے ہو آپ بھائی؟'' اس نے اٹکتے لہجے میں پوچھا اور یہ کونے میں کیا گرا ہے؟'' دونوں بھائیوں نے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے اوپر اٹھایا۔ راحمہ کے شعور کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

''نہیں بھائی نہیں۔'' وہ بے اختیار چلائی ساتھ ہی اُس کی آنکھوں میں ایک منظر در آیا۔ بچپن کا منظر۔

''نہیں بھائی نہیں...... میں گر جاؤں گی بھائی۔''

چاروں بھائی ہنسنے لگے تھے۔ اماں ہم اِسے کنویں میں پھینکنے لگے ہیں۔ تیسرے نمبر والے بھائی نے چلا کر اماں کو بتایا تو وہ انہیں کوسنے لگیں۔

''اوئے تہاڈا بیڑہ ترے...... شرم تو نہیں آتی بہن کو تنگ کرتے ہوئے۔''

وہ سب کنویں کے پاس پکنک منانے آئے ہوئے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور شہر سے خالہ ماموں بچوں سمیت آئے ہوئے تھے۔ بادل گھر کر آئے ہوئے تھے تو سبھی نے کنویں کے پاس پکنک کا پروگرام بنا لیا۔ بڑی ہری بھری جگہ تھی کنویں کے پاس' درختوں کی چھاؤں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں مزہ آ گیا تھا سب کو' ایسے ہی ہلے گلے میں بھائیوں کو جو شرارت سوجھی تو انہوں نے راحمہ کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور لگے کنویں کی طرف جھولا دینے راحمہ اس وقت گیارہ بارہ سال کی ہو گی۔ اس کے تو مانو رنگ اڑ گئے وہ چلانے لگی۔

''نہیں بھائی نہیں کرو...... میں گر جاؤں گی۔''

وہ چیخ رہی تھی۔ بھائی اور سب کزنز اس کی حالتِ زار پر ہنس رہے تھے۔

چشمِ زدن میں منظر بدلا...... بازل کو کنویں میں پھینکنے کے بعد اب وہ راحمہ کو کنویں کی طرف لے جا رہے تھے اور وہ نہیں نہیں کی تکرار کیے جا رہی تھی۔

''کیا' وہ' تقدیر کا فیصلہ تھا جس پر عمل در آمد اب ہونے جا رہا تھا۔'' اس کا ذہن سوچوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

''وہ...... مذاق تھا یہ زندگی میرے ساتھ اب مذاق کرنے جا رہی ہے۔'' وہ لوگ کنویں کی منڈیر کے پاس پہنچ چکے تھے۔ راحمہ نے یکبارگی پوری طرح آنکھیں کھول کر بھائیوں کو دیکھا۔

''بھائی اگر آپ لوگ مجھے اس وقت ہی کنویں میں پھینک دیتے تو مجھے دکھ نہ ہوتا۔ اگر آپ نے یہی کچھ کرنا تھا تو اس وقت ہی پھینک دیتے کسی کو شک تو نہ ہوتا اور آپ پر کوئی آنچ بھی نہ آتی۔ دنیا میں بھی سرخرو رہتے اور آخرت میں بھی کہ مذاق میں بہن ہمارے ہاتھ سے پھسل کر کنویں میں گر گئی مگر اب نہ میں آپ کو معاف کروں گی اور نہ......''

چھپ کی آواز آئی اور خاموشی چھا گئی موت کی خاموشی......

☆☆......☆☆

افسانہ

روبینہ شاہین

صحرا میں بارش

''رابیل تُو مجھے بے جان پتھر لگتی ہے تجھے صرف اپنے لکڑی اور کپڑے کے بنے ہوئے مسافر کی فکر ہے باقی سب جائیں جہنم میں، میں تو جاتی ہوں یہ زیور تیرے بابا کو دوں تو اس بارش کے مسافر کو سجاتی سنوارتی رہنا اور کچھ کام نہ کرنا'' نوری رابیل کو......

کچے گھاس پھونس کے گھروندوں جیسے گھر اور ان گھروں میں پیاس، بیماری اور بھوک سے لڑتے زندہ وجود گرم تپتی دھوپ اور ویرانی یہ ہے تھر......

گرم ہوا اور گرد و غبار کے ساتھ بارش کے لیے دعا کرنے والے ہاتھوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دھوپ سے پریشان پرندے سوکھے درختوں کی پتوں سے خالی شاخوں پر بیٹھے اپنی سوکھی زبانوں سے بارش کی دعائیں مانگتے ہوئے محسوس ہوتے۔

ایک چھوٹی سی کٹیا میں بیٹھا ملنگ سائیں بھی آنکھیں بند کیے اپنے وظیفے اور عملیات پڑھتا رہتا۔

اور رابیل موسم کی شدت سے بے فکر برسات کے لیے کی جانے والی دعاؤں سے بے خبر تپتی دھوپ میں بیٹھی برسات کا مسافر بنا رہی تھی۔

''رابیل تو چری (پاگل) ہے۔ یہ بارش کا مسافر تو بارش جب بہت ہو جاتی ہے تو اسے روکنے کے لیے بناتے ہیں یہاں تو سالوں گزر گئے بارش کی بوند نہیں پڑی اور تُو نے بارش روکنے کے لیے مسافر بھی بنا دیا تُو دعا کر اللہ سائیں ہمارے تھر میں بارش کر دے جل تھل ہو جائے کھیت ہرے ہو جائیں جانوروں اور انسانوں کی پیاس بجھ جائے سچ کہتی ہوں اگر اور وقت گزر گیا تو لوگ بھوک پیاس سے مر جائیں گے۔'' رابیل کی ماں نوری نے ایک لاغر سی بکری کو دھوپ سے کھول کر چھپر کے نیچے باندھتے ہوئے کہا۔

''اماں! تُو فکر نہ کر مرنا تو ہم غریبوں کو ہوتا ہی ہے سوکھے سے مریں۔ بیماریوں سے مریں کھانے کی کمی سے مریں یا سیلاب کے پانی میں ڈوب کر مر جائیں جو تو ہر وقت بارش بارش کرتی رہتی ہے اس برسات سے بھی ہمارے حالات نہیں بدلیں گے کھیت ہرے بھرے ہو بھی گئے، فصل اچھی ہو بھی گئی تو کیا ہوگا وہ بھی سب سائیں لوگوں کے پاس چلا جائے گا کیونکہ ہم پر قرض ہی اتنا ہے اور ایک قرض ادا نہیں ہوتا کہ دوسرا لینا پڑتا ہے ہمارے گھر اور ہمارے پیٹ تو پھر بھی خالی

رہیں گے ہمارے جسم پر تو پھٹے پرانے کپڑے ہی ہوں گے۔''

رابیل نے چھوٹی سی آٹے کی پوٹلی بارش کے مسافر کے کندھے پر لٹکائی تو اُس کی ماں چیخ پڑی۔

''ارے لڑکی کچھ خیال کر گھر میں کھانے کو نہیں ہے اور تُو اپنے اس مسافر کو آٹے کی پوٹلی بنا کر دے رہی ہے اور میرل کے کپڑے بھی اسے پہنا دیے ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بھائی غلام حسین سے قرض لے کر یہ کپڑے بنائے تھے۔ تُو جتنی بڑی ہے اتنی ہی کم عقل ہے اللہ سائیں اس لڑکی کو عقل دے۔''

رابیل بالکل خاموش تھی اس پر ماں کی چیخ و پکار کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا وہ کسی آرٹ گیلری میں رکھی تصویر لگ رہی تھی ایسی بھوک و افلاس کی تصویر جسے بیچ کر فن کے ٹھیکیدار مالدار ہو جاتے ہیں لیکن یہ لوگ اُسی طرح افلاس اور بھوک کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں۔

''رابیل یہ اپنے کانوں کی بالیاں دے تمہارا بابا شہر زیور بیچنے جا رہا ہے تاکہ کچھ گھر کے خرچ کا بندوبست ہو سکے۔''

''اماں بابا کیا سارا زیور بیچ دیں گے۔'' رابیل نے سوال کیا۔

''ہاں دھی (بیٹی) کچھ ضرورت ہی ایسی پڑ گئی ہے سارے جانور مر گئے کھیت اُجڑ گئے کنویں سوکھ چکے اور بارش اب تک نہیں ہوئی

گاؤں سے بہت سارے لوگ دوسرے علاقوں میں چلے گئے ہم تو اس امید پر یہاں ہیں کہ آج نہیں تو کل بارش ہوگی ہم پھر ان ویران کھیتوں کو آباد کریں گے۔ مال مویشی ختم ہوگئے اللہ سائیں ہمارے آنگن مویشی اور جانوروں سے بھر دے گا۔''

''ملنگ سائیں کہتا ہے کہ پیلو کے درخت پر جب تک کوئل بولتی رہے گی بارش کی امید باقی رہے گی لوگوں نے کہا گاؤں چھوڑ دو ہم یہ گاؤں کیسے چھوڑ دیں اس گاؤں میں یہاں ہمارے خواب ہیں یادیں ہیں اور پھر ہمارے پیاروں کی قبریں ہیں آج اگر یہ دھرتی ماں ویران ہوگئی تو کیا ہم اسے چھوڑ دیں بالکل نہیں اس وقت تو دھرتی کو ہمارے سہارے کی ضرورت ہے ہم اس دھرتی کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔'' نوری کی آنکھوں میں آنسو جگمگانے لگے۔

''رابیل تُو مجھے بے جان پتھر لگتی ہے تجھے صرف اپنے لکڑی اور کپڑے کے بنے ہوئے مسافر کی فکر ہے باقی سب جائیں جہنم میں، میں تو جاتی ہوں یہ زیور تیرے بابا کو دوں تو اس بارش کے مسافر کو سجاتی سنوارتی رہنا اور کچھ کام نہ کرنا۔'' نوری رابیل کو برا بھلا کہتی چلی گئی اُسے کون بتاتا کہ وہ جس رابیل کو پتھر سمجھتی ہے وہ ایک جیتی جاگتی اور حساس لڑکی ہے۔

اس کے جذبوں میں صحرا کے موسموں کی سی شدت ہے جب اُسے تکلیف یا دُکھ پہنچتا ہے تو وہ صحرا کی ریت کی طرح بکھر جاتی ہے اور جب خوش ہوتی ہے تو اُس کا وجود تھر کے موروں کی طرح چہکتا اور ناچتا ہے لیکن وہ اپنے ان جذبوں کا اظہار نہیں کر پاتی وہ اپنے جذبوں کو اپنے اندر محدود رکھتی ہے جذبوں کے اظہار کے لیے اُس کی زمین بنجر ہے وہاں کچھ بھی نہیں ہے صرف 'سوکھا' (قحط) ہے۔

''اماں! دیکھو کوے نے کوئل کو زخمی کر دیا میں اسے اُٹھا لایا ہوں تم اسے مرہم لگا دو۔'' میرل نے زخمی کوئل کو ماں کے ہاتھوں میں دیا۔

''ہائے کیسا زخمی کیا ہے ظالم نے۔'' رابیل کی ماں نے کوئل کے جسم سے بہتے خون کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

'' اللہ سائیں خیر کرے اب تو لگتا ہے برسات کی امید بھی گئی۔''

''نہیں ماں تم مرہم لگا دو کوئل ٹھیک ہو جائے گی۔'' میرل نے ماں کو حوصلہ دیا۔

''اے رابیل بے خبر لڑکی کچھ کرو چھوڑو یہ اپنے بے کار کام، مرہم لاؤ اِس زخمی کوئل کو لگاؤں۔'' رابیل کو نوری نے ڈانٹا تو وہ مرہم ڈھونڈنے چلی گئی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ خشک زمین پتھر ہوتی جا رہی تھی۔

''رابیل کے بابا شہر سے آ گئے کیا؟ گھر کے خرچ کا انتظام ہوا؟'' نوری نے امر خان کے گھر میں داخل ہوتے ہی سوالات شروع کر دیے۔

''اے چری زال (پاگل عورت) مجھے سانس تو لینے دے، گیا تھا میں شہر زیور بیچنے لیکن وہاں تو بہت بُرے حالات ہیں۔ لوگوں کو نامعلوم لوگ گولیوں سے چھلنی کر دیتے ہیں ذرا سی دیر میں بازار کے بازار بند کرا دیتے ہیں کہیں پر خودکش حملے کیے جا رہے ہیں۔ لوگوں کو اغواء کر کے اُن کو مار کر سڑکوں پر پھینک دیا جاتا ہے۔'' امر خان نے افسردگی سے بتایا۔

''لگتا ہے شہر میں بھی قحط پڑ گیا ہے محبت کا اپنائیت کا اور چاہتوں کا قحط۔'' نوری نے شہر کے حالات پر تبصرہ کیا۔

"واہ سائیں واہ آج تو تم پڑھے لکھوں جیسی باتیں کررہی ہو۔" امرخان نے شرارت بھرے انداز میں نوری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری تعریف کرنا چھوڑو یہ بتاؤ گھر کے خرچ کا بندوبست ہوا۔"

"شہر میں بازار بند تھے میں اپنے دوست نورل شاہ کے گھر چلا گیا تھا وہاں اُس کا دوست آیا ہوا تھا۔ جو خود بھی باہر آتا جاتا ہے اور بچوں کو بھی دوسرے ملک میں بھیجتا ہے۔"

"اللہ توبہ یہ آدمی بچے اغواء کرنے والا ہے اسے تو پولیس میں پکڑانا چاہیے۔" نوری نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے مشورہ دیا۔

"ارے کوئی بات چپ کرکے بھی سنا کرو ہمیشہ بیچ میں بولتی ہو۔" امرخان جھنجلا گیا۔

"وہ آدمی بچوں کو باہر لے جا کر انہیں نوکری دلاتا ہے میں نے بھی میرل کی بات کی ہے اِسے باہر بھیج دیں گے تو ہمارے حالات بھی بدل جائیں گے اور اس کی زندگی بھی بن جائے گی۔" امرخان کی آنکھوں میں آنے والے اچھے دنوں کے خواب چمک رہے تھے۔

"نہیں رابیل کے بابا میں اپنے بچے کو دوسرے ملک نہیں بھیجوں گی وہ تمہیں دوسرے ملک میں نوکری کیوں نہیں دلاتا۔"

"اے بے وقوف عورت وہ آدمی کہتا ہے کہ صرف چھوٹے بچوں کو نوکری ملتی ہے اور اُن بچوں کو کرنا بھی کیا ہے اُن کی بیگم کے چھوٹے موٹے کام یا پھر اُن کے بچوں کے ساتھ کھیل کود کریں گے۔ رہائش، کھانا، کپڑا اور تنخواہ الگ ملے گی دنوں میں ہمارے حالات ٹھیک ہوجائیں گے۔"

"بابا کچھ بھی ہو میں اپنے بھائی کو نہیں جانے دوں گی وہ چھوٹا ہے ہم یہاں خوش ہیں۔ یہی تو مشکل ہے نا کہ کبھی کبھی ہمیں بھوکا رہنا پڑتا ہے۔ تو کیا ہوا ہم سب ساتھ تو ہیں۔" رابیل نے باپ کو قائل کرنا چاہا۔

"تم اپنے سامنے اپنے بھائی کو بھوک سے مرتا دیکھ سکتی ہو لیکن اُسے دوسرے ملک نہیں جانے دوگی لیکن میرا فیصلہ سن لو کہ میرل کو میں نوکری کے لیے ملک سے باہر بھیجوں گا۔ اس طرح ہمارے حالات بہتر ہوجائیں گے۔ ہمارے بچوں کا آنے والا کل بہتر ہوگا ہم سب اچھی زندگی گزاریں گے۔"

"میرل کے بابا کچھ تو خیال کرو میں بچے کو خود سے کیسے الگ کروں گی مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا۔" نوری نے بھیگی آنکھوں سے فریاد کی۔

"اے کم عقل عورت یہ بچہ ہمارے سامنے بھوک یا بیماری سے مرجائے تو صبر کرلے گی لیکن وہ اگر ہم سے دور بہتر زندگی گزارے تو یہ تجھے قبول نہیں یہ لے پکڑ پچاس ہزار روپے رکھ یہ ایڈوانس ہے۔ جب تیرا بیٹا نوکری کرے گا تو پھر ہر مہینے رقم وصول کرنا اب خوش ہوجا۔" امرخان نے نوٹوں کی گڈی نوری کے سامنے لہرائی اور وقت کا پرندہ پرواز کرنے لگا دن لمحوں کی طرح گزرنے لگے میرل اپنے وطن سے دور ماں باپ کی خواہشات کی تکمیل کے تعاقب میں دوڑتے اونٹوں کے جسموں سے چپک کر تپتے صحرا کا سفر کررہا تھا۔

اپنے دیس میں خالی پیٹ تپتی زمین پر بھی نیند آجاتی تھی اور یہاں وطن سے دور صحرا میں یہ حال تھا کہ اے سی والے ٹھنڈے کمرے میں بھی نیند آنکھوں سے بہت دور رہتی ہے۔ میرل ایسی بہت سی بے نام سوچوں کی لہروں میں ڈوبتے ابھرتے نا معلوم کب اس مجبور اور بے بس بچے کو

نینداپنی آغوش میں لے لیتی۔
امرخان کے گھر کے حالات بہت بدل چکے تھے نوری کو اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے قرض مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔
اب تو گھر میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی امرخان نے گھر بھی بنوالیا تھا لیکن پانی کی کمی کا مسئلہ اب بھی تھا اسی لیے امر شہر میں مکان خریدنا چاہتا تھا لیکن نوری کی مرضی تھی کہ وہ اپنا تھر نہیں چھوڑے گی کیونکہ اُسے اپنے تھر سے محبت تھی شدید محبت......
رابیل کے شب و روز اب بھی نہیں بدلے تھے۔ وہ گھر کے کاموں سے فرصت پاتے ہی بارش کے مسافر کو سجاتی سنوارتی میرل کے کپڑے اُسے پہناتی اور مسافر کی پوٹلی میں آٹا بھی ماں کے سامنے باندھتی اور نوری بھی رابیل پر غصہ نہیں کرتی تھی۔
بلکہ مسکراتے ہوئے کہتی اس بارش کے مسافر کو اپنے ساتھ اپنے سسرال لے جانا اور رابیل شرماتے ہوئے اپنی چنری کا کونا اپنے ہونٹوں میں دبا لیتی۔
بادل روز گھر گھر کر آتے تھے اور بنا برسے ہی لوٹ جاتے بارش کے لیے دعا مانگنے والے ہاتھ شل ہونے لگے۔ ملنگ سائیں کی خاموشی گہری ہونے لگی تھی اور کوئل بے سبب ہی بولتی رہتی تھی۔
''نوری ایک اچھی خبر ہے۔'' امرخان نے نوری کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔
''کیا ہے وہ اچھی خبر؟''
''اچھی خبر یہ ہے کہ ہمارا میرل واپس آرہا ہے مجھے میرے دوست نے بتایا ہے۔''
''سچ میرل کے بابا ہمارا میرل واپس آرہا ہے۔ یہاں میدان میں ہمارے سامنے وہ کھیلتا پھرے گا میں اسے آواز دوں گی میرل دھوپ بہت ہے گھر میں آجاؤ میں نے نمکین لسی بنائی ہے پی لو۔''
''اچھا......! بابا جب وہ آجائے تو اُسے پلا دینا نمکین لسی بھی اور میٹھی روٹی بھی کھلا دینا ہمارے لیے تو نہیں بنی نمکین لسی اور میٹھی روٹی۔'' امرخان نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔
''اے میرل کے بابا اللہ کا خوف کرو ساری حیاتی میں نے تمہاری خدمت اور طابع داری کی ہے پھر بھی گلا کرتے ہو۔''
''ارے بھاگ بھری تیرے ساتھ ہنس بول لیتا ہوں کیا یہ بھی حق نہیں ہے میرا۔''
''کیوں نہیں میرا سائیں سب حق ہیں تمہارے ہیں۔''
''اب یہ بھی سن لو کہ میرل کے آنے کے بعد ہم شہر چلیں گے وہاں گھر خرید لیں گے اور رابیل کی شادی بھی شہر والے گھر سے کریں گے۔''
''میرل کے بابا شہر جانے کا خیال دل سے نکال دو یہاں میں دلہن بن کر آئی تھی ہمارے بچے ہمیں اللہ نے اسی تھر میں دیے ہمارے بزرگوں کی قبریں یہاں ہیں ان سب کو ہم کیسے چھوڑ دیں اس مٹی میں ہمارا خون شامل ہے تم نے میرل کو دور بھیجا میں نے برداشت کیا۔ لیکن اپنی مٹی سے دور ہیں رہ سکتی میرے اندر بھی ایک ماروی ہے جو اپنی مٹی سے محبت کرتی ہے۔'' اُس نے اپنی پلکوں میں آنے والے آنسو اپنے آنچل سے خشک کیے۔
''واہ نوری تُو تو میڈم لوگوں کی طرح باتیں کرنے لگی ہے اس بحث کو اب ختم کرو معلوم ہے تم کو اس تھر کی مٹی نے بولنا بھی سکھا دیا ہے۔''

''میرل کے بابا اپنا میرل وہاں کام کیا کرتا ہوگا؟''

''جو میرل کو باہر لے کر گیا تھا اُس نے بتایا ہے کہ بڑے لوگوں کے مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا ہوگی یا اُن کے بچوں کے ساتھ کھیلنا ہوگا اُن کا خیال رکھنا ہوگا۔ اب دیر کیا ہے کل صبح میں میرل کو شہر لینے جاؤں گا پھر اُس سے ہی ساری باتیں پوچھنا اب سو جاؤ۔ جب میرل آئے تو اُس سے باتیں کرنا۔''

آج کی صبح بڑے انتظار کے بعد طلوع ہوئی کوئل اور مور کی آوازیں صبح کو اور بھی دلفریب بنادی تھیں۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں میرل کو لے کر آؤں گا۔'' امرخان نے سر پر روایتی سندھی ٹوپی سجائی اور گلے میں اجرک ڈال کر بیٹے کے استقبال کے لیے گھر سے نکل پڑا اور اِدھر نوری کی آنکھیں انتظار کے راستے پر آ بیٹھیں۔ رابیل بھی سارا وقت عجیب عجیب سوال کرتی رہی صبح، دوپہر اور پھر شام کی سرمئی چادر میں جا چھپی اُن کے چہروں پر فکر مندی کی دھول چھا رہی تھی۔

''میرل کے بابا تم اکیلے آئے ہو میرل کہاں ہے؟'' نوری امرخان کے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر چیخ پڑی۔

''میرل پیچھے آ رہا ہے۔'' امرخان نے بے جان سے لہجے میں جواب دیا۔

کچھ ہی دیر میں کچھ لوگ لکڑی کا صندوق کاندھے پر اٹھائے گھر میں داخل ہوئے۔

''میرل کے بابا یہ صندوق میرل کا ہے اس میں اُس کا سامان ہے؟''

''اِس میں میرل کی لاش ہے مر گیا ہے ہمارا بیٹا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو میرل کیسے مر گیا؟''

میرل اور اس جیسے بہت سارے غربت کے مارے بچے اونٹوں کی دوڑ کے مقابلے میں دوڑتے اونٹوں پر سوار کیے جاتے جب اونٹ تیزی سے دوڑتے تو بچے خوف سے چیخ کر اُن اونٹوں سے چمٹے رہتے اور وہ اور تیز دوڑنے لگتے اس طرح ایک دن ہمارا میرل بھی اونٹ کے جسم سے چمٹ کر چیخ رہا تھا اور اونٹ تیزی سے دوڑنے لگا اور میرل اونٹ پر سے گر پڑا اور اونٹوں نے اُسے روند کر زخمی کر دیا اور پھر وہ زندگی کی دوڑ میں ہار گیا۔'' اُس نے روتے ہوئے سارا دکھ کہہ دیا۔

نوری ساکت تھی رابیل ایک طرف کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔

''بابا آپ نے تو میرل کو بھوک کی موت سے بچانے کے لیے اجنبی ملک بھیجا تھا۔ پھر وہ کیوں مر گیا؟ ماں دیکھو بارش ہوگئی کئی سال بعد بادل برس رہے ہیں لیکن ہماری مشکلات ختم نہیں ہوئیں ماں ہمیں اس بارش سے کچھ نہیں ملے گا ہماری مصیبتیں تھوڑی یا بہت ہو سکتی ہیں مگر ختم نہیں ہوں گی ماں ہمارا صحرا جل تھل ہو رہا ہے لیکن ہمارے پیروں کے نیچے دکھوں اور مشکلات کی گرم ریت ہے اور سر پر حالات کی تپتی دھوپ برسات کے مسافر میرا صحرا کا مسافر چلا گیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اب تجھے میں اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گی جا تو بھی دور بہت دور چلا جا۔'' رابیل جنون کی سی کیفیت میں بول رہی تھی اُس کا بارش کا مسافر برستی بارش میں بھیگ رہا تھا لیکن اپنی ہی دنیا میں گم رابیل ہذیان بول رہی تھی۔ نوری اور امرخان ایک طرف بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔

☆☆......☆☆

کرماں والی

تحریر کی روانی اور گیرائی لیے یقیناً یہ یادگار افسانہ آپ کے دل کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دے گا

تندوری روٹی بہت ہی عمدہ بنی تھی مگر اس کو سبزی کے ساتھ ملا کر کھانا دشوار تھا۔

''اتنی تیز مرچ!'' میں اور میرے دونوں بچے سی سی کرنے لگے تھے۔

''بی بی! یہاں جاٹوں کی آمدورفت بہت ہے۔ کوسوں میں شراب کی بس یہی ایک دکان ہے۔ جاٹ جب گھونٹ بھر لیتے ہیں تو اچھی مصالحہ دار سبزی مانگتے ہیں۔'' تندور والا کہہ رہا تھا۔

''یہاں...... جاٹ...... شراب......''

''ہاں بی بی! شراب تو سبھی پیتے ہیں لیکن جاٹ جب کسی کا خون کر کے آتے ہیں زیادہ ہی پیتے ہیں۔''

''یہاں ایسے واقعات......''

''ابھی تو پرسوں ترسوں کوئی پانچ چھ آ گئے۔ ایک آدمی کو مار کر آئے تھے۔ ان لوگوں نے خوب چڑھا رکھی تھی مگر شرارتیں کرنے لگے۔ وہ دیکھو میری تین کرسیاں ٹوٹی پڑی ہیں۔ پر مالک بھلا کرے، پولیس والوں کا' وہ سب انہیں جلد ہی پکڑ کر لے گئے۔ نہیں تو میرے چولہے کی ایک اینٹ بھی نہ ملتی...... لیکن ہم کمائی بھی تو انہیں کی کھاتے ہیں۔''

مجھے اس روز کو شلیا ندی دیکھنے کی خواہش چندی گڑھ سے اس گاؤں میں لے گئی تھی۔ بات مرچوں سے آگے بڑھ کر شراب تک پہنچی اور پھر خون خرابے تک پہنچ گئی تھی میں اب دونوں بچوں کو لے کر اس گاؤں سے جلد سے جلد لوٹنے کے لئے بے قرار ہوا تھی۔

تندور اچھی طرح لپا تپا تھا اور اندر سے کھلا ہوا تھا۔ اندر ایک طرف کوئی چھ سات بوریوں کو تان کر پردہ لگا تھا۔ اس کے پیچھے پڑی ہوئی تین چار پائیوں کے پائے بتاتے تھے۔ تندور والے کے بال بچے بھی یہیں رہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس کچھ کم ہوا کیونکہ عورت کا قیام تھا اور عزت محفوظ تھی۔

کسی عورت نے ٹاٹ ہٹا کر باہر جھانکا اور

پھر وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''بی بی! تو نے مجھے پہچانا؟''

''نہیں تو......''

وہ ایک سیدھی سی جوان عورت تھی۔ میں دیر تک اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی لیکن کوئی بھی بھولی بسری بات یاد نہ آئی۔

''میں نے تو تجھے پہچان لیا ہے بی بی! پچھلے سال......نہیں اس سے بھی پچھلے سال تو یہاں آئی تھی نا؟''

''ہاں، میں آئی تو تھی!''

''سامنے میدان میں ایک بارات اتری تھی۔''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔''

''وہاں تو نے ڈولی میں بیٹھے ہوئے مجھ کو روپیہ دیا تھا۔''

بات یاد آ گئی۔ دو سال قبل میں چندی گڑھ گئی تھی۔ وہاں نئے ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح ہونے والا تھا۔ پہلے دن کے افتتاحیہ پروگرام کے لئے میرے دلی کے دفتر نے مجھے وہاں ایک نظم پڑھنے کے لئے بھیجا تھا۔

من موہن سنگھ اور ہندی کے ایک شاعر جالندھر اسٹیشن کی طرف سے تھے۔ پروگرام جلد ہی ختم ہو گیا تھا اور ہم چار ادیب کوشلیا ندی کو دیکھنے کے لئے چندی گڑھ سے اس گاؤں میں آئے تھے۔

ندی کوئی میل ڈیڑھ میل ڈھلوان پر تھی۔ واپس لوٹتے وقت ہم سب چائے کے ایک گرم پیالے کے لئے ترس گئے تھے۔

سب سے صاف اور کھلی دکان یہی نظر آئی تھی۔

یہیں ہم لوگوں نے چائے کا ایک ایک گرم پیالہ پیا تھا۔ اس روز اس دکان پر تیار ہوتے ہوئے گوشت اور تندوری روٹیوں کے ساتھ ساتھ کافی مٹھائیاں بھی تھیں۔

تندور والے نے بتایا تھا۔

''آج یہاں سے میری بھانجی کی ڈولی گزرے گی میرا بھی تو کچھ فرض ہے نا۔''

اور پھر سامنے میدان میں ڈولی اتری۔ ڈولی کسی پچھلے گاؤں سے آئی تھی۔ اسے ابھی اور آگے جانا تھا۔

راستے میں ماما نے استقبال کیا تھا۔

''شادی بھی عجیب شے ہے۔ آتے وقت کیسا رنگ لاتی ہے اور جاتے وقت......'' ہم میں سے ایک نے کہا تھا اور پھر چائے کی چسکیوں کے ساتھ رنگ کا فلسفہ بھی گرم ہوتا گیا تھا۔

''ٹھہرو' میں نئی دلہن کا منہ دیکھ آؤں! دیکھوں تو آج اس کے منہ پر کیا رنگ ہے۔'' مجھے یاد ہے' میں نے کہا تھا اس پر میرے ساتھیوں نے جواب دیا تھا۔

''ہمیں تو کوئی ڈولی کے پاس پھٹکنے بھی نہیں دے گا تم ہی دیکھ آؤ......لیکن خالی ہاتھ نہ دیکھنا۔''

میں ایک مسکراہٹ لئے ڈولی کے پاس چلی گئی تھی۔ ڈولی کا پردہ ایک طرف سے اٹھا ہوا تھا۔ میں نے قریب ہی بیٹھی نائن سے پوچھا تھا۔ ''میں دلہن کا منہ دیکھ لوں؟''

''بی بی جی' صدقے! دیکھ ہماری لڑکی تو ہاتھ لگائے میلی ہوتی ہے۔''

''اور سچ مچ لڑکی کے چہرے پر مقدس مسکراہٹ کھیل رہی تھی' اس کا مقابلہ آسان نہیں تھا۔

میں نے ایک روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور جب لوٹی تو میرے ایک ساتھی نے کہا تھا۔

''کچھ دیر قبل جب تم نے اپنی نظم پڑھی تھی تو کالج کی کتنی ہی لڑکیوں نے روپے کے نوٹ پر تم سے دستخط کروائے تھے مگر اس بے چاری کو کیا خبر

کہ یہ روپیہ کس نے دیا ہے۔ جانتی ہوتی تو تم سے دستخط بھی کرالیتی۔''

یہ دو سال پہلے کی بات تھی مجھے پوری کی پوری یاد آ گئی۔

''تم ہی وہ ڈولی والی لڑکی ہو؟''

''ہاں بی بی!''

نہ جانے کس حادثے نے اسے دو ہی سال کے عرصے میں لڑکی سے عورت بنا دیا تھا۔ حادثے کے نشانات اس کے چہرے پر نمایاں تھے پھر بھی مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کیسے دریافت کروں۔

''بی بی! میں نے تیری تصویر اخبار میں دیکھی تھی۔ ایک بار نہیں دو بار' یہاں بھی کتنے لوگ آتے ہیں جن کے پاس اخبار رہتا ہے۔ کئی تو روٹی کھاتے کھاتے یہیں پر چھوڑ جاتے ہیں۔''

''سچ! اور تو نے میری تصویر پہچان لی تھی؟''

''میں نے اسی وقت پہچان لی تھی لیکن بی بی وہ لوگ تیری تصویر کیوں چھاپتے ہیں؟''

مجھے جلدی میں کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مجھ سے ایسا سوال پہلے کبھی کسی نے نہیں پوچھا تھا۔ کچھ ندامت کے ساتھ میں نے کہا۔

''میں کہانیاں اور نظمیں لکھتی ہوں نا!''

''کہانیاں' بی بی وہ سب کہانیاں سچی ہوتی ہیں یا جھوٹی؟''

''کہانیاں تو سچی ہوتی ہیں۔ ویسے نام غلط ہوتے ہیں تا کہ پہچانے نہ جائیں۔''

''تو میری کہانی بھی لکھ سکتی ہے بی بی؟''

''اگر تو کہے تو میں ضرور لکھوں گی۔''

''میرا نام کرماں والی (قسمت والی) ہے تو چاہے تو میرا نام بھی غلط نہ لکھنا۔ میں کوئی جھوٹ

تھوڑے ہی بولوں گی۔

میں تو سچ کہتی ہوں لیکن کوئی میری سنے بھی تو، کوئی نہیں سنتا؟''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ٹاٹ کے پیچھے پڑی ہوئی چارپائی پر لے گئی۔

''جب میری شادی ہونے والی تھی نا تو میری سسرال سے دو جنی میرا ناپ لینے آئی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی میری ہی عمر کی تھی۔ بالکل میرے ہی برابر۔ وہ کسی دور کے رشتے سے میری نند لگتی تھی۔ میری شلوار قمیض ناپ کر کہنے لگی۔

''بالکل میرا ہی ناپ ہے بھابی! تو فکر نہ کر، جو کپڑے سیوں گی تجھے ایک دم پورے آئیں گے۔''

اور سچ مچ شادی کے جتنے بھی کپڑے تھے، مجھے خوب اچھی طرح آئے تھے۔ وہی نند کئی مہینے تک میرے پاس رہی اور بعد میں بھی میرے کپڑے وہی سیتی رہی، وہ مجھے چاہتی بھی بہت تھی۔ مجھ سے کہا کرتی۔

''بھابی! چاہے میں دو مہینے بعد آؤں، چاہے چھ مہینے بعد لیکن تو کسی اور سے کپڑا مت سلوانا۔''

وہ مجھے بھی بہت اچھی لگتی تھی!

اس کی صرف ایک بات مجھے ناپسند تھی۔ وہ میرا جو بھی کپڑا تیار کرتی تھی۔ پہلے خود پہن کر دیکھتی تھی۔ کہتی۔

''تیرا میرا ایک ہی ناپ ہے۔ دیکھ مجھے کیسا پورا آتا ہے تجھے بھی پورا آئے گا اور سارے کپڑے پہنتے وقت میرے دل میں آتا تھا۔ کپڑے بھلے ہی ہیں لیکن ہیں تو اسی کے اتارے ہوئے نا!''

رسی کے ساتھ ٹنگا ہوا ٹاٹ کا پردہ تھا۔ بان کی ڈھیلی سی چارپائی تھی۔ کھیس بھی خستہ تھا۔ یہ لڑکی بھی الہڑ اور گنوار تھی مگر یہ خیال کتنا نازک، کتنا لطیف تھا۔ میں چونک پڑی۔

''لیکن بی بی! میں نے اپنے من کی بات کبھی نہیں کی۔ جانے بے چاری کا من چھوٹا ہو جائے۔''

''پھر؟''

''پھر مجھے کوئی ڈیڑھ برس بعد پتہ چلا۔ کسی نے بتا دیا تھا۔ اس کی اور میرے گھر والے کی لگی ہوئی تھی۔ یہ اس کا دور کے رشتے سے بھائی لگتا تھا لیکن اس کے سگے بھائی کو یہ بات بہت بری لگتی تھی۔ وہ تو ایک بار...... اپنی بہن کی گردن اتارنے کو بھی تیار ہو گیا تھا۔

کسی نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ جب اس نے بہن بن کر گھوڑے کی باگ پکڑی تھی تو اسے غش آ گیا تھا۔

آنسوؤں سے بھیگی کرماں والی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''بی بی! تو میرے من کی بات سمجھ لے۔ مجھ سے اترن نہیں پہنا جاتا۔ میری گوٹے دار شلواریں، میری تاروں جڑی چوڑیاں اور میری سلموں والی قمیص...... سب کچھ اسی کے اتر تھے اور میرے کپڑوں ہی کی طرح میرا گھر والا بھی......''

کرماں والی کی بات کے آگے میرا قلم جھک گیا۔ کون ادیب ایسا فقرہ لکھ سکتا تھا۔

''اب بی بی! میں وہ سارے کپڑے اتار آئی ہوں۔ اپنے گھر والے کو بھی...... یہاں ماما جی کے پاس آ گئی ہوں۔ ان کا گھر صاف کرتی ہوں، میزیں دھوتی ہوں اور میں نے ایک مشین بھی خرید لی ہے، چار کپڑے سی لیتی ہوں اور گزارہ ہو جاتا ہے۔ بھلے ہی کھدر ململ چاہے لٹھا مگر میں کسی کا اترن نہیں پہنتی۔ میرا ماما صلح کرانے کو پھر رہا

ہے۔ وہ میرے دل کی بات نہیں سمجھا۔ میں جس طرح جی رہی ہوں۔ اسی طرح جی لوں گی میں اور کچھ نہیں چاہتی۔ بی بی! تو صرف ایک بار میرے من کی بات لکھ دے۔''

کرماں والی کے جس جسم کے ساتھ یہ کہانی پیش آئی تھی' اسے میں نے ایک بار پوری طاقت سے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ کتنا توانا جسم تھا اور کتنا مضبوط دل!

یہاں میں پل بھر پہلے مرچوں سے شراب اور شراب سے خون خرابے تک آئی ہوئی گفتگو سے گھبرا گئی تھی اور یہیں پر یہ کرماں والی کتنی دلیری سے زندگی کے دن گزار رہی تھی۔

باہر سڑک پر شملہ سے آنے والی موٹریں گزرتی تھیں۔

ان کی سواریاں ریشمی کپڑوں میں ملبوس کئی بار لمحہ بھر کے لئے اس دکان پر چائے کے ایک پیالے کے لئے یا سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے لئے یا گرم تندوری روٹی کے لئے رک جاتی تھیں۔ ان کے جسم پر کے ریشمی کپڑے نہ جانے کس کس کے اترن ہوتے تھے۔

اور کرماں والی ان کی میزیں صاف کرتی تھی۔ کرسیاں جھاڑتی تھی۔

وہی کرماں والی جس نے ایک کھدر کی قمیض پہن رکھی تھی اور جو اپنے جسم پر کسی کا اترن نہیں پہن سکتی تھی۔

''بی بی! میں نے تیرا وہ روپیہ اب تک سنبھال رکھا ہے۔''

''کیا سچ! اب تک؟''

''ہاں' بی بی! اس وقت وہ روپیہ میں نے اپنی نائن کو تھما دیا تھا اور پھر دوسرے ہی دن کی بات ہے جب میں نے تیری تصویر دیکھی۔

میں نے نائن سے وہ روپیہ لے کر حفاظت سے رکھ لیا تھا۔ بی بی تو اس روپے پر اپنا نام لکھ دے۔ پھر جب تو میری کہانی لکھنا تو مجھے ضرور بھیجنا۔''

اور کرماں والی نے اٹھ کر چارپائی کے نیچے رکھا ہوا ٹرنک کھولا۔ ٹرنک میں ایک لکڑی کی صندوقچی تھی۔ اس میں سے اس نے تہہ کیا ہوا وہ نوٹ نکالا۔

''میں اپنا نام تو لکھ دیتی ہوں کرماں والیئے! میں نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کے نوٹوں پر اپنا نام لکھا ہوگا لیکن آج میرا جی چاہتا ہے کہ تو میرے نوٹ پر اپنا نام لکھ دے۔ کہانی کار بڑا نہیں ہوتا۔ بڑا تو وہ ہے جس نے کہانی خود اپنے جسم پر جھیلی ہے۔''

''مجھے تو اچھی طرح لکھنا بھی نہیں آتا۔'' کرماں والی شرما سی گئی اور پھر بولی۔

''بی بی! تو میرا نام کہانی میں ضرور لکھنا۔''

''ہاں' میں وہی نام' تیرے ہاتھوں کا لکھا ہوا تیرا ہی نام اس کہانی کا عنوان رکھوں گی۔'' میں نے پرس سے نوٹ اور قلم نکالا۔

کرماں والیے! آج میں تیری کہانی لکھ رہی ہوں۔ وہی' روپے کے نوٹ پر لکھا ہوا تیرا نام آج اس کہانی کی پیشانی پر مقدس ٹیکے کی مانند جگمگا رہا ہے۔

یہ کہانی تیرا کچھ نہیں سنوارے گی لیکن یہ یقین رکھنا کہ وہ دل بھی تیرے اس ٹیکے کو سلام کرتے ہیں جن کے خون کا رنگ تیرے اس ٹیکے کے رنگ سے ملتا ہے اور وہ سر بھی شرم سے اس کے آگے جھکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے جسموں پر نہ جانے کس کس کے اترن پہن رکھے ہیں۔

☆☆......☆☆

ناول
زمر نعیم

ابھی امکان باقی ہے

اُن کرداروں کی کہانی، جو ہر معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر
جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے

قسط نمبر 8

اروی انعم کے رویے سے دلبرداشتہ سی ہوئی پڑی تھی۔ مانا کہ اُس سے غلطی ہوئی تھی۔ اُسے انعم سے کوئی کام نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جو وہ اس طرح ردِعمل دکھاتی اروی کو اس کا رویہ تو پہلے دن سے ہی ناقابلِ فہم سا لگتا تھا۔ مزید وہ ایکسیڈنٹ کے بعد سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھی۔ یہ بات اروی کے لیے اس لیے تکلیف دہ کہ وہ انعم کے رویے کی وجہ سمجھ نہیں پارہی تھی۔ سب گھر والے تو اول دن سے مروت ومحبت سے پیش آرہے تھے۔ صرف انعم ہی تھی جو تحقیر وتضحیک پر اُتر آتی تھی، مگر کیوں؟ اس کیوں؟ کا جواب وہ کسی سے بھی پوچھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی البتہ سوچ رہی تھی کہ انعم کے دل سے اپنے لیے نفرت وحقارت ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور اس عمل کے لیے صرف اصم سے ہی مدد لی جاسکتی تھی۔ اصم کا خیال آتے ہی اُس کی ہمت اور حوصلہ پھر سے اُجاگر ہوگیا۔ دوپہر بھی گزرنے والی تھی۔ اصم ضرور اُس کے فون کا انتظار کررہا تھا۔ وہ ہر سوچ جھٹک کر اُس کا نمبر ملانے لگی۔

☆......☆......☆

اصم ناشتے کے بعد سے اپنی میڈیسن لے کر منتظر سا لیٹا تھا۔ فیصل نے اپنے آفس سے فون کر کے اُسے بتادیا تھا کہ وہ اروی بھابی تک سیل فون پہنچا آیا ہے۔ تب سے وہ اسی انتظار میں تھا کہ اروی اُسے کال کرے گی۔ بستر پر لیٹے لیٹے وہ بھی اب مایوسی میں گھر جاتا تھا۔ لاچاری محسوس کرنے لگتا تھا۔ اُس کی برداشت وہمت بھی جیسے کم ہوتی جارہی تھی۔ کوئی بھی گھر سے ذرا دیر کردیتا وہ بدگمان ہونے لگا تھا کہ ہر کوئی اپنے آپ میں مگن ہے۔ کسی کو اُس کی پرواہ نہیں۔ اروی کے لیے بھی اُس کے دل میں ایسے ہی خیالات پیدا ہورہے تھے۔ اسی لیے وہ آنکھیں موندھے پڑا تھا۔ فون کی ٹیون بج رہی تھی۔ ڈیوٹی نرس نے قریب آکر بہت آہستگی سے اُسے مخاطب کیا۔

''سر آپ کی کال آرہی ہے۔'' اصم نے فوراً ہی آنکھیں کھولیں نرس نے بڑھ کر ہینڈ سیٹ کنیکٹ

کر کے ایئر فون اُس کے کان میں لگایا اور خود باہر نکل گئی۔

''شکر ہے تمہیں میرا بھی خیال آیا۔'' اصم کی بوجھل آواز اُس کی ناراضگی ظاہر کر رہی تھی۔

''سوری...... میں اُسی وقت فون کرنا چاہ رہی تھی مگر پھر انعم آ گئیں تو......'' وہ ایکدم گھبرا کر بولی۔

''بہانہ تو اچھا ہے...... ورنہ تو......''

''نہ...... نہیں...... میں بہانہ نہیں کر رہی...... یقین کریں انعم کافی دیر بیٹھی رہیں۔ اسی لیے میں بات نہیں کر سکی۔ پلیز آپ ناراض نہیں ہوں۔'' وہ صفائی دینے کی کوشش میں تھی۔

''میری ناراضگی کا اتنا خیال ہے تو بات کرتی رہا کرو مجھ سے میں یہاں تنہا پڑا ہوں۔ کسی کو میرا احساس نہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' اُس کی بدگمانی پر اروی حیران ہوئی یہ پہلا موقع تھا وہ اس طرح بات کر رہا تھا۔

''میرے اختیار میں ہو تو میں ایک لمحے کے لیے بھی آپ کے پاس سے نہ ہٹوں...... آپ کی تکلیف آپ کی تنہائی کا احساس ہے مجھے۔'' اصم کی بدگمانی پر وہ بے چین ہو اٹھی تھی۔

''ایسا ہے تو پھر آ جاؤ نا...... I Miss You۔'' اصم جیسے خود سے ہی بے بس ہوا جا رہا تھا۔ عجیب تنہائی کا کرب تھا۔ ڈاکٹرز' اسٹاف کی توجہ کے باوجود گھر والوں' دوستوں کی معیت میسر آتے ہوئے بھی وہ وقت کو کسی عذاب کی طرح گزرتے محسوس کر رہا تھا۔

اروی کی آنکھیں بھیگنے لگیں اور پھر قطرہ قطرہ آنسو گرنے لگے۔

''میں آ جاؤں گی اصم...... آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں...... اس طرح ہمت مت ہاریں۔''

''ہمت ہی تو ٹوٹنے لگی ہے...... یار...... ابھی نجانے اور کتنے دن بستر پر رہنا ہے۔ بس دل دھڑک رہا ہے اور جسم پتھر بنا ہوا ہے۔'' وہ بہت مایوس ہو رہا تھا اروی تڑپ اٹھی۔

''اصم...... اصم پلیز ایسے نہ کہیں...... آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہوں۔ آپ خود بھی دعا کریں' ہم بھی دعا کر رہے ہیں۔'' اروی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے اُسے تسلی دے۔ وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اصم کی بیقراری کو بھی قرار آ گیا تھا۔ ذہن کا فشار بھی کم ہوا تھا۔ رات کو پھر فون کرنے کے عہد و پیماں کے بعد دونوں نے رابطہ منقطع کیا۔

☆......☆......☆

انعم ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار ہو کر بی بی جان کے پاس آئی تو اُس کا موڈ پھر سے خراب تھا۔

''اب کیا ہوا ہے؟ موڈ کیوں خراب ہے تمہارا۔'' بی بی جان نے دوپٹہ سر پر اچھی طرح لینے کے بعد کندھوں پر سیاہ چادر پھیلاتے ہوئے انعم کے چہرے پر نگاہ مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ جلبلا کر بولی۔

''میرا موڈ آپ کی چھوٹی بہوئی وجہ سے خراب ہوا ہے پتہ نہیں کیا سمجھتی ہیں خود کو۔''

''کس کی با...... ت کر رہی ہو۔'' انہیں تشویش سی ہوئی۔

''ایک ہی تو ہیں بابا جان کی چہیتی...... چار دن میں خود کو مہارانی سمجھنے لگی ہیں۔ مجھے آرڈر دے رہی تھیں کہ میں شمو کو بھیجوں...... میں اُن کی ملازمہ ہوں کیا؟'' وہ ابھی تک اُسی غصے میں تھی۔ بی بی جان فوراً

ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئیں۔

''انعم ...... ذرا ذرا سی باتوں پر اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ کیا ہو گیا اگر اُس نے تمہیں شمو کو بھیج دینے کے لیے کہہ دیا تھا...... آخر وہ تمہاری بڑی بھابی ہے۔''

''بی بی جان آپ اچھی طرح جانتی ہیں مجھ سے کسی کا رعب برداشت نہیں ہوتا۔''

''انعم ...... بیٹا اُس نے ایسے ہی کہہ دیا ہوگا۔ تمہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے...... اچھا...... خیر...... میں اُسے سمجھاؤں گی...... وہ سمجھدار ہے سمجھ جائے گی۔'' بی بی جان نے مصلحتاً اُسے بہلانے کی کوشش کی تھی۔

''جی ہاں...... وہ بے حد سمجھدار ہے...... جبھی اصم بھائی اس کنڈیشن میں بھی اُسی کی فکر میں مبتلا ہیں۔'' اُس کا انداز و رویہ طنزیہ تھا۔ بی بی جان نے اُسے فہمائشی نظروں سے گھورا۔

''یہ ہماری تربیت ہے کہ وہ کسی بھی حال میں اپنے فرض سے غافل نہیں ہوا...... تم نجانے کیوں ہماری تربیت بھلا چکی ہو۔''

''آپ کو تو مجھ سے یہی شکوہ رہتا ہے۔'' وہ بچوں کی طرح روٹھی روٹھی سی بولی۔

''اچھا چھوڑو یہ بچپنا...... چلو دیر ہو رہی ہے۔ اصم کھانے کے لیے انتظار کر رہا ہوگا۔'' بی بی جان اُسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ انعم کو ناچار اُن کے پیچھے جانا پڑا۔

☆......☆......☆

''شکر ہے اصم آج تم کافی بہتر محسوس ہو رہے ہو۔ فکر نہیں کرو بیٹا! ڈاکٹرز بتا رہے تھے تم اسی ہفتے ڈسچارج ہو جاؤ گے۔'' بی بی جان اُسے کھانا کھلانے کے بعد نم آلود ٹشو سے اُس کا منہ اور چہرا صاف کرتے کرتے شکرانہ ادا کرنے کے ساتھ بیٹے کو بھی تسلی دے رہی تھیں۔

''ہوں...... بتایا تھا مجھے بھی ڈاکٹر نے بی بی جان...... بس کیا کروں۔ تھک گیا ہوں لیٹے لیٹے...... یہ پلاسٹر پتہ نہیں کب اترے گا۔'' اصم اپنی بے چینی چھپا نہیں سکا۔

''اصم بھائی...... جلدی اُتر جائے گا پلاسٹر بھی...... آپ گھر آ جائیں گے تو وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ہم سب ہوں گے نا آپ کے پاس۔'' انعم نے تائیداً بھائی کی دلجوئی کی۔ بی بی جان ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دونوں کو باتیں کرتا دیکھ رہی تھیں۔ دونوں میں محبت اور بے تکلفی شروع سے ہی تھی۔ انعم تو اکثر ہی اپنی باتیں مان اور دھونس سے منوایا کرتی تھی۔ شاید اسی لیے اصم کی شادی کے معاملے میں وہ اس طرح ردِعمل دکھا جاتی تھی۔ کیونکہ سبھی جانتے تھے وہ اصم کے لیے اپنی پسند کی لڑکی لانا چاہتی تھی۔ بی بی جان بھی اسی لیے اُس کا رویہ برداشت کر جاتی تھیں کہ وہ سمجھتی تھیں بہن بھائی کے لیے جو جذبات رکھتی تھی وہ بے ساختہ اور سچے ہیں۔ آناً فاناً ہوئی بھائی کی شادی کو وہ ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ بیٹی کی اُلجھن سمجھتی تھیں۔

''اچھا بیٹا...... ابھی ہمیں اجازت دو۔'' بی بی جان کی نگاہ گھڑی کی سوئیوں پر تھی۔

''اتنی جلدی بی بی جان؟ ابھی...... تو آئی تھیں آپ؟'' اُن کے جانے کا سنتے ہی وہ بے چین ہوا تھا۔

''دراصل...... مجھے انعم کو لے کر چیک اپ کے لیے جانا ہے۔ رات کو آ جاؤں گی۔'' انہوں نے بڑھ کر اُس کی پیشانی کو چھوا۔ ممتا کا لمس مسیحائی کرنے کا کمال رکھتا ہے۔ اصم کی بے چینی کو بھی قرار سا آ گیا۔

''اصم بھائی آج آپ ایک وعدہ کریں۔'' بی بی جان انعم کے مطالبہ پر حیران سی تھیں۔ نجانے وہ کیا وعدہ لینا چاہتی تھی۔

''کیسا وعدہ......؟'' اصم کے چہرے پر واضح اُلجھن تھی۔

''دیکھیے میں آپ کی بہن ہوں۔ آپ کی تکلیف پر میرا کیا حال ہے یہ آپ بنا کہے بھی جان سکتے ہیں۔''

''ہو...... ں ...... جانتا ہوں۔ اس حادثے نے سبھی کو پریشان کیا ہے۔ تم بتاؤ تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے۔'' اصم کو اُس کی تمہید سے یہی سمجھ آئی کہ شاید اروی کی کوئی بات انعم کو بری لگی ہے۔

''نہیں...... بس آپ وعدہ کریں کہ کیسے بھی حالات ہوں۔ کوئی بھی معاملہ ہو...... آپ اب اپنے سسرال نہیں جائیں گے۔'' وہ بھائی کا ہاتھ تھام کر کافی جذباتی ہو کر کہہ رہی تھی۔ بی بی جان نے بے ساختہ ہی اُسے ٹوکا۔

''انع...... م...... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بی بی جان...... اصم بھائی کو وہاں جانا دونوں بار ہی راس نہیں آیا۔ پہلے زبردستی شادی ہوگئی۔ اور پھر یہ بدترین حادثہ......''

''فضول باتیں نہیں کرو...... یہ وہم اور وسوسے پیدا کرنا شیطان کا کام ہے۔ تم خود بھی بدگمان ہو رہی ہو اور بھائی کو بھی پریشان کر رہی ہو...... چلو...... ڈاکٹر کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' بی بی جان نے تنبیہی انداز میں دیکھ کر کہا۔ پھر اصم کا ماتھا سہلاتے ہوئے نرمی سے سمجھانے لگیں۔

''اصم یہ بے وقوف ہے۔ اس کی باتیں ذہن میں مت رکھنا...... زندگی کا ہر معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ جو بھی ہوا۔ اُس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی۔ تم اس بات پر یقین رکھنا۔'' اصم جواباً بولا کچھ نہیں۔ آنکھیں جھپک کر انہیں جیسے تسلی دی۔ انعم کو ڈاکٹر کے پاس نہ لے جانا ہوتا تو وہ مزید اُسے تسلی دلا سے دیتیں۔

☆......☆......☆

پارکنگ تک جاتے ہوئے انعم جھنجلاہٹ کا شکار رہی۔

''بی بی جان آپ مجھے اب تک بے وقوف کیوں سمجھتی ہیں۔''

''بے وقوف ہی تو ہو تم...... بھائی کی حالت دیکھو...... اور تم اُس سے کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' ذرا رُک کر انہوں نے خفگی سے کہا۔

''میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔ اُس لڑکی کے آنے سے بھائی کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ اب آگے پتہ نہیں کیا کیا ہوتا ہے؟'' وہ اپنی بات پر ڈٹی تھی۔

''آگے کی بھی اللہ بہتر ہی کرے گا۔ تم بس فضول سوچنا چھوڑ دو...... خوامخواہ اپنی صحت خراب کرتی ہو۔'' بی بی جان نے اُسی رویے سے کہتے ہوئے گاڑی کے قریب پہنچ کر اُسے چپ رہنے کا بھی اشارہ دیا۔ وہ چپ تو ہوگئی تھی مگر ناگواری و ناراضگی اُس کے چہرے سے صاف ظاہر تھی۔

☆......☆......☆

صالحہ درانی دوپہر کے معمولات سے فارغ ہو کر ذرا ستانے لیٹی تھیں کہ ملازمہ نے آکر انہیں زیب النساء کے آنے کی اطلاع دی۔ صالحہ کو اپنی خالہ زاد کا آنا کچھ حیران کر رہا تھا۔ جب سے فائق کی شادی ہوئی تھی۔ دونوں کے درمیان غیر محسوس سا کھینچاؤ آ گیا تھا۔ حالانکہ اُس سے پہلے دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ اپنے سراپے پر نگاہ ڈال کر اپنے حلیے پر مطمئن سی نظر آئیں تو فوراً ہی اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھائے۔ رسمی سلام دعا کے بعد زیب النساء نے سابقہ بے تکلفی ظاہر کی۔

''بہت دنوں سے تم سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔ آج سوچا کہ مل ہی آؤں۔''

''اچھا کیا...... میں تو اپنی مصروفیت میں نکل ہی نہیں پاتی ہوں۔'' صالحہ نے بھی جواباً بات بڑھائی۔

''ایسی بھی کیا مصروفیت ہے تمہاری؟ بہو نہیں ہوتی گھر پر۔'' زیب النساء نے انجان بن کر کریدا۔

''گھر پر ہی ہوتی ہے...... بتایا تو ہوگا سبرینہ نے اُس کے بھائی اصم اور بیوی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اس لیے وہ میکے گئی ہوئی ہے۔'' صالحہ نے پہلو بدلتے ہوئے وضاحت دی۔

''یہ تو معلوم ہے میں بھی گئی تھی ہاسپٹل دیکھنے' اب تو وہاں رہنے کا کوئی جواز ہے لیکن...... میں تو جب بھی آئی ہوں...... تم تنہا ہی ہوتی ہو۔'' بظاہر زیب النساء کا لہجہ سرسری سا تھا مگر اُس میں چھپا طنز صرف صالحہ کو ہی محسوس ہو رہا تھا۔

''محض اتفاق ہی ہو سکتا ہے ورنہ تو......''

''بس صالحہ! مجھ سے کیا چھپا ہوا ہے...... کون نہیں جانتا' انعم کا یہاں دل ہی نہیں لگتا...... عجیب لڑکی ہے۔'' زیب ہمدردانہ رویے سے صالحہ کو اُکسا رہی تھیں کہ آج وہ سارے بھرم اُن کے سامنے کھول ہی دے اور ایسا ہی ہوا۔

''جب تم سب جانتی ہو تو مجھ سے کیا سننا چاہتی ہو...... ہم دونوں کی قسمت میں بہو بیٹے کی قربت' خدمت لکھی ہی نہیں۔ تمہارا بیٹا طلال بیوی کے ساتھ کینیڈا جا بسا اور یہاں فائق سنجیدہ ہے نہ انعم کو گھر گرہستی میں دلچسپی ہے۔'' صالحہ نے آخر گزشتہ دو سال سے رکھا بھرم توڑ ہی دیا۔ زیب کے چہرے پر اپنے بیٹے کے حوالے سے ملال سا نظر تو آیا مگر وہ جلد ہی خود پر قابو پا گئیں۔

''سبھی جانتے ہیں طلال تو مجبوری میں گیا ہے۔ اُس کی بیوی کی نیشنیلٹی وہاں کی تھی' اس لیے وہ یہاں نہیں رہا مگر انعم تو اسی شہر میں ہو کر یہاں نہیں ہوتی۔ آخر کیا مسئلہ ہے۔ تم پوچھتی کیوں نہیں ہو۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ویسے بھی بچوں کی ذاتی زندگی میں دخل دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تم تو واقف ہو میری نیچر سے۔'' صالحہ نے مصلحتاً پہلو بچایا۔

''ہا...... ں بھئی صحیح کہتی ہو اب تو بچوں کی زندگیاں ماں باپ کی زندگی سے الگ ہی ہو گئی ہیں۔'' زیب کی ٹھنڈی آہ میں چھپی وہ تکلیف صالحہ جانتی تھیں کہ کس جبر سے انہوں نے اکلوتے بیٹے طلال کی جدائی کو برداشت کیا ہے۔

''اچھا چھوڑو...... باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تم چائے پیو ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' صالحہ نے ملازمہ کی لائی ہوئی ٹرالی زیب کی طرف کھسکائی۔ تو وہ بھی چائے اور لوازمات کی طرف متوجہ ہوئیں۔ صالحہ اپنے لیے چائے کا کپ بناتے ہوئے موضوع بدلنے کی خاطر بولیں۔

''شہری کا سناؤ...... مانی ہے وہ کسی پر پوزل پر؟''
''کہاں...... ں؟'' زیب نے چکن پیٹیز کا لقمہ نگلتے ہوئے نفی میں بھی سر ہلایا۔
''وہ بھی من مانی پر تُلی ہے' کہتی ہے شادی نہیں کرے گی تم تو جانتی تھیں اُس کا رجحان، پھر غلطی میری بھی ہے۔ میں ہی اُس کے ذہن میں ڈالتی گئی کہ مجھے اُس کے لیے فائق جیسا لڑکا پسند ہے۔'' زیب نے آج کھل کر جتایا تھا کیونکہ اشارے کنایے میں دونوں ہی ایک دوسرے کو عندیہ دے چکی تھیں۔ صالحہ کو بھی شہرینہ پسند تھی اور زیب کے علاوہ شہرینہ کو فائق۔
''کیا کریں...... یہ تو قسمت کا کھیل ہے۔ خیر تم فکر نہیں کرو۔ ہم مل کر منالیں گے اُسے...... اچھا پر پوزل ہوگا تو مان جائے گی وہ بھی۔'' صالحہ نے اپنی شرمندگی چھپا کر کہا۔ تو وہ بھی سر ہلا کر بولیں۔
''ہاں کوشش تو کرتی رہوں گی آخر اُسے ماننا ہی پڑے گا۔'' زیب النساء کے چہرے پر ایک عزم سا نظر آرہا تھا۔

☆......☆......☆

انعم کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر کچھ سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ بی بی جان اُس کے تاثرات دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگیں۔
''ڈاکٹر رانیہ کیا؟ کوئی پریشانی کی بات ہے؟'' ڈاکٹر رانیہ اُن کی فیملی گائنا کالوجسٹ تھیں خاصے تفکر سے بولی۔
''اِس لڑکی کو اپنی کوئی فکر نہیں ہے کیا؟ یا پھر اسے بے بی نہیں چاہیے۔''
''کیا...... مطلب؟'' بی بی جان مزید پریشان ہوئیں۔ جبکہ انعم بھی بے چین سی سوالیہ نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔
''آپ صاف بات کریں۔''
''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ کسی بھی قسم کا دباؤ ماں اور بچے کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا...... پہلے دو مس کیرج بھی اسی لیے ہوئے تھے۔ آخر تم کیا سوچتی رہتی ہو انعم......'' ڈاکٹر رانیہ نے براہ راست انعم کو مخاطب کیا۔ مگر وہ تو چپ رہی لیکن بی بی جان اپنی ممتا سے مجبور ہو کر اُس کے دفاع میں فوراً بولیں۔
''آپ کو بتایا تو تھا یہ بہت سینسیٹو ہے۔ دراصل میرے چھوٹے بیٹے' بہو کا کافی سیریس ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور اس نے کافی اثر لیا ہے۔''
''او...... آئی سی...... تبھی...... ویل میرا مشورہ یہی ہے کہ اسے ایسے ماحول اور سچویشن سے دور رکھیں۔ تاکہ اُس کا دل و دماغ اچھا اور بہتر سوچے۔''
''آپ صحیح کہہ رہی ہیں...... میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ اب کوئی نقصان نہ ہو...... آپ اسے بھی سمجھائیں کہ ہر بات کو حواسوں پر سوار نہ کیا کرے۔''
بی بی جان نے ڈاکٹر کی تائید کرتے ہوئے انعم کو بھی شکایتی نظروں سے دیکھا۔
''میں خود سے تو ایسا نہیں کرتی' حالات ہوتے ہیں تو ٹینشن ہو جاتی ہے۔ میں کیا کروں۔'' اُس نے کافی ناراضگی سے جواب دیا تھا۔

''انعم میں تمہیں لاسٹ ٹائم وارن کر رہی ہوں۔ اگر تمہیں اپنا بے بی صحت مند چاہیے تو اپنے ری ایکشنز پر کنٹرول رکھو۔ ریلیکس رہا کرو۔ وقت کے ساتھ سب پرابلمز سولو ہو جائیں گی۔ فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' ڈاکٹر یکدم بہت نرمی سے سمجھانے لگی تھی۔ بی بی جان کے چہرے پر بھی اطمینان کی لہر دوڑ گئی تھی۔

''آپ اس کے لیے مزید ٹانک لکھ دیں۔ ڈائٹ کا بتا دیں۔ یہ بہت بے چین رہتی ہے' نیند بھی کم ہو رہی ہے اِس کی۔''

''ہا...... ں...... میں لکھ دیتی ہوں۔ بیلنس ڈائٹ چارٹ دیا تھا میں نے' اُسے ہی فالو کریں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' ڈاکٹر نے کمپیوٹر فائل میں نئی ادویات کا اندراج کیا اور پھر انہیں رخصت کر دیا۔

☆......☆......☆

''میں تمہیں اسی لیے سمجھاتی ہوں انعم! کہ اب صرف اپنے بچے اور شوہر کے بارے میں سوچا کرو۔ تمہاری زندگی اب اُن کے لیے اُن کے ساتھ ہے۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی گھر کی طرف آتے ہوئے بی بی جان نے بہت شفقت سے انعم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اور آپ لوگ؟ کیا؟ میں اب آپ لوگوں سے الگ ہو گئی ہوں۔'' انعم نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

''ایسی بات نہیں میری جان...... لیکن شادی کے بعد لڑکی کی زندگی نئے بننے والے رشتوں سے جڑی رہے تو اُس کی زندگی سکون سے گزرتی ہے۔'' بی بی جان نے اُس کے کندھے کو سہلا کر مزید نرمی سے کہا۔

''پتہ نہیں بی بی جان...... میں وہاں جا کر بے چین کیوں ہو جاتی ہوں...... کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔'' ڈاکٹر کی باتوں کا اثر تھا یا پھر واقعی وہ اپنے ذہنی دباؤ سے نکلنے کی کوشش میں تھی۔ اسی لیے بے بسی ظاہر کرنے لگی۔

''سب اچھا لگے گا جب اپنے گھر کو 'اپنا' محسوس کرنے لگو گی۔ دیکھو بیٹا! میکہ بیٹی کا مان ہوتا ہے اور یہ مان تب سلامت رہتا ہے جب شوہر کا ساتھ اُس کی محبت اور رفاقت بیٹی کے ہم قدم ہو...... ورنہ تو۔'' بی بی جان بولتے بولتے خاموش ہو گئیں۔ اُن کا خیال تھا انعم کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ وہ سمجھدار با شعور ہے۔ آسانی سے اُن کی بات سمجھ سکتی ہے۔ انعم نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ بلکہ گھر تک وہ بالکل خاموش رہی تھی۔ اُن کے لیے یہی بات تسلی بخش تھی۔

☆......☆......☆

ثمن اور ضیغم بچوں کو لے کر اصم سے ملوانے گئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا سبھی کھا چکے تھے۔ سبرینہ کچن سمیٹ کر بی بی جان اور بابا جان کے لیے قہوہ بنا کر باہر نکلی تو بی بی جان کو لاؤنج میں ہی بیٹھے پایا۔ انعم کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ جبکہ نیلم کی ڈیوٹی لگی تھی کہ جب تک اروی صحت یاب نہیں ہو جاتی اور اصم گھر نہیں آ جاتا۔ وہ اروی کے ساتھ ہی رات کا کھانا کھایا کرے۔ ویسے بھی وہ رات اُسی کے ساتھ گزارا کرتی تھی۔ سو وہ بھی نہیں تھی۔ سبرینہ کو بی بی جان کا اس وقت وہاں بیٹھنا عجیب لگ رہا تھا۔

''بی بی جان آپ یہاں؟ میرا مطلب ہے قہوہ...... بابا جان...... اپنے روم میں ہیں۔''

''ہاں وہ کچھ مطالعہ کر رہے تھے۔ انہیں قہوہ دے آؤ میرا ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ بچے آتے ہیں تو

اکٹھے پی لیں گے۔'' بی بی جان نے کچھ بے دلی سے کہا۔ سبرینہ کو تشویش ہوئی۔ بی بی جان سہ پہر سے ہی کچھ چپ چپ سی تھیں۔ انعم کا خیال رکھنے کی ہدایت انہوں نے سب کو ہی دی تھی اور ڈاکٹر کے خدشات بھی بتا دیے تھے۔

ثمن نے سب کی طرف سے انہیں اطمینان بھی دلا دیا تھا۔ اُس کے باوجود کوئی بات کوئی مسئلہ تھا جو وہ کسی کو بتا نہیں رہی تھیں۔ سبرینہ کو اُسی بات کی کھوج تھی۔ سبرینہ اُن کی ہدایت پر بابا جان کو قہوہ دے کر پھر سے اُن کے پاس آ بیٹھی۔ بی بی جان بظاہر تو ٹی وی کی خبریں دیکھ رہی تھیں مگر تاثرات سے لگتا تھا وہ اور...... اُن کی سوچیں کہیں اور ہیں۔

''بی بی جان...... آپ کیوں اتنی اپ سیٹ ہیں۔'' سبرینہ نے انہیں مخاطب کر کے ماحول میں کھینچ لیا تھا۔

''بیٹا! میں اپ سیٹ نہ ہوؤں تو کیا کروں؟ حالات تم لوگوں کے سامنے ہیں۔ ایک طرف اصم کی صحت نے فکر مند کر رکھا ہے اور دوسری طرف اب انعم کی کنڈیشن پر پریشان ہوں۔ اُس کا بی پی نارمل نہیں رہتا۔ یہ اچھا سائن نہیں ہے۔'' بی بی جان نے لمبی سانس کھینچ کر اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

''ہوں...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... مگر کیا کریں۔ انعم کو خود اپنی فکر نہیں ہے۔ بات بات پر اُلجھنا بھڑکنا اُس کے لیے ہی خطرناک ہو سکتا ہے۔ میں تو بہت بار سمجھا چکی ہوں لیکن......'' سبرینہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی اور بی بی جان کے تاثرات دیکھنے لگی۔

''جانتی ہوں...... وہ تھوڑی جذباتی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی اُسے سمجھایا ہے...... مجھے تم لوگوں سے بھی تعاون کی ضرورت ہے۔'' بی بی جان پہلی بار خود کو بے بس محسوس کر رہی تھیں۔

''بی بی جان یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں تو آپ سے کہنے والی تھی کہ آپ بار بار اُسے واپس جانے کے لیے پریشرائز نہ کریں۔ اچھا ہے وہ ڈلیوری تک یہیں رہے۔'' سبرینہ نے مزید اپنائیت دکھائی۔

''یہاں...... ڈلیوری تک...... میں تو چاہتی ہوں کہ وہ اپنے گھر جا کر رہے...... ڈاکٹر رافیہ کا بھی یہی کہنا ہے کہ اُسے یہ وقت اپنے شوہر کی توجہ میں گزارنا چاہیے تبھی وہ ذہنی دباؤ سے نکل سکے گی۔'' بی بی جان ہمیشہ ثمن سے دل کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ آج نجانے سبرینہ سے کیوں حالِ دل کہنے پر مجبور ہوئی تھیں۔ یہ انہیں خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''لیکن انعم تو خود وہاں نہیں جانا چاہتی۔'' سبرینہ نے اپنے طور پر انہیں یاد دلایا۔

''وہ تو بے وقوف ہے اپنے اچھے برے کی تمیز ہی نہیں۔ فائق ہی عقل سے کام لے لے تو...... انعم آخر اُس کی بیوی ہے۔ وہ ہی لینے آ جائے اسے۔'' بہت وقت سے بی بی جان نے اپنی اَنا اور بھرم کو پسِ پشت رکھا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ فائق بھائی کو آنا تو چاہیے۔ مگر پتہ نہیں وہ کیوں نہیں آ رہے۔''

''شاید...... یہ انعم کے رویے کی وجہ سے...... صالحہ خالہ کے سامنے بھی تو انعم نے ہنگامہ کیا تھا۔ معاف کیجیے گا بی بی جان مجھے کہنا پڑ رہا ہے۔ آخر وہ بیٹے کی ماں ہیں اور......'' سبرینہ کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ثمن لوگ اور بچے آ گئے تھے۔ بی بی جان احساسِ شرمندگی سے چپ سی تھیں۔ آخر انہیں اللہ حافظ کہہ کر

اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆......☆......☆

اروئی کو کچھ بے چینی سے نیند نہیں آ رہی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ نیلم اب تک جاری تھی اور لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہی تھی یا چیٹنگ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ کئی باراُس کے دل میں آیا بھی کہ وہ صوفے پر بیٹھی نیلم کو مخاطب کر کے پوچھے لیکن پھراُس کی ناراضگی کا سوچ کر چپ کر کے بیٹھ گئی۔

''بھابی...... آپ کو نیند نہیں آ رہی کیا؟'' اُسے کروٹیں بدلتے دیکھ کر نیلم نے خود ہی مخاطب کر لیا۔

''ہا...... ں...... پتہ نہیں گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔''

''ہائی پوٹینسی اینٹی بائیوٹک لینے سے ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ دودھ اور جوس زیادہ لیا کریں۔ آپ کھانا بھی کم ہی کھاتی ہیں۔ اس طرح تو ہوگا پھر۔'' نیلم بہت اپنائیت سے جواب دیتی اپنا لیپ ٹاپ بند کر کے میز پر رکھنے کے بعداُس کے قریب آ بیٹھی۔

''مجھ سے کھایا ہی نہیں جاتا۔ دواؤں نے منہ کا ذائقہ ہی بدل دیا ہے۔ تم میری وجہ سے ڈسٹرب ہو رہی ہونا؟''

''نہ...... نہیں بھابی...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' نیلم نے فوراً تردید کر دی۔ حالانکہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی بے چین ہے۔

''پھر تم نے اپنا لیپ ٹاپ کیوں آف کر دیا؟ نیلم...... پلیز تم میری وجہ سے اپنا کوئی کام مت روکا کرو...... مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔''

''بھابی...... ایسا کوئی خاص کام نہیں تھا۔ کچھ دوستیں آن لائن تھیں تو ہم لوگ چیٹ کر رہے تھے۔''

''اچھا......! میں سمجھتی کہ تم سلیبس سے متعلق کوئی انفارمیشن لے رہی ہو۔'' اروئی لیٹے سے اُٹھ بیٹھی فریکچر ہوئے بازو میں کچھ تراماہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔

''ضرورت پڑے تو لے بھی لیتی ہوں۔ لیکن زیادہ تر تو اس وقت دوستوں سے چیٹ کر کے مزا آتا ہے۔ سارا دن پڑھائی میں ہی گزرتا ہے۔ بہت بورنگ لگتا ہے کبھی کبھی۔''

''ہاں یہ تو ہے...... یہ ٹائم پریڈ کتنا ٹف لگتا ہے لیکن جب گزر جاتا ہے تو پھر دل چاہتا ہے کہ واپس لوٹ آئے۔'' اروئی بھی تائید کرتے ہوئے اپنے ماضی کے اُن لمحات کو محسوس کرنے لگی جب وہ بھی کالج جایا کرتی تھی۔

''رئیلی......! ایسا ہوتا ہے کیا؟'' نیلم دلچسپی سے پوچھتی بہت معصوم لگ رہی تھی۔

''ایسا ہی ہوتا ہے...... اسٹوڈنٹ لائف گزر جائے تو سبھی کچھ یاد آتا ہے۔ کالج...... ٹیچر...... دوست راستے...... درخت، پھل پھول اور......'' اروئی جیسے بولتے بولتے کہیں کھوگئی تھی۔

''اور کالج کینٹن کے سموسے رول، کوک پکوڑے ہے ناں......'' نیلم بات بڑھا کر بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ اروئی بھی ہنس دی تھی۔

''بالکل...... صحیح کہہ رہی ہو۔ شاید ہر لڑکی ان چیزوں کو مس کرتی ہے۔'' اروئی کو نیلم کی باتیں کافی ہلکا پھلکا کر گئیں۔ کتنی دیر تک نیلم اپنی دوستوں کی باتیں اور شرارتیں اُسے بتاتی رہی۔ انعم کے حوالے سے جو

خوف ورنج اُس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ وہ نیلم کی اپنائیت نے ختم کر دیا تھا۔ سب اُس کے اپنے تھے' اُس نے شکر ادا کیا۔

☆......☆......☆

فائق حسب معمول گزشتہ رات بھی دیر سے گھر آیا تھا۔ صالحہ صبح ناشتے پر بھی اُس کے اٹھنے کا انتظار کرتی رہیں۔ مگر وہ گیارہ بجے تک بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ تنگ آ کر انہوں نے خود ہی ناشتہ کر لیا۔

بلال درانی آج کل بزنس ٹور پر تھے اور وہ اُن کے نہ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے وہ ناشتے کے لیے آیا تو صالحہ نے خاصی خفگی سے اُسے دیکھا۔

''فا...... ئق تمہاری روٹین کیا ہو رہی ہے آج کل......''

''کیا ہو گیا ہے میری سوئٹ ماں...... ذرا سی تو دیر ہوئی ہے۔'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے خوشگوار موڈ سے بولا تو وہ مزید بھڑ کیں۔

''ذرا سی دیر......؟ بلال دو بار فون کر کے پوچھ چکے ہیں تمہارا...... تم کل بھی لنچ کے بعد آفس گئے تھے۔''

''اُ...... ف...... آپ اور ابو میری انکوائری کرتے رہا کریں بس۔'' اُس کا خوشگوار موڈ فوراً بدل گیا۔

''میری اپنی کوئی لائف نہیں ہے کیا؟ ہر وقت مشین بنا رہوں کیا؟''

''اپنی زندگی بھی تم نے تماشہ بنائی ہوئی ہے۔ ضد کر کے دھمکیاں دے کر تم نے پسند کی شادی کی تھی۔ اب وہی پسند...... ناپسند ہو گئی۔ آخر اس مسئلے کا کیا حل سوچا ہے تم نے۔'' صالحہ کو سبرینہ نے فون کر کے انعم کے حوالے سے ڈاکٹر کے خدشات بتا دیے تھے۔ کچھ بھی اختلاف سہی آخر انعم اُن کی اولاد کی اولاد پیدا کرنے والی تھی۔

''اُس عورت کی ضد اور ہٹ دھرمی کا کوئی حل نہیں ہے میرے پاس...... آپ صبح صبح میرا موڈ خراب مت کریں۔''

''حل تو سوچنا پڑے گا بیٹا جی...... آخر تمہاری اولاد ہے اُس کے پاس۔'' صالحہ نے اُسے باور کراتے ہوئے اُس کے رویے کا بھی احساس دلایا۔

''ابھی تک اُس کی ہر ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔' اُس کا نقصان' تمہارا نقصان ہو گا...... یہ یاد رکھو۔''

''میں ہی یاد رکھوں سب کچھ...... اُسے خود احساس نہیں ہے۔'' سامنے پڑے فریش جوس کا گلاس بھر کر اُس نے منہ سے لگا کر گھونٹ بھرا۔ لگتا تھا اُس نے خود پر قابو رکھنے کی کوشش کی ہے۔

''اُسے احساس نہیں ہے تو تم بھی تو بے حس بن رہے ہو۔ اُس کی فیملی اس وقت کرائسز میں ہے۔ اُسے تمہاری ضرورت ہے۔'' صالحہ نے پوری ایمانداری سے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ کیا چاہتی ہیں۔ میں جا کر اُس کے سامنے ہاتھ جوڑوں۔ معافی مانگوں کہ آئندہ وہ جو چاہے کرتی رہے۔'' وہ قدرے جھنجلایا۔

''میں نے کب کہا کہ تم معافی مانگو میں تو چاہتی ہوں کہ تم اپنے بچے کی خاطر ایک بار اُسے گھر لے آؤ۔

وہاں وہ ٹینشن میں ہے۔ بچے کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔'' صالحہ نے ایک بار پھر نرمی سے سمجھایا۔
''اور اگر وہ نہ آئی تو آئندہ وہ خود آئے گی۔ میں اُسے لینے نہیں جاؤں گا اور نہ ہی آپ۔'' وہ قطعیت سے کہتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُن کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔
''فا......ئق ناشتہ تو کرلو۔'' صالحہ بھی کرسی سے اٹھ گئیں۔
''رہنے دیں...... آفس میں جا کر کرلوں گا۔'' صالحہ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جبراً مانا ہے' نجانے وہ انعم سے اس قدر بددل کیوں ہو رہا تھا۔ یہ بات انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ٹھیک ہے وہ انعم کی لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا گلہ ضرور کرتی تھیں مگر اُن کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ دونوں میاں بیوی کے درمیان فاصلے پیدا ہو جائیں۔ انہیں کچھ شک سا ہونے لگا تھا۔ انہیں اپنا شک دور کرنا تھا۔

☆......☆......☆

سبرینہ معمولات سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں کچھ دیر ستانے کو آ بیٹھی تھی۔ اُس کا یہ وقت اپنی ماما سے بات کرنے کا بھی ہوتا تھا۔ اور آج کل تو وہ بہت بے چینی سے اس فراغت کا انتظار کیا کرتی تھی۔
چند ایک معمول کی باتوں کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گئی۔ زیب النساء بھی جیسے بتانے کو بے چین تھیں۔ اپنی اور صالحہ کی ساری باتیں کہہ سنائی۔
''یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا ماما کہ صالحہ خالہ سے جا کر مل آئیں۔ اب شہری کو بھی ذرا سمجھائیں کہ وہ اُن کے پاس آتی جاتی رہا کرے۔'' وہ ذرا پُرجوش ہو کر بولی۔
''ہاں میں نے بھی یہی سوچا ہے کہ ایک دوبار خود زبردستی اُسے وہاں لے کر جاؤں۔ فائق سے آمنا سامنا ہوگا تو اُس کا بھی ذہن بدلے گا۔'' زیب النساء نے اپنا پلان بتایا۔
''بالکل ٹھیک سوچا ہے ماما...... پہلے تو ہم بے خبری میں بے وقوف بنے رہے۔ مجھے تو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ صالحہ خالہ فائق کے سامنے کمزور پڑ جائیں گی۔ خیر...... قسمت ہمیں پھر موقع دے رہی ہے۔'' سبرینہ کا ذہن بہت دور تک سوچ رہا تھا۔
''مجھے بھی اب شہری کی ہی فکر ہے۔ اُس کا دل اُس کی سوچ فائق میں اٹکی ہے۔ وہ کسی اور کے لیے کبھی نہیں مانے گی۔ مجھے معلوم ہے۔'' زیب افسردہ سی بولیں تو سبرینہ بے چین ہوگئی۔
''ماما آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ مجھے شہری اگر پہلے بتا دیتی تو میں پہلے ہی کچھ کر لیتی۔ ابھی بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے آپ دیکھتی جائیں۔''
''کیا...... کروگی تم؟ سنو سبرینہ کوئی بے وقوفی نہ کر لینا...... میرا مطلب ہے...... تم اُس گھر کی بہو ہو اور انعم بیٹی۔'' زیب کو یکدم خوف سا ہوا کہ سبرینہ بہن کی خاطر اپنا گھر نہ برباد کر لے۔
''ماما...... کچھ نہیں ہوگا...... اور میرا نام بھی نہیں آئے گا۔ وہ دونوں خود ایک دوسرے سے بیزار ہو رہے ہیں۔ اب ہمارا کیا قصور......'' سبرینہ بے ساختہ کھلکھلائی۔ دوسری طرف زیب بھی مسکرا دیں۔

☆......☆......☆

زبیدہ تسبیح ایک طرف رکھ کر اپنا سیل فون لینے اٹھی تھیں۔ اسم سے بات کرنا چاہتی تھیں تاکہ اُس کی خیریت معلوم کر سکیں۔ موبائل بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔ ابھی انہوں نے موبائل پکڑا ہی تھا کہ صالحہ درانی کی

کال آ گئی۔ صالحہ کا نام موبائل اسکرین پر دیکھتے ہی اُن کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔
''خدا خیر کرے......'' خود کلامی کرتے ہوئے انہوں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کال ریسیو کی۔
''السلام علیکم!'' صالحہ نے رابطہ ہوتے ہی سلامتی بھیجی تو زبدہ کو اُن کے لہجے سے کچھ تسلی سی ہوئی۔
''وا...... علیکم السلام...... میں سوچ ہی رہی تھی کہ آج آپ کو کال کروں۔'' زبدہ (بی بی جان) نے برسبیل بات بڑھائی۔ اُس دن کی شرمندگی کے باعث صالحہ سے بات کرنے کا حوصلہ بھی وہ خود میں نہیں پاتی تھیں۔
''ایک ہی بات ہے آپ نے سوچا اور میں نے عمل کرلیا...... دراصل میں نے ایک ضروری بات کے لیے فون کیا ہے۔ وہ...... فائق اور انعم اپنی اپنی جگہ پر...... مجھے لگتا ہے وہ دونوں اپنا رشتہ بچانا ہی نہیں چاہتے۔ میں اس بات پر پریشان ہوں۔'' صالحہ نے بہت ٹھہر ٹھہر کر بات مکمل کی تھی۔ اس دوران بی بی جان کی سانس رُک رُک کر چلیں۔
''پر...... یشان تو میں بھی ہوں۔ صالحہ...... بہن وہ دونوں تو نادان ہیں۔ ہم بڑوں کو کچھ کرنا پڑے گا۔ انہیں اس طرح بے وقوفیاں کرتے تو نہیں دیکھ سکتے۔''
''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... بھابی جان...... میں نے اسی لیے تو فون کیا ہے...... مجھے احساس ہے بچوں کے جذباتی فیصلے انہی کے لیے نقصان دے ہوں گے اور پھر دکھ تو ہم بھی جھیلیں گے۔'' صالحہ نے پوری سچائی سے دلی کیفیت عیاں کی۔
''میں تو آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔ انعم سے آپ کو جو شکایتیں ہیں بخدا میں اُن سے لاعلم تھی۔ ورنہ یہ نوبت ہی نہ آتی۔'' بی بی جان مزید مصلحت آمیزی سے بولیں۔
''ایسی باتیں نہ کریں...... شرمندہ تو میں بھی ہوں۔ فائق نے اس موقع پر انعم کے آنے جانے کو انا کا مسئلہ بنالیا...... حالانکہ اس سے پہلے اُس نے کبھی روک ٹوک ہی نہیں کی تھی۔'' صالحہ بھی دل سے معذرت کررہی تھیں۔
''اسی لیے تو میں بھی حیران تھی کہ......''
''بس کیا کریں۔ آج کی نسل بہت جذباتی اور جلد باز ہے۔ بہر حال میں نے فائق کو سمجھایا ہے اور کہا ہے کہ وہ انعم کو گھر لے آئے۔ آپ ذرا انعم کو بھی سمجھایئے گا کہ وہ بھی خود پر قابو رکھے۔ مرد عورت کے سو نخرے اٹھالیتا ہے مگر...... مقابلتاً ضد باندھ لے تو برداشت نہیں کرتا۔''
''آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔'' بی بی جان نے تائید کی۔
''آپ فکر نہ کریں صالحہ بہن میں انعم کو سمجھا دوں گی۔'' بی بی جان نے انہیں اطمینان دلایا انعم کی صحت کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے گھر جا کر رہے۔ بی بی کو اور کیا چاہیے تھا کہ صالحہ نے خود رابطہ کر کے اُن کی مشکل آسان کردی تھی۔

☆......☆......☆

بی بی جان فون سننے کے بعد فوراً ہی انعم کے کمرے میں چلی آئیں۔ انعم فروٹ کی پلیٹ سامنے رکھے سیب کھانے میں مصروف تھی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ حیرت ظاہر کیے بغیر نہ رہی۔

''بی بی جان...... آپ کو کوئی کام تھا؟''

''ہا...... ں کام ہی سمجھو۔'' وہ سنجیدگی سے کہتیں اُس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ انعم کے چہرے پر اُلجھن سی نظر آنے لگی۔ ڈاکٹر کے پاس سے آنے کے بعد سے دونوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔

''کا...... م؟ آپ مجھے بلوا لیتیں بی بی جان۔''

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ ہماری بات ہمارے درمیان رہے۔ کوئی تیسرا دخل نہ دے۔'' بی بی جان نے بہت نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ چاہتی ہیں کہ میں واپس چلی جاؤں؟'' انعم نے اُن کا چہرہ پڑھ کر جو اخذ کیا فوراً کہہ دیا۔

''اسی میں تمہاری اور بچے کی بہتری ہے۔'' بی بی جان نے بھی انعم کے چہرے پر کشمکش سی پڑھ لی تھی۔

''اس بات کو بھول جاؤں کہ فائق نے 'اپنے' گھر میں نہ آنے کا کہا تھا۔ مجھے ذلیل کر کے چھوڑ کر گیا تھا؟''

''شوہر اور بیوی کے درمیان اَنا نہیں ہونی چاہیے بیٹا...... زندگی میں مرد جب شوہر کے رشتے میں آتا ہے تو اُس کی شخصیت میں واضح تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ ماں اور بہن کے لیے وہ جتنا فرمانبرداری اور محبت رکھتا ہے وہ رویہ بھی بدلتا ہے...... بیوی سے اُس کی توقعات بڑھ جاتی ہیں۔ تمہیں صرف اپنے لیے 'کمی' محسوس ہوتی ہے' ہوسکتا ہے وہی 'کمی' اُسے بھی محسوس ہوتی ہو۔'' بی بی جان نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ ہمیشہ دوسروں کی ہی فیور کرتی ہیں بی بی جان۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''ابھی تمہیں ایسا ہی لگے گا...... دراصل یہ تمہاری محبت و ہمدردی ہے۔ مجھے تمہاری عزت' تمہارا سکون چاہیے۔ جو کہ تمہیں اپنے گھر میں ہی میسر آسکتا ہے۔''

''بی...... بی...... جا...... ن وہ میرا گھر نہیں ہے۔ فائق طعنے دیتے ہیں۔ صالحہ آنٹی کا رویہ......'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''یہیں پر تو تم غلط ثابت ہو جاتی ہو انعم۔ تم خود اپنے گھر کو 'اپنا' نہیں سمجھتیں...... صالحہ کا رویہ تو خراب ہوگا ہی تم سے...... اور...... اور فائق بھی اسی لیے چڑ کر تمہیں طعنے دیتا ہوگا...... بہرحال میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ فائق تمہیں لینے آرہا ہے۔''

''کیا......؟ وہ نہیں آسکتا اُس نے کہا تھا کہ......'' وہ اُن کے سمجھانے کا اثر لیے بغیر کچھ بے یقینی و جذباتی پن سے بولی۔

''چھوڑ دو پرانی باتیں...... اپنا نہیں تو اپنے بچے کا خیال کرو...... تمہارا اپنا رویہ تمہارے بچے کی صحت اور زندگی کے لیے نقصان دہ بن رہا ہے۔ تم صرف فائق کو الزام دیتی رہتی ہو۔'' بی بی جان نے اُسے غصے اور سنجیدگی سے احساس دلانے کی کوشش کی۔

''بی بی جان آپ کو نہیں پتہ وہ میرے ساتھ کیا کرتا ہے۔'' انعم ماننے پر تیار نہیں تھی۔

''خدا کے لیے انعم ناشکری مت کیا کرو...... میں خود گواہ ہوں...... فائق تمہارا بہت خیال رکھتا رہا ہے۔''

''سب دکھاوا تھا...... فریب تھا۔ اُس شخص کو کبھی میری پرواہ نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو مجھے اس طرح نہ چھوڑ کر جاتا۔'' انعم رونے لگی تھی۔ بی بی جان کے لیے یہ لمحہ مشکل ترین تھا۔ وہ اُسے سمجھائیں تو کیسے...... وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھیں۔ انعم کی ضد بچگانہ سی تھی۔ وہ رشتوں کی نزاکت ہی نہیں سمجھ رہی تھی۔

''انعم...... جو کچھ بھی ہے بہر حال اب وہ تمہارا شوہر ہے۔ اُس کی عزت تم پر فرض ہے اور یہ مت بھولو کہ تمہارے بابا جان تم سے کتنی بھی محبت کر لیں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دیں کہ تم اپنے گھر کو چھوڑ کر یہاں آ بسو...... تمہیں فائق کے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔ ہمیں زبردستی نہ کرنی پڑے۔'' بی بی جان اُسے حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے نکل گئیں۔

☆......☆......☆

زہرا کچن میں کھڑی وردہ کی فرمائش پر شام کی چائے کے ساتھ پکوڑے تل رہی تھیں۔ زمین بھی اروی کی خیر خبر لینے آئی بیٹھی تھی۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وردہ اور زمین بھی کچن کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔

''ارے تم یہاں کہاں آ گئیں۔ کمرے میں جا کر بیٹھو یا پھر صحن کے تخت پر۔'' زہرا نے تیل کی کڑاہی میں تیرتے پکوڑوں کو اُلٹ پلٹ کرتے کہا تو وردہ بے صبرے پن سے بولی۔

''امی...... اتنے مزے کی خوشبو آ رہی ہے کہ مجھ سے اُدھر بیٹھا نہیں گیا۔ جلدی کریں نا۔'' وردہ نے آگے ہو کر کڑاہی میں جھانکا تو زہرا نے مصنوعی خفگی سے دیکھ کر کہا۔

''تمہاری جلدی...... جلدی میں پکوڑے یا تو کچے رہ جائیں گے یا پھر جل جائیں گے۔ آرام سے جا کر بیٹھو...... میں ساتھ ہی چائے کے لیے پانی بھی رکھتی ہوں۔''

''امی چائے رہنے دیں۔ زہیر بھائی سے کولڈ ڈرنک منگوا دیں...... زمین آپی کتنے دنوں بعد آئی ہیں۔'' اُس نے اپنی خواہش زمین پر رکھی تو وہ جھٹ بولی۔

''نہیں...... نہیں آنٹی...... میں تو چائے ہی پیوں گی۔ پکوڑوں کے ساتھ تو چائے ہی مزا دیتی ہے۔''

''زمین آپی کیا تھا' آپ نہ بولتیں...... آپ کے بہانے مجھے کولڈ ڈرنک تو ملتی۔'' وہ بچوں طرح خفا ہوئی۔

''ہا...... ں پہلے تو تم ترستی رہتی ہو...... جاؤ باہر لا کر میز رکھو...... اور زہیر کو بھی آواز دو آ کر گرم گرم پکوڑے کھا لے۔'' زہرا نے چڑ کر اُسے ہدایت دی۔ وہ منہ بسور کر پلٹ گئی۔ جبکہ زہرا پکوڑے کڑاہی سے نکالتے ہوئے زمین سے مخاطب ہوئیں۔

''تم سناؤ...... تمہارے ماموں آئے ہوئے تھے۔ کوئی بات بنی؟'' اُن کا اشارہ اُس کے رشتے کی طرف تھا۔

''آنٹی...... ممانی نے بات بنانے کے لیے تو نہیں بگاڑی تھی۔ آپ تو جانتی ہیں امی کا غصہ۔'' وہ بھی سنجیدہ سی ہو گئی۔

''ظاہر ہے! بیٹیاں کوئی بھاری تو نہیں ہوتیں۔ انہیں تمہاری ممانی پر غصہ تو رہے گا۔ بچپن سے بات طے تھی تمہاری۔ اس اسٹیج پر بات ختم کرنا' کوئی مذ...... ا...... ق ہے۔'' انہوں نے ایک لمحہ کے لیے زمین

کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اُس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا تھا۔
''اچھا ہوا امی...... زمین آپی کی جان چھوٹ گئی...... مجھے تو شروع سے ستارہ ممانی' انگارہ ممانی لگا کرتی تھیں۔ جب جب بھی زمین آپی کے گھر آتی تھیں۔ عجیب طرح کا رویہ ہوتا تھا۔
''وردہ پھر سے سر پر آ کھڑی ہوئی تھی' اور اُس کی بات پر باوجود غصہ کے زہرا کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ زمین بھی سر جھکا کر ہنس دی۔ ہنسنے کے بعد بولی۔
''وردہ ٹھیک کہہ رہی ہے آنٹی...... میں نے بھی شکر ادا کیا ہے کہ میری جان چھوٹ گئی۔ میں بھی کہاں ستارہ ممانی کے انگارے سننے سہنے کی ہمت رکھتی تھی۔'' بظاہر اُس نے بھی مزاح کے رنگ میں تسلی دی تھی۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ ستارہ ممانی کے آتشِ فشانی مزاج کے ساتھ زندگی بھر گزارا واقعی مشکل ہو جاتا۔ بچپن کے رشتے کی دل سے تھوڑی بہت اُنسیت تو بہر حال قائم تھی مگر اُسے یقین تھا وہ رفتہ رفتہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ زہرا نے بھی موضوع بدلنے کی خاطر دونوں کو پکوڑوں کی بھری پلیٹ پکڑا کر صحن میں جانے کا مشورہ دیا۔ اور خود کڑاہی میں مزید پکوڑوں کا آمیزہ ڈالنے لگیں۔

☆......☆......☆

بی بی جان نے ثمن کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ سبرینہ کو ایک تجسس نے گھیر رکھا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ بی بی جان غیر مطمئن اور پریشان سی ہیں حالانکہ بی بی جان نے اُسے بھی 'وجہ' تو بتائی تھی۔ پھر بھی اُسے تجسس نے گھیر رکھا تھا کہ بات اُس 'وجہ' کے علاوہ بھی ہے۔ اسی لیے وہ بھی شادو کو رات کے کھانے کے لیے بنتی مٹن پلاؤ کی یخنی کا خیال رکھنے کا کہہ کر کچن سے نکل کر بی بی جان کے کمرے کے دروازے کے آگے کان لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس کی توجہ اُدھر ہونے کے ساتھ بی بی جان کی باتوں پر بھی تھی۔

☆......☆......☆

''ثمن...... بیٹا تم خیال رکھنا...... فائق جب بھی آئے اُس سے کسی قسم کا بھی گلہ شکوہ نہ کیا جائے۔'' بی بی جان ثمن کو ہدایت دے رہی تھیں۔ باہر کھڑی سبرینہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ...... فائق آ رہا ہے۔ یعنی وہ انجم کی خاطر...... انجم کو لینے...... یہ کیسے ممکن تھا؟ وہ تو کچھ اور سوچ رہی تھی اور...... یہ کیا ہونے جا رہا تھا اور کیسے...... سبرینہ کو بے چینی سی ہونے لگی۔
''بی بی جان...... آپ بے فکر رہیں...... آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہو گا۔ میں سبرینہ سے بھی ڈسکس کر لیتی ہوں۔''...... ثمن کی اپنائیت لہجے سے بھی ظاہر ہوتی تھی اور عمل سے بھی بی بی جان کے چہرے پر اطمینان سا بکھر گیا۔
''ہاں بیٹا...... سبرینہ کو بتا دو...... ویسے بھی مجھے لگتا ہے یہ سبرینہ ہی کی کوشش ہے۔ اُس نے ہی اپنی خالہ کو قائل کیا ہو گا۔ تبھی فائق آنے پر راضی ہوا ہے۔'' بی بی جان نے اپنے احساسات بیان کیے۔
''یہ تو اچھی بات ہے بی بی جان...... یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹنے میں ہی دونوں گھروں کا سکون ہے۔'' ثمن نے اُن کے اطمینان کو بڑھانے کے لیے دل سے کہا۔
''آپ تسلی رکھیں۔ میں جا کر ڈنر کا انتظام دیکھتی ہوں۔''

سبرینہ اپنی سوچوں میں گم ہونے کے باوجود اندر کی آوازوں پر اپنے کان دھرے ہوئے تھی۔ آہٹ پر اُس نے جلدی سے اپنے قدم موڑے، ثمن باہر آئی تو سبرینہ کو اتنے قریب دیکھ کر پہلے تو اُسے حیرت ہوئی پھر اُس نے اپنے خیال کو وہم جان کر جھٹک کر سبرینہ کو پیچھے سے مخاطب کیا۔

''سبرینہ...... تم؟'' ثمن کی پکار پر سبرینہ کسی چور کی مانند بوکھلا کر صفائی دینے لگی۔

''ہا...... ں...... وہ دراصل......''

''مجھے......؟ تمہیں معلوم تو تھا مجھے بی بی جان نے بلوایا ہے؟'' ثمن کو سبرینہ کی بات سن کر مزید حیرت ہوئی۔

''اوہ...... میرے ذہن سے ہی نکل گیا۔ میں سمجھی آپ اروی کے پاس ہیں۔'' سبرینہ نے اپنے تاثرات سنبھالتے ہوئے بات بنائی۔ تو ثمن نے بھی اپنے وہم کو جھٹکا۔

''نہیں...... میں بی بی جان کے پاس تھی۔'' کچن کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ثمن نے مزید بات بڑھائی۔

''انہوں نے بتایا ہے کہ شاید آج فائق آجائے؟ اس لیے ہم ذرا محتاط رہیں۔ کوئی پرانی بات، گلہ شکوہ فائق سے نہ کریں۔''

''یہ ہدایات تو انعم کو دینی چاہیے تھی۔ ہم تو محتاط ہو جائیں گے۔ وہ خود پر کنٹرول رکھے گی؟'' آخر سبرینہ کی نہ کسی طرح دل کی بات زبان پر لے ہی آئی۔ ثمن نے فریزر کا ڈھکن کھولتے ہوئے نظر اُٹھا کر سبرینہ کے تاثرات ملاحظہ فرمائے۔ وہ فوراً رخ بدل گئی۔

''بی بی جان نے اُسے بھی سمجھایا ہی ہوگا...... خیر تم بتاؤ ڈنر کے لیے اور کیا ڈش بنائیں۔''

''میں تو تقریباً ڈنر کی تیاری کر چکی ہوں۔ آپ دیکھ لیں کیا بنانا چاہتی ہیں۔'' سبرینہ نے صاف دامن بچایا تھا۔ ثمن نے اُس کے رویے پر غور کیے بغیر فریزر میں سر گھسا کر مٹن چانپ کا پیکٹ نکالا اور بات کرتے کرتے سنک میں رکھا۔

''کوئی بات نہیں مٹن فرائی چانپ میں بنا لیتی ہوں اور کریم سلاد بھی...... تمہیں جو کام کرنا ہے کر لو۔''

''میں ابھی...... بچوں کو دیکھ کر آتی ہوں۔ نیا ٹیوٹر ہے اُس پر نظر رکھنی بھی ضروری ہے۔'' سبرینہ نے وہاں سے راہِ فرار ڈھونڈ ہی لی۔

☆......☆......☆

بچوں کے ٹیوٹر کا تو بہانہ تھا۔ سبرینہ وہاں سے سیدھی انعم کے کمرے میں چلی آئی۔ انعم کپڑوں کی لماری سے اپنا سوٹ نکال کر شمو کو استری کرنے کے لیے دے رہی تھی۔

''یہ لو شمو...... اور دیکھو احتیاط سے پریس کرنا جلا مت دینا...... پچھلی بار بھی تم نے میرا دوپٹہ جلا دیا تھا۔'' انعم گہرے فیروزی مشینی کڑھائی والا شیفون کا سوٹ لے کر مڑی اور شمو کی طرف بڑھایا۔

''باجی میں سچی کہہ رہی ہوں وہ میں نے نہیں جلایا تھا۔ وہ تو شاید...... گڈی کے دروازے میں پھنسنے کی وجہ سے......'' شمو اپنی صفائی دینے لگی تو سبرینہ نے اُسے اندر آتے ہوئے جھاڑ دیا۔

''اچھا جاؤ...... اپنا کام کرو...... زیادہ باتیں نہ بنایا کرو۔'' شمو سبرینہ اور انعم کے رویے سے اکثر

خائف سی رہتی تھی۔ منہ بنا کر وہاں سے نکل گئی۔
اس کے جاتے ہی سبرینہ نے جھٹ سوال کیا۔
''تمہیں پتہ ہے؟ فائق آ رہا ہے۔''
''اونہہ...... وہ کہاں آئے گا...... بی بی جان کو خوش فہمی ہو رہی ہے۔'' وہ نخوت سے بولتی ٹی وی ریموٹ لے کر بیڈ پر آرام سے بیٹھ گئی اور ٹی وی آن بھی کر لیا۔
''ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ بی بی جان کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اُس نے آنا ہوتا تو...... تم سے کوئی رابطہ تو رکھتا۔'' سبرینہ کے تنے ہوئے اعصاب انعم کے جواب سے قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔
''اُسے میری پرواہ نہیں ہے۔ مگر بی بی جان بضد ہیں کہ مجھے 'اپنے' گھر میں جا کر رہنا چاہیے۔'' اُس کا لہجہ مزید تلخ ہوا۔
''کیا؟ تم چلی جاؤ گی؟'' سبرینہ نے اُسے کریدا۔ انعم کے رویے سے وہ صحیح اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی۔
''پہلے وہ آئے تو سہی...... پھر ہی طے ہوگا کہ مجھے جانا ہے یا رہنا ہے مجھے تو یقین ہی نہیں ہے کہ وہ آئے گا۔''
''اگر وہ...... وہ آ گیا تو...... میرا مطلب ہے تم چلی جاؤ گی...... خاموشی سے...... اپنی بے عزتی بھلا دو گی؟ فائق نے تمہیں واپس نہ آنے کے لیے کہا تھا۔ اور......'' سبرینہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ کر دبی چنگاری کو پھر سے کریدا۔
''اسی بات کا تو رونا ہے۔ بی بی جان کو میری سیلف ریسپیکٹ کا خیال نہیں ہے۔ خاندانی عزت و وقار کے علاوہ وہ شوہر کے حقوق جتانے یاد رہتے ہیں''
رینا بھابی شادی ہو جانے سے کیا بیٹی کا والدین کے گھر میں حق ختم ہو جاتا ہے۔ میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں رہ سکتی۔'' وہ بے بسی سے رو دی۔ سبرینہ اُس کے قریب ہو کر تسلی دینے لگی۔
''انعم...... تم ایسا کیوں سوچتی ہو...... یہ تمہارا گھر ہے۔ تمہیں نہیں جانا...... مت جاؤ...... کوئی تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ بس چپ ہو جاؤ...... تمہاری طبیعت بگڑ جائے گی۔'' سبرینہ اُسے مزید کتنی دیر تک بہلاتی رہی۔

☆......☆......☆

اروی لیٹے لیٹے تھک گئی تھی۔ ایک کمرے میں رہتے ہوئے وہ خود کو کسی قید میں محسوس کر رہی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے روشن آسمان دیکھے اور کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے...... اپنی لاچاری اور بے بسی کے ساتھ اُسے اصم کی تکلیف و بے بسی کا بھی شدت سے احساس ہوا۔ وہ تو خود سے اُٹھ بیٹھ سکتی تھی، چل بھی سکتی تھی۔ مگر اصم تو بنا کسی سہارے کے اب تک اُٹھ کر نہ بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی نقل و حرکت کر سکتا تھا۔ چلنا پھرنا تو ابھی پلاسٹر اترنے پر مشروط تھا۔
وہ اُٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تو نظروں کے سامنے ہرے بھرے لان کا منظر بھی اُس کی سوچ و توجہ نہ بدل سکا۔
''یا اللہ...... میں سب کی توجہ و محبت کے باوجود خود کو قید میں محسوس کرتی ہوں تو اصم کی فیلنگ کیا ہوں گی؟ وہ ہاسپٹل کے ایک روم میں تنہا پڑے ہیں۔ اُن کا وقت کیسے کٹتا ہوگا۔ کاش! میں اُن کی ساری تکلیف

لے سکتی...... یا...... پھر...... انہیں کچھ ہوا ہی نہ ہوتا...... میں بی بی جان سے کہوں گی۔ کل سے مجھے اُن کے پاس رہنے کی اجازت دے دیں۔ اور کچھ نہیں تو میں اُن کی تنہائی تو بانٹ سکوں گی۔'' اُس کی سوچیں صرف اصم پر مرکوز تھیں۔ اسی لیے اُسے دستک کا پتہ ہی نہیں چلا...... شمو دستک دینے کے بعد کچھ لمحے ٹھہر کر اندر چلی آئی اور اُسے پکار کر چونکا دیا۔

''دلہن بھابی...... دلہن بھابی۔'' اروی قدرے حیرت سے متوجہ ہوئی تھی۔

''آپ نے مجھے بلایا تھا؟ وہ میں ذرا انعم باجی کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ اس لیے آنے میں دیر ہوگئی۔'' اروی اپنے ذہن پر زور دے رہی تھی کہ اُس نے شمو کو بلایا تھا تو کس کام کے لیے...... اُلجھن اُس کے چہرے پر بھی نظر آ رہی تھی۔

''کیا کام ہے بتا دیں...... پھر مجھے کچن میں جا کر برتن بھی دھونے ہیں۔'' اُس کی خاموشی پر شمو نے پھر پوچھا تو وہ غائب دماغی سے بولی۔

''کا...... م...... کام تو کوئی نہیں تھا۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔''

''ہاہ...... ہائے کوئی کام نہیں تھا تو بلایا کیوں تھا...... چھوٹی بھابی تو پہلے ہی کہتی رہتی ہیں کہ میں کام چور ہوں۔'' شمو نے منہ بنا کر شکایت کی۔

''تو تم پہلے اُن کا کام کر دیتیں...... اچھا تم اب جاؤ۔'' اروی کھڑکی سے ہٹ کر بستر پر آ بیٹھی۔ جبکہ شمو اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی واپس چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد اروی کو یاد آیا کہ اُس نے شمو کو اپنی الماری کے کپڑے ترتیب دینے کے لیے بلایا تھا۔ ایک ہاتھ سے کپڑوں کو تہہ در تہہ رکھنا اُس کے لیے مشکل تھا۔ اُس نے اپنا کام کل پر ڈال کر اپنے ذہن کو مصروف رکھنے کے لیے ٹی وی پر سرچنگ شروع کر دی۔

☆......☆......☆

شمو کچن میں آئی تو سبرینہ نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''تم کہاں غائب ہو جاتی ہو؟ سنک برتنوں سے بھرا ہوا ہے۔'' سبرینہ دستانے (پولیتھن گلوز) ہاتھوں پر چڑھائے گرل کرنے کے لیے چکن تکہ بوٹی سیخوں میں پرو رہی تھی۔ اُس کی بے دلی اُس کے چہرے سے بھی ظاہر ہو رہی تھی اور رویے سے بھی۔

''چھوٹی بھابی میں نے کہاں غائب ہونا ہے۔ مجھے تو دلہن بھابی نے...... بلوایا ہوا تھا وہیں گئی تھی۔'' شمو نے جھٹ اپنی صفائی دی اور سنک کا نل کھول کر کھڑی ہوگئی۔

''اُسے تم سے کیا کام پڑ جاتا ہے ہر آدھے گھنٹے بعد تم اوپر دوڑی جاتی ہو...... ایسی بھی مجبور نہیں ہے وہ کہ ہل کر پانی بھی نہ پی سکے۔'' سبرینہ نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ فائق کے آنے کا سن کر ویسے بھی اُس کا موڈ خراب ہو رہا تھا۔

''کام تو وہ خود ہی کر لیتی ہیں اپنے...... مجھے تو وہ منع کرتی ہیں...... میں فیروی پُچھ لیتی ہوں...... وہ بڑی بھابی کہتی ہیں تو اس لیے۔'' سبرینہ کو گھورتے پا کر وہ جلدی سے صفائی دینے لگی۔

''اچھا...... اچھا اپنا کام کرو...... فضول باتیں کرنے کی عادت ہوگئی ہے تمہیں۔'' سبرینہ نے اُسے بری طرح جھاڑ دیا۔ تو وہ اپنا سا منہ لے کر سر جھکا کر برتن دھونے میں مصروف ہوگئی۔

☆......☆......☆

فائق آفس سے اُٹھ کر پارکنگ تک ہی آیا تھا کہ صالحہ درانی کا فون آ گیا۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اُس کے ماتھے پر شکنیں سی ابھر آئیں۔

''جی امی...... خیریت ہے......؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ لہجے کی بیزاری پر قابو نہ پا سکا۔

''خیریت ہی ہے۔ تمہیں یاد ہے نا تم نے بیت الجنت جانا ہے۔'' صالحہ نے معمول کے انداز میں یاد دہانی کروائی۔

''سوری...... امی میں وہاں نہیں جا سکوں گا۔'' اُس نے صاف جواب دیا تو صالحہ کو بھی حیرت ہوئی۔ پہلے وہ مان گیا تھا اب اچانک انکار......

''کیا؟ مطلب؟ تم نے تو کہا تھا کہ آخری بار اُسے آزماؤ گے۔'' صالحہ نے اُسے پھر گھیرا۔

''امی...... میں اُسے کیا آزماؤں؟ رزلٹ تو معلوم ہے۔''

''تو پھر کیا کرو گے؟ ان حالات میں کسی بھی قسم کے نتیجے کے ذمہ دار 'صرف تم' ٹھہرائے جا سکتے ہو۔ ذرا عقل سے کام لو۔'' صالحہ نے ماں بن کر خیر خواہانہ نصیحت کی۔ وہ کار پارکنگ میں اپنی گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ کان سے موبائل فون مسلسل لگا ہوا تھا۔

''امی...... کیا ضروری ہے کہ اُس کی خود پسندی بڑھانے کے لیے میں ہی جاؤں...... آپ لے آئیں اُسے جا کر اگر وہ آنا چاہتی ہے تو......'' کچھ سوچ کر اُس نے جواب دیا تھا۔ بلکہ ماں کی نصیحت کو مجبوراً قبول کر کے درمیانی راہ نکالی تھی۔

''اُس کی خود پسندی کو بڑھاوا بھی تو تم نے ہی دیا تھا۔'' صالحہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

''آندھی ہو، بارش ہو، سردی، گرمی ہو اُسے لیے لیے پھرتے تھے۔ اب کیوں پیچھے ہٹتے ہو...... ہم نے تو تمہیں مجبور نہیں کیا۔''

''غلطی کر بیٹھا ہوں، اب اُسے سدھارنے تو دیں۔'' وہ یکدم جھنجلا گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے ریورس کرتا موڑ کر سڑک پر لے آیا۔

''اس طرح غلطیاں درست نہیں ہوتیں میرے بیٹے، ابھی تم اُسے لے آؤ...... پھر تحمل سے معاملے کا حل سوچیں گے۔''

صالحہ میں اتنی بردباری اچانک ہی آئی تھی۔ یقیناً زبدہ کی اُس دن کی شرمندگی و ندامت نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ اولاد کا کوئی عمل (بالخصوص بیٹی کا) عزت و وقار سے جینے والی ماں کو کیسے ایک پل میں نظریں جھکا کر قدموں پر گرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

''امی...... میں وہاں جا کر کس کس کو اپنے رویے کی وضاحتیں دوں گا...... آخر آپ خود کیوں نہیں چلی جاتیں۔'' وہ بے حد جھنجلا کر بولا وہ بھی زچ ہو اٹھیں۔

''کوئی تم سے وضاحتیں نہیں مانگے گا۔ اتنے بے وقوف نہیں ہیں وہ لوگ کہ بیٹی کی غلطیوں سے واقف ہو کر بھی داماد سے وضاحتیں مانگیں۔ بس میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ تم انعم کو لینے جا رہے ہو۔''

(اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہ اپریل میں ملاحظہ فرمائیں)

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

فرمانِ رسول ﷺ

حضرت ابوذر رضیؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسولؐ نے ارشاد فرمایا۔
''تم میں سے کوئی شخص کسی نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھے اور اگر کوئی نیک کام نظر نہ آئے تو اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے مل لیا کرو اور جب گوشت خریدو تو شوربہ زیادہ کرلیا کرو اور پڑوسی کے ہاں بھی بھیج دیا کرو۔''

راحیلہ۔ لاہور

دعا

اے ہمارے رب ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں ان پر ہماری گرفت مت کرنا۔

عیب

عقلمند اور بے وقوفوں میں کچھ نہ کچھ عیب ضرور ہوتا ہے۔ عقلمند اپنا عیب خود دیکھ لیتا ہے اور بے وقوفوں کا عیب دنیا دیکھتی ہے۔

ساحرہ۔ وہاڑی

ہائے ری تعلیم

ایک سندھی کے گھر پر بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔
شوہر FSC
بیوی MSC
کسی نے شوہر سے پوچھا۔
''سائیں آپ کی بیوی اتنی پڑھی لکھی ہے آپ کیوں نہیں؟''
سندھی نے کہا۔ ''مطلب تو ایک ہی ہے۔''
MSC: مدر آف سیون چلڈرن۔
FSC: فادر آف سیون چلڈرن۔
سائیں تو سائیں کی ڈگری بھی سائیں۔
غزالہ۔ بحرین

شعر

جوں جوں پردے ہٹتے جا رہے ہیں
لوگ دل سے اُترتے جا رہے ہیں

عمران فہیم۔ شکارپور

دھوکہ

جو عبادت تمہیں برے عمل سے نہ روک سکے وہ عبادت نہیں ایک دھوکا ہے جو تم خود کو دے رہے ہو

رابعہ ترین۔ اسلام آباد

سردار جی کا اپنی بیوی کے نام خط

میری پیاری بیوی......
سوال کچھ بھی ہو جواب تم ہی ہو
راستہ کوئی بھی ہو منزل تم ہی ہو
دکھ کتنا بھی ہو خوشی تم ہی ہو
غصہ جتنا بھی ہو پیار تم ہی ہو
یعنی ایسا سمجھو کہ فساد کچھ بھی ہو

سارے فساد کی جڑ تم ہی ہو

افشاں۔U.K

بیٹی کا شکوہ ماں سے

امی قیامت والے دن بھی کہیں گی
فرشتے آرہے ہیں جاؤ چائے بنا کر لاؤ

رمشا۔لاہور

صبر جمیل

پوچھا گیا صبر جمیل کسے کہتے ہیں؟
جواب آیا۔
جب تم آزمائے جارہے ہو اور تمہارے لب پر
ہو شکر الحمدللہ.......

طلعت اقبال۔کراچی

تعبیر

ایک دن بیگم نے صبح اٹھتے ہی شوہر سے کہا۔
''اجی سنتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا ہے
کہ آپ مجھے ہیروں کا ہار دے رہے ہیں۔''
''اچھا......'' شوہر خوش ہو کر بولا۔
''آج تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر مل جائے گی۔'' سارا دن بیوی نے نہ تو بچوں کو ڈانٹا اور نہ ہی سر میں درد ہوا بلکہ مزے مزے کے کھانے پکائے۔
شام میں شوہر نے ایک خوبصورت پیکٹ بیوی کو تھما دیا۔ بیگم نے بے صبری سے گفٹ پیپر کھولا تو اندر سے کتاب نکلی۔
''خوابوں کی تعبیر۔''
اور شوہر کے سر پر جو گومڑ بنا اس غصے کے بعد وہ ایک ہفتے تک غصے کی اہمیت جتاتا رہا۔

سلمٰی۔بحرین

شوہر نامہ

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔
''مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ کپڑے دھوتے ہو؟'' دوست بولا۔
''بھئی جب وہ میرے ساتھ روٹیاں پکا سکتی ہے تو میں کپڑے کیوں نہیں دھو سکتا۔''

راحیلہ قاسم۔سکھر

لطیفہ

استاد شاگرد سے:'' بتاؤ غسل کے کتنے فرض ہوتے ہیں؟''
شاگرد:''سر 3 فرض ہوتے ہیں۔''
استاد:''کون کون سے ہیں؟''
شاگرد:''تولیہ، صابن اور پانی۔''

میر عثمان۔کراچی

سبق

ٹیچر:''کوئی ایسی کہانی سناؤ جس سے سبق بھی حاصل ہو۔''
''پپو:''ایک دن میں پھوپو کے گھر گیا وہ سو رہی تھیں۔''
''پھر ایک دن وہ ہمارے گھر آئیں تو میں سو رہا تھا۔''
''سبق یہ حاصل ہوا کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔''

درشہوار۔فیصل آباد

ابتداء ہے نہ انتہا

اُس کی ابتداء ہے نہ انتہا
معرفت حق اُن کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے وجود کو مٹا دیتے ہیں۔
اپنے خلاف باتیں خاموشی سے سنتے رہیں
جواب دینے کا حق وقت کو سونپ دیں۔

سنبل۔کراچی

غزالہ رشید کی ڈائری سے

قیمت پانی کی نہیں پیاس کی ہوتی ہے

قیمت موت کی نہیں سانس کی ہوتی ہے
دوست تو بہت ہوتے ہیں دنیا میں مگر
قیمت دوستی کی نہیں اعتماد کی ہوتی ہے

............*

باتوں سے خوشبو آئے

''میری خامیاں اور خوبیاں مجھے ہی بتانا۔
میری کوئی برانچ نہیں ہے۔''
لوگوں سے اور ان کے رویوں سے کبھی پریشان مت ہونا کیونکہ ہمارے ردِعمل کے بغیر وہ کچھ نہیں۔

............*

مرزا غالب

عمر بھر غالب یہی بھول کرتا رہا
دھول چہرے پر تھی اور آئینہ صاف کرتا رہا

............*

حکایت شیخ سعدی

میں پوری زندگی دو بندوں کو تلاش کرنے پر بھی تلاش نہ کر سکا ایک وہ جس نے اللہ کے نام پر دیا ہو اور غریب ہو گیا ہو۔ دوسرا وہ جس نے ظلم کیا ہو اور اللہ کی پکڑ سے بچ گیا ہو۔

............*

سنہری باتیں

خاموش ایسا درخت ہے جس پر کڑوا پھل نہیں لگتا۔
حسد وہ دیمک ہے جو انسان کو اندر اور باہر سے ختم کرتی ہے۔
سچائی ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔
ذہانت ایسا نادر پودا ہے جو محنت کے بغیر نہیں لگتا۔
خوش اخلاقی ایسی خوشبو ہے جو میلوں دور سے محسوس ہو جاتی ہے۔

نفس ایسا گھوڑا ہے جس پر انسان قابو پا لے تو دنیا اس کے قدموں میں ہوتی ہے۔
شاہ زیب۔ کراچی

دو سمت کے مسافر

بے چینیاں بے سبب تو نہیں تھیں ہمدم
تھیں تعاقب میں' نجانے کب سے
ہجر ساعتیں......زہریلی گھاتیں
اس لیے سُست قدم اٹھتے تھے میرے
اور......دل سے کہتے تھے کہ......شاید
تیرے ساتھ کے چند اور......پل
مقدر ٹھہریں تو زندگی بدلے
پر کوئی تدبیر میری کارگر نہ ہوئی
آہ......یا کوئی دعا بھی چارہ گر نہ ہوئی
تھی فرق دونوں کی منزل ازل سے شاید
اس لیے
بیچ سفر میں ہی بدل گئی تھیں راہیں اپنی
کیسے مل پاتے بھلا دو سمت کے مسافر سوچو!
زمر نعیم اجر۔ لاہور

امام غزالی

امام غزالی نے فرمایا: ''سب انسان مردہ ہیں' زندہ وہ ہیں جو علم والے ہیں۔ سب علم والے سوئے ہوئے ہیں' بیدار وہ ہیں جو عمل والے ہیں۔ تمام عمل والے گھاٹے میں ہیں' فائدے میں وہ ہیں جو اخلاص والے ہیں۔ سب اخلاص والے خطرے میں ہیں' کامیاب وہ ہیں جو تکبر سے پاک ہیں۔''
ارم حمید۔ کراچی

غلطی

ایک ادھیڑ عمر کے صاحب گھڑی ساز کے پاس پہنچے اور اپنی دستی گھڑی ٹھیک کرنے کے لیے

اُسے دیتے ہوئے بولے۔

''یہ میری گھڑی غلطی سے فرش پر گر گئی تھی آپ اسے ٹھیک کر دیجیے۔''

گھڑی ساز نے گھڑی کا بغور معائنہ کیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''بڑے صاحب اِس گھڑی کو گرانے میں آپ نے غلطی کی ہو یا نہیں مگر اِسے دوبارہ اٹھا کر ضرور غلطی کی ہے۔

سائرہ حبیب۔ پاک پتن

پیاری باتیں

☆ بڑا وہ ہے جس کی سوچ بڑی ہے۔

☆ علم سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔

☆ انسان شکل سے نہیں عقل سے پہچانا جاتا ہے۔

☆ جہالت سے بڑھ کر کوئی گمراہی نہیں۔

☆ کسی کی تعریف نہیں کر سکتے تو برائی بھی نہ کرو۔

☆ اپنے کردار کو اتنا بلند کرو کہ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں تمہیں متاثر نہ کر سکیں۔

☆ انسان کو کسی چٹان پر محبت کی بنیادیں نہیں رکھنی چاہیے کیونکہ وہ اونچی ہیں۔

☆ نصیحت ہمیشہ تنہائی میں کیا کرو۔

☆ نیک نامی انسان کا زیور ہے روح میں بسی ہوئی خوشبو ہوتی ہے۔

☆ دل اگر سیاہ ہو تو چمکتی ہوئی آنکھ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔

☆ کائنات میں حسن عورت ہی کی وجہ سے ہے اگر عورت نہ ہوتی تو یہ دنیا ویران نظر آتی۔

☆ ہم نیک بننے کی کوشش اس طرح کریں جس طرح خوبصورت بننے کی کرتے ہیں۔

☆ دنیا جس کے لیے قید ہے 'قبر' اس کے لیے آرام گاہ ہے۔

☆ دنیا میں سب سے بڑا گناہ کسی کا دل دکھانا ہے۔

☆ محفل میں بیٹھ کر 'سرگوشیاں' نہ کریں اس سے محفل کے آداب مجروح ہوتے ہیں۔

☆ دنیا مین جو چیز سب سے زیادہ ہے وہ 'جھوٹ' ہے اور جو چیز سب سے کم ہیں وہ سچائی اور امانت ہے۔

☆ دوسرے کی مصیبت میں وہی کام آتا ہے جو خود بھی مصیبت میں مبتلا رہ چکا ہو۔

☆ آہستہ بولنا' نیچی نگاہ رکھنا اور میانہ چال چلنا ایمان کی نشانی ہے۔

☆ حکمت ایک سیاہ درخت ہے جو دل سے اُگتا ہے زیادہ زبان سے پھل دیتا ہے۔

☆ معیار ان ہی کو بدلتے ہیں جن کا کوئی معیار نہیں ہوتا۔

مسز نگہت غفار۔ کراچی

عقیلہ حق کی ڈائری سے

جس مرد کی جرابیں پھٹی ہوں اور بٹن ٹوٹے ہوں۔

اسے دو میں سے ایک کام کر لینا چاہیے۔

یا تو شادی کر لے یا طلاق دے دے۔

بیس دن کی محبت کے لیے بیس سال کی تربیت ضائع مت کرو۔

ہر اُس محفل میں گھسنے کی کوشش مت کرو جہاں تمہارا کوئی جوڑ نہ ہو۔

عقیلہ حق۔ کراچی

دوست

کچھ دوست' دوست نہیں ہوتے
زندگی کا سکون ہوتے ہیں

رضوانہ پرنس۔ کراچی

☆☆......☆☆☆

نئے لہجے، نئی آوازیں

جیسے وہ آیا ہو!

ہوا میں دیوانگی ہے کہ جیسے وہ آیا ہو
سنگلاخ پہاڑ توڑ کر جیسے وہ آیا ہو
حقیقت کے اصول سب توڑ کر وہ آیا ہو
میری ذات کی مشتِ خاک میں
روح پھونکنے وہ آیا ہو
وہ گیا تو سب رنگ ہی بے رنگ ہو گئے
فضا میں زیست ورنگینی ہے کہ جیسے وہ آیا ہو
گلستانوں کو روند کر جیسے وہ آیا ہو
میرے فقط میرے لیے ریگستانوں میں چلا آیا ہو
اکثر اُس کے غم میں گر اسے بھول جاؤں تو
گماں اُس کا یوں آتا ہے کہ جیسے وہ آیا ہو
ہر شام تیری یاد کے پنچھی
میرے گرد حمائل ہوتے ہیں
اور کہتے ہیں بتاؤ نگین
تیرے رونے پر گر کبھی وہ لوٹ آیا ہو
شاعرہ: نگین افضل وڑائچ۔ شادیوال۔ گجرات

جانم

کوئی پرسانِ حال ہو تو کچھ سنائیں بھی
دل کا غم اکیلے ہم کب تک اٹھائیں بھی
اُداس پڑی ہے دل کی بستی مدتوں سے
وہ لوٹ آئے تو پھر سے انجمن سجائیں بھی
تیرے تغافل سے سارے پیماں ٹوٹ گئے
آؤ! کہ دل کی کرچیاں تمہیں دکھائیں بھی
زندگی بن گئی ہے اِک صحرا کی مانند
اس قدر ظالم تو نہ تھیں یہ فضائیں بھی
وہ دیکھو! ستارہ میرے مقدر کا ڈوب گیا
چراغِ قسمت میرا بجھا چلی ہوائیں بھی
ہم نے خوشیوں کو ترے واسطے سنبھال رکھا ہے
آ جا کہ تجھ پہ وہی بہاریں لٹائیں بھی
اُس کو ہر بات بھول جانے کی عادت ہے فصیحہ
کتنی حسین ہیں جانم تیری یہ ادائیں بھی
شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ ملتان

لاحاصل عشق

محبت کے اُس سفر میں
جہاں ہم ساتھ چلتے تھے
زندگی کے اُن لمحوں میں
جہاں ہم ساتھ جیتے تھے
محبتیں تھیں، رفاقتیں تھیں
جہاں زندگی تیرے وجود سے تھی
تیرے وجود سے یوں دور ہوئے
ہم نصیب کے ہاتھوں مجبور ہوئے
تُو نے تو ہمیں محبت میں ہرجائی سمجھا
حالات کی مجبوریوں کو ہماری بے وفائی سمجھا
ہم بے وفا بھی نہ تھے
تیرے عشق میں دیوانے تھے
چلو ہم بے وفا ہی، محبت میں ہرجائی سہی
مگر پھر بھی اے دل! تجھے شدت سے چاہا تھا
شدت سے چاہتے رہیں گے
چلو آؤ میرے ہمدم
آج پھر ایک سفر پہ چلتے ہیں
ہم مل نہ سکے، چلو بچھڑنے کی رسم ہی ادا کرتے ہیں
شاعرہ: رجاء امیر۔ کراچی

دھیان

ایسا بھی کیا؟ کہ روح میں کُھلا غم نہیں مٹتا
مجھ سے میرے احساس کا پھیلاؤ نہیں سمٹتا
آنکھوں میں چبھ رہی ہیں کرچیاں خوابوں کی
دلِ مضطر کے ٹوٹنے کا غم کیوں نہیں گھٹتا
ہونا تھا یہی اک دن گماں رہتا تھا مجھ کو
اک پل بھی دھیان مگر اُس سے نہیں ہٹتا

شاعرہ: زمر نعیم۔ لاہور

غم کدہ

وہ لفظ عام ہو کے جو بے آبرو ہوا
میں بھی اسے ذلیل کروں کیا یہ ضروری ہے
وہ جذبہ جس کو سب نے کیا بے سبب حقیر
نفرت سے تُو بھی دیکھے اُسے کیا یہ ضروری ہے
وہ آس یوں بھی ایسے ہے جیسے نراس ہو
پھر بھی یہ مصلحت کہ مٹاتے رہے اسے
سب جس کو محبت کہتے ہیں میں دے نہ پاؤں گی
لیکن قبول ہو تو تری نظر کردوں میں
گہرائیوں سے دل کی جو ابھرے وہ بندگی
ہوئی ہے باریاب سدا جو فلک پہ بھی
پروانے کی امنگ ستارے کے واسطے
شب کی تلاش دل کے نظارے کے واسطے
جھکتی ہوئی نیاز سے اُس کے لیے جبیں
جو میرے غم کدے سے دور رہے بہت

شاعرہ: نسیم سکینہ صدف۔ ڈسکہ

مرے مولا!

ہر شے میں تیرا ظہور ہے
ہر ذرے میں تیرا نور ہے
کائنات کا گوشہ گوشہ
تیرے نور سے پُر نور ہے
تیرا کرم، تیری عنایتیں ہیں بے شمار
ہر چرند پرند کرتے ہیں، تیری ثناء بار بار
ہم ہیں مقروض تیری رحمتوں کے نزول پر
کلامِ الٰہی ہو مرے مولا ہمیں ازبر
روزِ قیامت ہو تیرے حضور جھکا ہوا ہمارا سر
لِللہ ہم گناہ گاروں کو بچا لیجیے

شاعرہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

تری چاہت

وہ اس انداز سے مجھ سے سدا محبت چاہتا ہے
مری ہر بات پر جیسے اپنی حکومت چاہتا ہے
وہ کہتا ہے میں اُس کی ضرورت بن چکا ہوں
گویا وہ مجھے حسب ضرورت چاہتا ہے

شاعر: آصف حسین۔ کراچی

یادوں کی خوشبو میں تازہ ہوا کا جھونکا

جنگ کے زمانے میں، محبت کے گیت گاتے ہیں
چلو آنکھوں کو بند کرکے، کوئی سہانا منظر دہراتے ہیں
جل رہے ہیں بدن، مگر! ہم کو اس سے کیا
اُٹھ رہا ہے بارود کا دھواں، مگر! ہم کو اس سے کیا
چلو کسی آرٹ گیلری میں، نئی تصویریں سجاتے ہیں
جہاں عریاں بچے، تصویروں میں غمزدہ سے نظر آتے ہیں
یہ شناسا سے چہرے، کسی سڑک کنارے پر
پتھر اٹھائے ہاتھوں میں نظر آتے ہیں
مگر! ہم کو اس سے کیا
ہم کسی رنگ و خوشبو کی محفل سے ہو کر آتے ہیں
جہاں جام سے جام ٹکراتے ہیں
اور ریشمی بدن کی تال پر لہراتے ہیں
چلو غم بھول جاتے ہیں اور ذرا مسکراتے ہیں

شاعرہ: شیما عبدالقیوم۔ لاہور

”چٹ پٹی خبریں“

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

بڑا فیصلہ

اداکارہ نور نے بڑا فیصلہ کرلیا ہے اور کوئی بھی اس فیصلے کو تبدیل نہیں کرواسکتا۔ نور نے فیصلہ کیا ہے

کہ وہ آپ اسٹیج پر ڈانس نہیں کریں گی بلکہ ساری توجہ اداکاری اور ہوسٹنگ پر رکھیں گی ہم ٹی وی کی ہوسٹ صنم جھنگ کے چھٹیوں پر جانے کے بعد کچھ مارننگ شوز کی میزبانی نور نے بھی کی تھی اس کے علاوہ جس چینل پر ان کی ضرورت ہوتی ہے وہ چلی جاتی ہیں۔ شاید جلد ہی انہیں کوئی مارننگ شو مل بھی جائے بھئی نور کا فیصلہ نور کی زندگی مگر سچی بات تو یہ ہے کہ جتنا ان کا وزن بڑھ چکا ہے اس کے بعد ڈانس اور مارننگ شو دونوں ہی مشکل ہیں۔

بلے بلے

ہم سب ہی جانتے ہیں کہ شہزاد رائے ایک

وقت میں کئی کئی کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف وہ بچوں کی تعلیم کے لیے بہت کام کررہے ہیں دوسری طرف PSL کی اوپنگ پر گایا ہوا اُن کا گانا بلے بلے ہر خاص وعام نے بہت پسند کیا ہے۔ خوبصورت موسیقی کے ساتھ کمپوز کیا ہوا یہ گانا لوگ بہت شوق سے سن رہے ہیں امید ہے کہ PSL کا فائنل جو لاہور میں کھیلا جائے گا وہاں بھی شہزاد اپنے فن کا جادو ضرور جگائیں گے۔

بڑے لکھاری

فلم 'نامعلوم افراد' اور 'ایکٹر ان لا' کے رائٹرز فضا اور نبیل جلد ہی اپنی تیسری فلم شائقین کے لیے پیش کریں گے جو یقیناً اُن کی پہلی دو فلموں کی طرح کامیابی کے ریکارڈ توڑے گی۔ فلم کا سبجیکٹ بہت عام مگر بہت غیر معمولی ہے۔ ہمارے ان دونوں رائٹرز کو کمال حاصل ہے کہ وہ ان معاشرتی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں جن کا سامنا لوگ روزمرہ کی بنیادوں پر کررہے ہیں۔ اب انہوں نے مردوں کا خواتین کو گھورنا اپنی فلم کا ٹاپک بنایا ہے یہ وہ مسئلہ ہے جس کو ہر عورت فیس کرتی ہے مگر کسی نے بھی اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ ہم فضا اور نبیل کو پیشگی مبارکباد پیش کرتے ہیں اس دعا کے ساتھ کہ زورِ قلم ہو اور زیادہ۔

PSL اسپاٹ فکسنگ کیس

PSL اسپاٹ فکسنگ کیس میں ملوث شرجیل

خان کا کہنا ہے کہ انہوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا اور جلد حقائق سامنے آجائیں گے۔ سابق کرکٹر عبدالقادر کا کہنا ہے کہ اگر ماضی میں اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث کھلاڑیوں کے خلاف کارروائی کی جاتی تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا اور یوں جگ ہنسائی بھی نہ ہوتی۔ آپ صحیح کہتے ہیں جگ ہنسائی تو ہماری قومی پہچان بن چکی ہے کیونکہ غلط کام

کرنا ہمارے ہاں فیشن سمجھا جاتا ہے اور شرمندہ ہونے کے بجائے فخر سے بتایا جاتا ہے کہ ہاں ہم کرپٹ ہیں کرلو جو کرنا ہے۔

دبئی ہیئر آئی کم

بالآخر ماڈل ایان علی دو سال کی تگ و دو کے بعد دبئی چلی ہی گئیں۔ مارچ 2015ء کو منی لانڈرنگ

کے الزام میں گرفتار ہونے والی ساحرہ عدالتوں کے چکر لگا لگا کر اور اپنے جلوے دکھا دکھا کر آخر کار پھر سے اڑ ہی گئیں اور بے چارے پاکستانی منہ تکتے ہی رہ گئے۔ بھئی آخر کب یہاں کسی کرپٹ کو سزا ہوئی ہے۔ مصیبت اٹھانے کے لیے تو عام شہری ہیں نہ اب دیکھتے ہیں کہ محترمہ کب باعزت

بری ہوتی ہیں۔

کامیابی کی ضمانت

سُنا ہے نعمان اعجاز بھی بہت جلد پاکستانی فلم میں نظر آئیں گے۔ بقول ان کے جلد پاکستان میں بھی

فلمیں بنیں گی فی الحال تو ڈرامے بڑی اسکرین پر ریلیز ہو رہے ہیں۔

اس عرصے میں فلم تو صرف ایک ہی ریلیز ہوئی اور وہ 'شاہ' تھی مگر پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ...... اپنی آنے والی فلم کے بارے میں کہتے ہیں کہ بہت زیادہ تو نہیں بتا سکتا ہاں فلم حقیقت سے قریب ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے فلم میں کام کرنے کی آفر قبول کی...... درست کہا آپ نے نعمان اعجاز آپ تو ویسے بھی کامیابی کی ضمانت ہیں چاہے چھوٹی

اسکرین ہو یا بڑی۔

اُڑ بھی نہ پائے تھے

خبر گرم ہے کہ پچھلے دنوں مشہور سنگر حدیقہ کیانی کو ہیتھرو ایئرپورٹ پر دو کلو کوکین کے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے اس خبر نے جہاں سوشل میڈیا پر تہلکہ مچا دیا وہاں حدیقہ کے چاہنے والوں پر بھی یہ خبر بم بن کر گری۔ سنا ہے کہ حدیقہ اس خبر کی وجہ سے بہت

اپ سیٹ ہیں اور افواہیں پھیلانے والوں پر برہم بھی جو کچھ بھی کہہ دیتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ لوگ ایسی جھوٹی خبروں سے کتنا متاثر ہوتے ہیں۔ افواہیں پھیلانا ویسے بھی بری بات ہے، کاش یہ سب کو سمجھ آ جائے۔

نظر باز سجنا

'پتنگ باز سجنا' فیم فریحہ پرویز نے شوبز انڈسٹری کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا ہے وہ آج کل شدید ڈپریشن کا شکار ہیں۔ سنگر نعمان جاوید سے طلاق کے

بعد وہ بہت دلبرداشتہ رہنے لگی ہیں۔ پھر نعمان جاوید اداکارہ جاناں ملک سے شادی کے بعد تقریباً روز ہی کسی نہ کسی چینل پر بیٹھے نظر آتے ہیں اور نیا شادی شدہ جوڑا بالکل ہنسوں کا جوڑا محسوس ہوتا ہے شاید فریحہ کے ڈپریشن کی یہی وجہ ہے ہم تو فریحہ کو مشورہ دیں گے چند دن صبر کر لیں پھر آپ دوبارہ گنگناتی نظر آئیں گی۔ 'نظر باز سجنا' خوش رہا کریں۔

☆☆.......☆☆

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

کوفتہ نہاری چنا

نہاری کے اجزاء:۔

بیف بونگ اور نلی کے ساتھ : ایک کلو
سونٹھ، سونف، زیرہ : ایک چائے کا چمچ (ساتھ گرائنڈ کرلیں)
تیل : ایک کپ
نمک : ایک کھانے کا چمچ
لال مرچ : دو کھانے کے چمچ
ہلدی : ایک چائے کا چمچ
آٹا : آدھا کپ
ادرک، لہسن پیسٹ : ایک چائے کا چمچ
پیاز : ایک عدد بڑی
لونگ، الائچی : آٹھ آٹھ عدد (پیس لیں)

کوفتے کے اجزاء:

بیف قیمہ : آدھا کلو
نمک : حسب ذائقہ
لال مرچیں : حسب ذائقہ
گرم مسالہ : ایک چائے کا چمچ
ادرک (پسی ہوئی) : ایک چائے کا چمچ
ہرا دھنیا : حسب ضرورت
بھنا چنا (گرائینڈ کیا ہوا) : ایک کھانے کا چمچ
خشخاش : ایک چائے کا چمچ
سفید چنا اُبلا ہوا : ایک پاؤ

نہاری بنانے کا طریقہ: ایک دیگچی میں تیل گرم کریں پھر اس میں پیاز ڈال کر براؤن کرلیں پھر اس میں ادرک، لہسن اور گوشت ڈال دیں۔ اچھی طرح بھوننے کے بعد تمام مسالے شامل کر کے دوبارہ خوب بھونیں۔ آٹے کا پیسٹ بنا کر اچھی طرح فرائی کریں اور دیگچی میں ڈال کر مکس کریں اور کافی پانی ڈال کر دیگچی کو اچھی طرح سے ڈھکنے سے بند کر کے کئی گھنٹے پکائیں۔

کوفتے کی تیاری: جب تک نہاری تیار ہو کوفتے اس طرح بنائیں۔ بیف قیمے میں تمام مسالے کے اجزا شامل کر کے مکس کرلیں اور پھر گول گول کوفتے بنالیں۔ (ان کوفتوں کو ہلکا سا فرائی بھی کرسکتی ہیں)۔ اب نہاری کی دیگچی کا ڈھکن کھول کر اس میں تمام کوفتے آہستہ سے رکھتی جائیں۔ دیگچی کو دھیرے سے ہلائیں تاکہ تمام اجزاء خوب مکس ہو جائیں۔ دس پندرہ منٹ کے بعد اسی نہاری اور کوفتے والی دیگچی میں اُبلے چنے ڈال کر دیگچی کو دم پر لگا دیں۔ ایک پین میں تیل گرم کریں اور اس میں ادرک براؤن کر کے اس کا تڑکہ نہاری میں لگائیں۔ اس نہاری کوفتہ چنا ڈش کو ادرک، لہسن، ہری مرچوں

اور ہرے دھنیے سے گارنش کر کے گرم گرم نان کے ساتھ نوش فرمائیں۔

شاہی گوشت

اجزاء:۔

گوشت : آدھا کلو
پیاز : آدھا کپ
تیل : آدھا کپ
دہی : ایک کپ
ادرک، لہسن پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
نمک : ایک چائے کا چمچ
لال مرچ : ایک چائے کا چمچ
ہلدی : پون چائے کا چمچ
کالی مرچ : آدھا چائے کا چمچ
الائچی ہری، کالی : چار چار عدد
مرچ ثابت
بادام : چھ سات عدد
ناریل کریم : ایک کھانے کا چمچ

ترکیب: ایک ساس پین میں تیل گرم کریں۔ اس میں الائچی کڑکڑائیں، پھر گوشت ادرک لہسن کے ساتھ شامل کر کے بھونیں۔ اب پیاز اور باقی مسالا شامل کر کے پانی ڈال کر گلنے کے لیے رکھ دیں۔ گوشت گل جانے پر دہی، ہری مرچ شامل کر کے بھونیں۔ اب بادام، ناریل کریم شامل کر کے دم پر رکھ دیں۔ ہرے دھنیے سے گارنش کریں۔

سوئٹ اینڈ سار بیف وداسپیگیٹیز

اجزاء:۔

اسپیگیٹیز : دو پیکٹ
بیف : آدھا کلو (چوکور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنوالیں)
انڈے : دو عدد
ہری پیاز : تین عدد
کارن فلور : دو چائے کے چمچ
لہسن : تین جوئے
انناس : ایک کلو کا ایک ڈبہ
لال اور سبز شملہ مرچ : ایک ایک عدد
نمک : ایک چائے کا چمچ

ترکیب: بیف کے ٹکڑوں کو دھو کر نمک لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر انڈے میں ڈبو کر اور کارن فلور میں مکس کر کے ڈیپ فرائی کریں (تازہ گوشت گل جائے گا ورنہ دھیمی آنچ پر گلا کر ڈیپ فرائی کریں)۔ شملہ مرچ اور ہری پیاز کو بھی چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ ایک فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے پیاز، لہسن اور ہری مرچیں فرائی کریں پھر انناس کے ٹکڑے بھی اس میں شامل کر کے تھوڑا سا بھون لیں۔ کھٹی میٹھی چٹنی کے اجزاء ایک پیالے میں گھول کر شملہ مرچوں والے پین میں ڈال کر پکائیں اور آمیزہ گاڑھا ہونے پر اس میں فرائی گوشت بھی شامل کر دیں اور مزید پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم دیں۔

کھٹی میٹھی چٹنی کے اجزاء یہ ہیں:۔

ٹماٹو کیچپ : ایک کپ
سرکہ : آدھا کپ
کارن فلور : دو کھانے کے چمچ
چینی : آدھا کپ
سویا ساس : دو کھانے کے چمچ
نمک : آدھا چائے کا چمچ

(ان سب اجزاء کو ملا کر پکا کر گاڑھا کر لیں اور کھٹی میٹھی (سوئیٹ اینڈ سار) چٹنی کے طور پر استعمال کریں)۔

اسپیگیٹیز کی تیاری:۔

ایک بڑی دیگچی میں پانی اُبال لیں پھر اُس میں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اسپیگیٹیز توڑ کر ڈالیں اور چٹکی بھر نمک مع دو چائے کے چمچ تیل بھی ڈال دیں تاکہ اسپیگیٹیز چپکیں نہیں اور چمکدار بھی رہیں۔ جیسے ہی اسپیگیٹیز ہو جائیں ان کا گرم پانی پھینک دیں۔ اب ایک سرونگ پلیٹ پلیٹر میں پہلے اسپیگیٹیز کو پھیلا کر رکھیں پھر اس پر سوئیٹ اینڈ سار یا کھٹا میٹھا بیف ڈالیں اور تھوڑی سی کھٹی میٹھی چٹنی بھی ڈال کر گرم گرم سرو کریں۔

ڈرائی بیف چلی

اجزاء:۔

بغیر ہڈی کا گوشت : ایک کلو
نمک : حسب ذائقہ
سویا ساس : دو کھانے کے چمچے
اجینو موتو : دو کھانے کے چمچے
پسی ہوئی کالی مرچ : ایک چائے کا چمچہ
سرکہ : تین کھانے کے چمچے
باریک کٹا ہوا لہسن : دو کھانے کے چمچے
چینی : ایک کھانے کا چمچہ
پیاز : دو عدد
شملہ مرچ : دو عدد
ہری مرچیں : 10,12 عدد
تیل : پون کپ

ترکیب: اس ڈش کی تیاری کے لیے ران کا گوشت لیں۔ گوشت کے تقریباً دو انچ کے لمبے پارچے کاٹ لیں۔ پھر اس میں سرکہ، چینی، اجینو موتو، کالی مرچ، نمک، لہسن اور تین کھانے کے چمچے تیل ملا کر تقریباً ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اگر گوشت زیادہ گلانا ہو تو ایک چمچہ کچا پپیتا لگا دیں۔ کڑائی میں باقی بچا ہوا تیل ڈال کر گرم کریں۔ مسالا لگا ہوا گوشت ڈال کر تیز آنچ پر بھون لیں تاکہ گوشت کا پانی خشک ہو جائے۔ اب اس میں ہری مرچ، پیاز اور شملہ مرچ شامل کریں۔ پھر اسے دو منٹ کے لیے ڈھکن رکھ کر دم دے دیں۔ اُبلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

فش مکھنی والا

اجزاء:

فش فلے (بغیر کانٹے کے) : ایک کلو
پیاز بڑے سائز کی : ایک عدد (باریک کٹی ہوئی)
ادرک لہسن پیسٹ : ایک کھانے کا چمچہ
پسا دھنیا : ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ : ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا (پسا ہوا) : ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر درمیانے سائز : آدھا کلو
لیمن جوس : دو کھانے کے چمچے
چھوٹی الائچی : چار عدد (کوٹ لیں)
لال مرچ (پسی ہوئی) : ایک کھانے کا چمچہ
پسی دار چینی : آدھا چائے کا چمچہ
نمک : حسب ذائقہ
کریم : آدھا کپ
ہرا دھنیا : آدھی گٹھی (باریک کٹا ہوا)
کوکنگ آئل : آدھی پیالی

ترکیب: ایک بڑے پین میں آئل گرم کر کے پیاز کو ہلکا براؤن کر لیں۔ ادرک، لہسن، نمک اور تمام خشک مسالے ڈال کر تھوڑی دیر چمچہ چلائیں پھر ٹماٹر کاٹ کر کریم اور لیمن جوس شامل کر کے درمیانی آنچ پر بغیر ڈھکن کے پکائیں۔ جب مسالا ہلکا سا گاڑھا ہونے لگے تو بھون لیں اور مچھلی کے ٹکڑے ڈال کر درمیانی آنچ پر 15-10 منٹ یا مچھلی کے گلنے تک پکائیں۔ خیال رہے کہ مچھلی ٹوٹے نہیں۔ ہرا دھنیا ڈال کر چپاتی یا نان کے ساتھ گرم گرم نوش کریں۔

☆☆.....☆☆